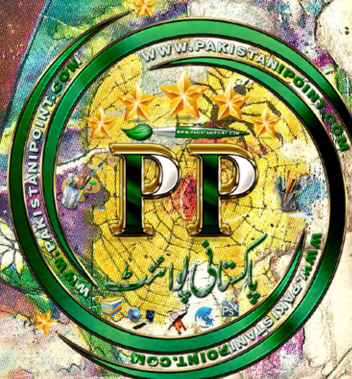
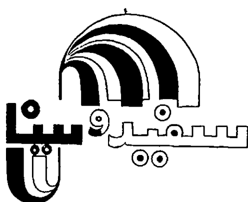
دنیا کی بہترین کہانیاں

سب رنگ ڈائجسٹ





نومبر ۱۹۷۱ء



اِس ماہ کی خاص کہانی

شمارہ : ـــ ۱۱ ○ جلد : ـــ ۲

قیمت فی پرچا	۱/۷۵	رُوپے
زرِ سالانہ	۱۸	رُوپے
مشرقی پاکستان میں	۲	رُوپے

سرِورق طباعت :- ایلیٹ پبلشرز لمیٹیڈ۔ ایس آئی ٹی ای۔ کراچی
پبلشر شکیل عادل زادہ نے قاسم نورانی کے اہتمام میں، پاکستان ہیرالڈ پریس، ضیاءالدین روڈ
کراچی سے چھپوا کر ۵ سی، ۱۲/۴، ناظم آباد کراچی سے شائع کیا

پتا :- ۴۷ ـ ۴۸ پریس چیمبرز، آئی آئی چندریگر روڈ، کراچی
فون :- ۲۲۵۸۴۴
ذیلی دفتر :- لطیف ہاؤس، کرشن پورہ، پشاور

جنگ

ترقی پزیر

ملکوں کا پہلا میدانِ جنگ تو اس کی اپنی سرحدوں کے اندر ہوتا ہے۔ اگر یہ محاذ کمزور ہے تو سرحدوں کو ہمیشہ خطرہ لاحق رہتا ہے۔ ایک زمانے سے قوموں کی زندگی یا موت شکست اور فتح کے فیصلے بقائے اصلح کے کلیئے کے مطابق صادر ہوتے ہیں جو طاقت ور ہیں وہ محفوظ ہیں جو کمزور ہیں وہ مغلوب۔ ۲۴ سال سے ہم جس غذاناک ماحول میں زندگی بسر کر رہے ہیں اصل میں اس کا بنیادی سبب ہم خود ہیں۔ ہم نے بیرونی خطروں اور سیاسی آفتوں کو شاید پوری شدت سے تسلیم ہی نہیں کیا۔ ہم خود سے الجھے رہے اور ہم نے شرمناک طور پر اپنی قومی غیرت کو سُلا دیا ہے۔ نتیجۃً اب حالات اتنی سنگین نوعیت اختیار کر گئے ہیں کہ ہمارا وجود خطرے میں پڑ گیا ہے۔ ستمبر ۶۵ء میں ایک موقع آیا تھا مگر اس آفتِ عظیم کے بعد ہم خود سے بچھڑ گئے۔ اب سُنا ہے کہ پھر یک سر گرم ہونے کو ہے۔ سرحدوں پر آتش بارود کا ذخیرہ کیے بیٹھا ہے۔ کسی وقت اس کے فلیتے کو آگ دکھائی جا سکتی ہے۔ جنگ پھر ہم پر مسلط ہونے والی ہے۔ کسی لمحے بھی کچھ ہو سکتا ہے۔ پھر حمیت، غیرت اور اخوت کے امتحان کا وقت آ پہنچا ہے۔ یقیناً پہلے کی طرح ہم زندہ قوموں کی مثالیں قائم کریں گے۔ مردانہ وار مقابلہ کریں گے اور دشمن کو پہلے کی طرح خاموش کر دیں گے۔

مگر ہمارا یہ جوش و خروش عارضی ثابت ہوگا۔ بھولنا ہماری عادت ہے۔ ہم پھر بھول جائیں گے کہ ہم کس مصیبت میں گھر گئے تھے۔ سرحدوں پر جنگ ختم ہو جائے گی تو سرحدوں کے اندر ولولے بھی ٹھنڈے پڑ جائیں گے اور یہی ایک بات آئندہ پھر کسی جنگ کا پیش خیمہ بن جائے گی — یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہے گا جب تک ہم ہر محاذ پر مسلح اور چوکس نہیں رہیں گے اور دشمن کو اس بات کا مکمل یقین نہ ہوگا کہ ہمیں زیر کرنا خود اس کی اپنی شکست کے مترادف ہے۔

جنگ تو ہمیں ۴۷ء سے درپیش تھی۔ ہمارے سامنے مسائل کا انبار تھا۔ ایک پوری قوم کی تعمیر ہمیں کرنا تھی۔ ایک ملک ایک عظیم الشان ملک کی عظمت و حرمت کو برقرار رکھنا تھا۔ قوموں کے ہجوم میں عزت و افتخار سے رہنا تھا۔ اپنی جگہ ہمیں خود بنانی تھی۔ ہم نے جنگ جاری نہیں رکھی وہ جنگ جو ہر ترقی پزیر ملک کے لئے لازم ہے جو سرحدوں کے اندر ہوتی ہے اور جس میں سرحدوں پر لڑی جانے والی جنگ سے زیادہ جوش، عزم اور ولولے کی ضرورت پڑتی ہے۔ ہم نے انقلاب کا مفہوم غلط سمجھا اور وہیں رہنے پر اصرار کیا جہاں ہم آزادی کے وقت تھے۔ ہر میدان میں دوسرے ہم سے آگے نکل گئے اور ہم ابتدائی جنون اور خوش فہمیوں میں مبتلا رہے۔ ہم نے بڑا غلط کیا۔ ہم نے یہاں تک کیا کہ جب کسی نے ہماری خامیوں کی نشاندہی کی تو ہم اسی پر مشتعل ہو گئے جس نے انقلاب برپا کرنے کی ضرورت پر زور دیا اس کے پیچھے پڑ گئے۔ انقلاب سے مراد یقیناً یہ نہیں تھی کہ ہمارے بنیادی نظریاتی عقائد کو ضرب پہنچے۔ اس سے مراد تو یہ تھی کہ قومی زندگی میں سماجی حرکت پزیری کی رفتار تیز ہو جائے اور وہ خلا پُر کر لیا جائے جو ہمارے اور ترقی یافتہ ممالک کے درمیان ہے وہ خلا جو طویل غلامی اور ہماری گزشتہ نسلوں کی عاقبت نا اندیشی اور مجرمانہ غفلت شعاری کے سبب ہے۔ ہمارا اصرار ہے کہ ہمیں زبردست سماجی تبدیلیوں کی ضرورت ہے۔ تعلیم، زراعت، صنعت اور معیشت کے شعبوں میں انقلاب برپا کیا جائے۔ اس کام میں ایک نسل قربان ہو تو جھونک دی جائے۔ کام کے اوقات بڑھائے جائیں تعلیم بالغاں کے مراکز کھول کر اندھیروں کو دور کیا جائے۔ لازمی فوجی تربیت اور ہر شعبے میں ہمہ گیر اصلاحات نافذ کر کے اس سماج کو منقلب کر دیا جائے۔ زمینیں اپنی زرخیزی کے لئے خون طلب کرتی ہیں۔ انہیں خون دیا جائے۔ اس ملک میں کیا نہیں ہے۔ یہ ملک تو بہت عظیم ہے۔

سُنا ہے **جنگ** ہونے والی ہے ——

اگر یہ خبر سچ ہے تو اس پر خوشی کا اظہار کرنا چاہئیے۔ جب مسائل امن اور مفاہمت کی فضا میں طے نہیں ہو پائیں تو جنگ انہیں حل کرنے کے لیے مجرب اور تیر بہدف نسخہ ہے۔ یقیناً وہ تباہیاں موجودہ صورتحال کی اذیت سے کم شدت کی ہوں گی جو باقاعدہ جنگ سے ممکن ہو سکتی ہیں۔

اب بہت ہو چکا کوئی فیصلہ ہونا چاہئیے۔ اب یہی ٹھہرا تو یہی سہی۔ خون سے سرخروئی ممکن ہے تو پیش کرو۔ سرحدوں پر جاؤ اور دشمن کی صفوں میں دیوانہ گھس جاؤ۔ بلاشبہ کامرانی اور سرفرازی ہمارا مقدر ہے۔

مگر ہم ایک دوسری بات کہہ رہے ہیں جو مستقل اور پائیدار امن سے تعلق رکھتی ہے۔ جنگ کے ساتھ ساتھ اور اس کے بعد ایک بہت بڑی جنگ کی ضرورت سرحدوں کے اندر ہے۔ ہمیں اپنے وسائل اور مسائل سے ایک طویل جنگ درپیش ہے۔ خود کو محفوظ اور مستحکم رکھنے کے لئے یہ جنگ اُس جنگ سے زیادہ ضروری ہے جو سرحدوں پر لڑی جائے گی۔

پس خود سے **جنگ** کیجیے — کب تک آپ اپنا مذاق اڑوائیے گا۔ کب تک آپ کے ساتھ مضحکہ ہوتا رہے گا۔ اب واقعی بہت ہو چکا۔ کچھ کر گزریئے گا —— کچھ کر دکھائیے گا۔ کب تک وہ آنکھیں برداشت کیجیے گا جو بار بار آپ کی سمت اُٹھتی ہیں اور آپ کی غیرت کو للکارتی ہیں۔

مُبارکباد!

ابھی ابھی یہ دل خوش کن خبر آئی ہے کہ آٹھ کروڑ باشندوں کے عظیم ملک چین کو اقوام متحدہ میں شامل کر لیا گیا ہے۔ ۲۲ سال بعد عوامی جمہوریہ چین کو اس کا حق ملا اب اقوامِ متحدہ ساری دنیا کی نمائندہ انجمن ہے۔ چین کی شمولیت کے بعد بین الاقوامی بساطِ سیاست میں زبردست تبدیلیاں واقع ہوں گی اور اُمید ہے کہ ادارہ اقوام موثر طور پر اپنے فرائض انجام دے گا۔ چین کی اس فتح پر ساری دنیا میں خوشی کا اظہار کیا گیا ہے۔ پاکستانی بھی اپنے دوست کو دلی مبارکباد پیش کرتے ہیں۔ چین کے اس اعزاز میں کسی شعبدے بازی اور بڑی طاقتوں کی حکمتِ عملی کا عمل دخل نہیں بلکہ یہ قوم کی ۲۲ سالہ ترقی کی مثالی جدوجہد کا ثمر ہے۔ یہ اس کی عظمت کا اعتراف ہے۔ نئے چین کی سیاسی اہمیت کو ساری دنیا نے تسلیم کر لیا ہے۔ عظیم قومیں اپنی برتری اسی طرح منواتی ہیں۔



آرائش حسن کیلئے
Charm SNOW
Charm SNOW
Charm
Charm SNOW
UMCO
Charm SNOW
چارم سنو
CS/1-71

ذاتی صفحہ



ایک دلچسپ بات معلوم ہوئی۔ ایک رسالے کے مالک جب سب رنگ کے تمام دلکش رنگوں سے اپنے رسالے کی زینت بڑھا چکے تو اُنہوں نے ایک دِن اپنے ادارے کے ایک ذمّہ دار شخص سے خالص تجارتی انداز میں کہا۔ "یہ کچھ ذاتی صفحہ ٹائپ کوئی چیز نکالو" ـــــــ میں نے جب یہ سُنا تو مجھے بڑی ہنسی آئی۔ پتا نہیں اُن صاحب نے کیا جواب دیا۔ میں ہوتا تو جواب دیتا۔ "بس یہی ایک چیز ممکن نہیں"۔ یہی تو میرا ایک رنگ ہے۔ میرے خُون کا رنگ ہے۔ اس صفحے میں ایک شخص شامل ہے جس کا چہرہ الگ احساسات علیحدہ اور وارداتِ قلبی مختلف ہیں۔ یہ رنگ کیسے لے اُڑیے گا۔ اس کے لئے تو دل کا خُون کرنا پڑے گا۔ اس کے لئے تو دُنیا میں رہ کر دُنیا سے علیحدہ ہونا پڑے گا۔ سب رنگ اور اس کے مدیر کا معاملہ کچھ اور ہے۔ جو سامنے کی باتیں ہیں انہیں نقل کیا جا سکتا ہے مگر جو اندر سے تعلق رکھتی ہیں، ان کے لئے تو انہی مرحلوں اور کیفیتوں سے گزرنا پڑے گا۔ شکیل عادل زادہ کے سُنہری دِن اور سُہانی راتیں جن کے سبب قُربان ہوگئیں۔

ذاتی صفحہ اس مقصد سے شروع نہیں کیا گیا تھا کہ اسے کسی باقاعدہ فیچر کی حیثیت حاصل ہو جائے گی۔ یہ تو یونہی عرضِ حال اور ترجمانیِ دِل کے لئے بڑے خلوص سے شروع کیا گیا تھا۔ دِل کی باتیں اور سچائیوں کی باتیں تھیں، اس لئے اثر کر گئیں۔ ذاتی صفحہ میرے جنونِ شوق کا عکاس ہے۔ جنون اتنا ہی وحشت انگیز اور شوریدہ سر ہو تو اس صفحے کی نقل کی جا سکتی ہے۔ ہر عاشق کا یہ دعویٰ ہوتا ہے کہ اس کا عشق سب سے زیادہ شدید اور مثالی ہے۔ میرا بھی یہی دعویٰ ہے۔ یہ تو امتحانِ عشق کا معاملہ ہے، عشق میں دُوسروں کی طرف مت دیکھو، خود محسُوس کرنا سیکھو۔

اور سُنا ہے کراچی سے باہر کچھ جغادری اور ثقہ ادیب و صحافی سب رنگ کے متعلق گفتگو کر رہے تھے اور اس کی آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی اشاعت کی تیزی پر تصویرِ حیرت بنے ہوئے تھے۔ ان میں ایک معزز صحافی نے سب رنگ کے بارے میں بڑے عجیب فیصلے صادر کیے۔ کہ اگر سب رنگ نے ایسا نہیں کیا تو ایسا ہو جائے گا۔ کوئی بھی کہیں بھی اس قسم کی رائے قائم کر سکتا ہے۔ یہ بات اتنی اہم نہیں مگر اصل میں ان عجیب و غریب اعلانات کے پیچھے ناروا خواہشیں چھپی ہوتی ہیں۔ اب جب سب رنگ نے اپنی کوئی جگہ بنانی شروع کی ہے تو مقابلے کے اس سماج میں بدنگاہی لازم ہے ـــ میں عرض کروں کہ سب رنگ کے مدیر اور اس کے ارکان اس امر سے بخوبی آگاہ ہیں کہ کب کہاں اور کس موقعے پر کیا تبدیلی کرنی چاہیئے۔ اگر آگاہ ہونے کی صلاحیت نہ ہوتی تو اس کام کا بیڑا نہ اُٹھاتے۔ اتنے بہت سے پرچوں میں سب رنگ منفرد ہو رہا ہے، اس کا انداز جُداگانہ ہے۔ سب رنگ کے مدیر اور ارکان قارئین کے درمیان اور اُن میں شامل رہتے ہیں۔ اشاعت بڑھ جانے کے بعد ان سے دُور نہیں رہتے۔ ہمارے پیشِ نظر یہ اہم نکتہ ہمیشہ رہتا ہے کہ جب کوئی خلا مدیر اور اس کے قارئین کے مزاج اور فکر میں ہو جاتا ہے تب بات دیگر ہو جاتی ہے۔ یہاں تو جناب صورتحال انوکھی ہے۔ کام کا ڈھب ہی یہاں انوکھا ہے۔ یہاں کے لوگ اوقات اور ضابطوں کے پابند ہو کر کام نہیں کرتے۔ کام کرتے ہیں اور جو وہ خود نہیں کر پاتے وُہ نہ جانے کیسے خود بخُود ہو جاتا ہے۔ گزشتہ دو سالوں میں نہ جانے کتنے ایسے مرحلے اچانک اور عجیب آئے کہ سنبھلنا مشکل ہو گیا۔ میں نے پہلے شمارے میں کہا تھا کہ لوگ آتے گئے، کام بنتا گیا، کام نہیں رُکا۔ سب رنگ لوگوں کے دِلوں پر چھاتا چلا گیا ـــ اب کس کی نظر اچھی، کس کی بُری، اِن باتوں کی پروا کون کرے۔ اپنا تو یقین محنت میں ہے، فکر کے خلوص میں ہے۔ کام میں ہے اور بس کام میں ہے۔

اور یہی وجہ ہے کہ ہر جگہ سب رنگ ہے۔ ہر سو سب رنگ ہے۔ سب رنگ کا شور ہے۔ میں گزشتہ دنوں کئی شہروں گھوما۔ اقبال مہدی میرے ساتھ تھے۔ ہم جس جگہ گئے، ہم نے سب رنگ کی دُھوم دیکھی۔ اس ذوق و شوق کو دیکھ کر ہم نے اپنا دورہ مختصر کیا۔ مری کے سبزہ زار اور سلیم شوالوی کے خُوبصورت شعر بھی ہمیں نہ روک سکے۔ ہم سب رنگ کیلیے دُنیا کے دلکش ترین مناظر چھوڑ کر چلے آئے۔ آپ کو یہ سُن کر تعجب ہوگا کہ اِس ماہ کی دس تاریخ سے پہلے کوئی کام اس شمارے کا نہیں ہُوا تھا۔ مگر سب کام ہو گیا۔ وقت پر یہ شمارہ تیار ہو گیا۔ کراچی کے موسم کی خرابی کی وجہ سے سرِ ورق کی رنگین طباعت میں اُلجھنیں پیش آئیں اور پرچا دو تین دِن کی تاخیر سے شروع ہُوا۔ ہم نے اپنا کام ۲۳ کو ہی نمٹا لیا تھا۔ ویسے مجھے دیر سے پرچا شائع کرنا پسند ہے۔ جلد آنے کے چکّر میں جیسا تیسا پیش کر دینا منظور نہیں۔ آپ اس سے متفق ہوں گے کہ سب رنگ کی جیت پہلے آنے میں نہیں، مرصّع، مزیّن اور مالا مال ہو کر آنے میں ہے۔

اب دیکھیے یہ شمارہ کیسا ہے؟ میں جب یہ کہتا ہوں کہ یہ شمارہ بہت دلچسپ اور عُمدہ ہے تو میری بات کا یقین کر لیجیے۔ میں آپ کا اعتماد ہوں۔ اس بار سب رنگ کی اشاعت اور بڑھی ہے اور میری ذمّہ داری میں اور اضافہ ہُوا ہے۔

میں گھر سے اور دُور ہُوا ہوں۔ میں یُوں بھی خود کا تو کم سے کم رہ گیا ہوں۔

میں اپنی ذات کا دریچہ بند کرتا ہوں اور ایک دُنیا کا جلوہ دکھانے کی دعوت دیتا ہُوں ـــ

بین الاقوامی شہرت کے حامل

دس مختصر تاثر انگیز اور خوبصورت

کہانیوں کی

ایک کہانی:

روح کی زبانی

کمال الدین



- تین وفادار امیدوار
- سر کسی کا، دھڑ کسی کا
- نزاکت
- تبدیلیِ جنس
- حسن کا جادو
- ایک بیٹا، تین باپ
- ایثار و قربانی
- بیوقوفی
- اعادہ شباب
- آخری کہانی

زیر نظر کہانیاں

سنسکرت کی مشہورِ زمانہ تصنیف "بریت کتھا سرت ساگر" سے لی گئی ہیں۔ ان کا زمانۂ تصنیف ۲۰۰ ع سے ۵۰۰ ع کا درمیانی دور ہے۔ مصنف کا نام 'گنادھیائے' تھا۔ اس شخص کے حالاتِ زندگی جو اب تک معلوم ہوئے ہیں وہ غیر معتبر ہیں۔ کہتے ہیں کہ اس نے ہندو دیومالائی کہانیوں کو سات لاکھ اشعار میں بیان کر دیا تھا۔ جب مہاراجا نے انہیں پسند نہیں کیا تو اس نے اپنی منظوم کہانیوں کے ایک ایک لفظ کو جنگلی پرندوں اور جانوروں کو سنا کر نذرِ آتش کر دیا اور خود بھی مر گیا۔

یہ کہانیاں کیسی ہیں ان کی قدر و قیمت کا قارئین خود ہی اندازہ لگا لیں گے۔ لیکن ہم اپنی طرف سے یہ ضرور بتائیں گے کہ انہوں نے تمام دنیا کو متاثر کیا ہے۔ "سرکشی کا دھڑکنی کا" پر یورپ کے عظیم ناول نگار تھامس جین نے DIE VERTAUSCTEN KOFFE نامی ناول لکھ ڈالا اور اسی بنیاد پر امریکہ کے ایک اوپیرا ہاؤس نے LIBRETTO OF AMERICAN OPERA کے نام سے تمثیلچہ پیش کیا۔ "نزاکت" نامی کہانی وسطِ ایشیا سے ہوتی ہوئی سائبیریا، لیپ لینڈ اور جٹ لینڈ پہنچی جہاں اس کے پلاٹ پر ہینس اینڈرسن نے PRINCESS ON THE PEA نامی کلاسیکی ناول لکھا۔

ان کہانیوں کی خصوصیت یہ ہے کہ ان سے عوام اور خواص یکساں متاثر ہوئے ہیں۔ ہم نے انہیں براہِ راست سنسکرت سے اردو میں منتقل کرایا ہے۔ ان میں عقل و دانش کے ساتھ ہندوستان کی پہیلیوں جیسا تمدن اور اندازِ فکر بھی موجود ہے۔ انہیں پڑھ کر حیرت اور ہنسی ایک ساتھ غلبہ کریں گے اور یہ دونوں ہی باتیں ہندو دیومالائی دماغ اور تمدن کی جان ہیں۔ ★★

دریائے گوداوری کے کنارے واقع پرتشٹھانا پر کسی زمانے میں مشہور ہندو راجا ترہی وکرم سین کی حکومت تھی جو طاقت اور جاہ و جلال کے اعتبار سے راجا اندر سے کسی طرح کم نہ تھا۔ مشہور ہے کہ یہ راجا جب دربار میں بیٹھا مملکت کے امور سے متعلق فیصلے کر رہا ہوتا، ایک سادھو جس کا نام شانتی سیل تھا اس کے پاس آتا اور ایک پھل بطور نذرانہ اسے دے کر چلا جاتا۔ راجا یہ پھل سادھو سے لے کر اپنے وزیرِ مال کے حوالے کر دیتا۔ یہ سلسلہ دس سال تک جاری رہا۔ ایک روز کا ذکر ہے کہ راجا نے یہ پھل سادھو سے لے کر ایک بندر کے آگے ڈال دیا۔ بندر نے اسے کھانا شروع کیا۔ راجا اور درباریوں کی حیرت کی اس وقت کوئی انتہا نہ رہی جب انہوں نے دیکھا کہ پھل کے اندر ایک نہایت قیمتی اصلی موتی جگمگا رہا ہے تو راجا نے وہ موتی اٹھا لیا اور وزیرِ مال کو بلا کر اس سے پوچھا کہ "ہم نے اس سے پہلے جو پھل تمہیں دیئے تھے ان کا تم نے کیا کیا؟"

"مہاراج میں نے انہیں مال خانے میں ڈال دیا تھا اگر حکم ہو تو میں مال خانہ کھلوا کر ان کا پتا لگاؤں۔" وزیر نے ڈرتے ڈرتے جواب دیا۔ راجا کی اجازت پا کر وزیر دربار سے چلا گیا اور تھوڑی دیر بعد اس کی بارگاہ میں حاضر ہو کر عرض کیا۔ "مہاراج مجھے مال خانے میں پھل تو نظر آئے نہیں کیونکہ وہ تو گل سڑ بھی چکے ہوں گے لیکن قیمتی اور نایاب موتیوں کا ایک بڑا ذخیرہ البتہ مال خانے میں موجود ہے۔"

راجا نے وزیر کی ایمانداری سے خوش ہو کر تمام خزانہ اسے بخش دیا۔ دوسرے دن جب بوڑھا سادھو پھر راجا کی خدمت میں حاضر ہوا تو راجا نے اس سے کہا "مہاراج! بھگوان کی کرپا سے میرے پاس سب کچھ موجود ہے پھر آپ مجھے اتنے قیمتی جواہر نذرانے کے طور پر کیوں پیش کرتے ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ اگر آج آپ نے اس کا سبب مجھے نہ بتایا تو میں یہ نذر قبول نہیں کروں گا۔"

سادھو کی آنکھوں میں شفقت کی ایک جھلک دکھائی دی اور پھر معدوم ہو گئی۔ راجا کو ایک طرف لے جا کر اس نے کہا "اے مہاراجا دراصل مجھے ایک خاص قسم کے جاپ کو مکمل کرنے کے لئے مدد کی ضرورت ہے اور میرا مددگار تجھ جیسا بہادر نڈر اور ایماندار شخص ہی ہو سکتا ہے۔ مجھے امید ہے کہ تو مجھے مایوس نہ کرے گا۔" یہ سن کر راجا نے چند لمحے توقف کیا اور پھر سادھو سے مدد کا وعدہ کر لیا۔

"مجھے خوشی ہے ایک بہادر اور مہان راجا نے میری مدد کا وعدہ کیا ہے۔ اے راجا چاند کے مہینے کی آخری تاریخ کو جب چاند ڈوب چکا ہو رات کے پچھلے پہر مجھ سے شمشان بھومی میں مل۔ میں تیرا منتظر رہوں گا"
چنانچہ مقررہ تاریخ اور وقت پر راجا گہرے سیاہ لباس میں ملبوس ہاتھ میں تلوار لئے پہرے داروں کی نظروں سے بچتا بچاتا محل سے باہر نکلا اور تاریکی کی گہری چادر میں لپٹی ہوئی دہشت ناک فضا سے گزرتا ہوا شمشان بھومی میں داخل ہوا۔ چاروں طرف چتائیں جل رہی تھیں اور شعلے اپنی خوفناک زبانیں ہوا میں لہرا رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ لاتعداد چڑیلیں اور بھوت ایک جگہ جمع ہو کر کسی وحشیانہ رقص میں محو ہوں۔ راجا بیشمار ہڈیوں کھوپڑیوں اور ڈھانچوں پر قدم رکھتا ہوا آگے بڑھتا رہا۔ ہڈیوں کے چٹخنے کی آوازیں، ہوا کی سنسناہٹ، شعلوں کا رقص۔ مردہ ڈھانچوں کا آگ سے اکڑ کر کھڑا ہونا۔ تیل گھی اور انسانی گوشت کے جلنے کی ملی جلی بدبو نے اس ماحول کو جہنمی ماحول بنا دیا تھا۔ لیکن بہادر راجا بڑے صبر و تحمل سے آگے بڑھتا رہا اور اس نے مرگھٹ کو پار کر لیا۔ سامنے ہی اسے سادھو دکھائی دیا جو ایک درخت کے نیچے ایک حلقہ کھینچ رہا تھا جس کے اندر بیٹھ کر اسے جاپ کرنا تھا۔

"مہاراج میں حاضر ہوں۔ بتایئے میں آپ کی کیا خدمت کروں؟" راجا نے قریب جا کر سادھو سے کہا۔

"اے بہادر راجا میں تیری اس عنایت کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ یہاں سے جنوب کی جانب کچھ فاصلے پر شیشم کے ایک درخت پر ایک شخص کی لاش لٹکی ہوئی ہے۔ جا اور وہ لاش مجھے لا دے۔" سادھو نے کہا ـــ

قول کا پکا اور مضبوط ارادے کا مالک جری راجا فوراً ہی جنوب کی جانب چل دیا۔ رات گو تاریک تھی لیکن جلتی ہوئی چتاؤں کی روشنی نے اس کی مدد کی اور وہ آخر کار مطلوبہ درخت تک پہنچ گیا۔ لاش درخت سے ٹنگی ہوئی تھی لیکن اس کا تمام گوشت جل کر سیاہ پڑ چکا تھا اور لاش بجائے خود رات کی تاریکی کا ایک حصہ دکھائی دیتی تھی۔ راجا نے درخت پر چڑھ کر رسّی کو کاٹ دیا۔ لاش زمین پر گر پڑی اور راجا کو ایک چیخ سنائی دی جیسے کوئی درد سے بلبلا اٹھا ہو۔ راجا درخت سے اترا اور یہ سوچ کر کہ ممکن ہے یہ شخص ابھی زندہ ہو نہایت نرمی سے اس کے جسم کو چھوا۔ اور پھر اسے ایک بہت ہیبت ناک شیطانی قہقہہ سنائی دیا۔ راجا سمجھ گیا کہ اس پر یقیناً کسی بدرُوح کا قبضہ ہے۔

"تم ہنس کیوں رہے ہو؟ آؤ چلیں"۔ راجا کے انداز میں بے خوفی تھی لیکن جیسے ہی اس نے یہ الفاظ ادا کئے اس کی حیرت کی کوئی حد نہ رہی جب اس نے لاش کو اپنے سامنے سے غائب پایا۔ نظر اٹھا کر اُوپر دیکھا تو پتا چلا کہ وہ پھر درخت پر اسی طرح لٹکی ہوئی ہے۔ راجا پھر درخت پر چڑھا اور لاش کو اتار کر کندھے پر رکھ کر سادھو کی جانب روانہ ہوا۔ سچ ہے بہادر آدمی کے ارادے کی سختی ہیرے کی سختی سے بھی زیادہ ہوتی ہے۔ راستہ میں لاش پر قابض ۔ رُوح نے راجا سے کہا: "اے مہان راجا میں تجھے ایک کہانی سناتی ہوں تاکہ تیرے سفر کی صعوبت میں کچھ کمی آجائے"۔ یہ کہہ کر اس نے ایک دلچسپ کہانی شروع کی۔



تین وفادار امیدوار

کاپی ندی کے کنارے آباد برہمنوں کے ایک گاؤں میں وید کا ایک بہت بڑا عالم رہتا تھا جس کا نام گنیش سوامی تھا اس کی ایک بیٹی تھی جس کا حُسن بے نظیر تھا۔ اس لڑکی کا نام مندراوتی تھا۔ جب یہ لڑکی شادی کے قابل ہوئی تو کنیّا کے لئے تین بڑے قابل خوبصورت اور حسین نوجوان برہمن اس کی امیدواری میں آئے ـــ عالم یہ تھا کہ ان میں سے ہر ایک نے لڑکی کے باپ کو دھمکی دی کہ اگر حسین مندراوتی کسی اور کے ساتھ بیاہ دی گئی تو وہ خودکشی کرے گا۔ اور اس ڈر سے کہ کنیّا کی کسی ایک سے شادی باقی دو برہمنوں کی موت پر منتج ہوگی، جو بہت بڑا پاپ تھا۔ لڑکی کے باپ نے اس کی شادی کسی سے بھی نہ کی اور یہ حسین و جمیل لڑکی

کنواری ہی رہی۔ تینوں امیدواروں نے اسی گاؤں میں رہائش اختیار کرلی اور اب وہ تینوں چکور لڑکی کے چاند جیسے چہرے کو تکتے اور زندگی کے دن گزارتے رہے۔ آخر کار مندراوتی ایک دن اس دنیا سے سدھار گئی۔ تینوں نوجوان برہمن کریا کرم کے لئے لڑکی کی لاش کو شمشان بھومی میں لائے اور اسے نذر آتش کر دیا۔ ان میں سے ایک نے مرگھٹ میں لڑکی کی لاش کی راکھ پر ہی رہائش اختیار کرلی اور بھیک مانگ کر پیٹ بھرنے لگا۔ دوسرے برہمن نے لڑکی کی جلی ہوئی ہڈیوں کو جمع کیا اور انہیں گنگا میں بہانے چلا گیا۔ تیسرا برہمن سادھو بن گیا اور دوسرے ملکوں کو نکل گیا۔

تیسرا برہمن جب ایک گاؤں میں پہنچا تو ایک اور برہمن نے اسے اپنا مہمان بنا لیا۔ گھر کے سب لوگوں کے ساتھ جب یہ سادھو کھانے پر بیٹھا تو میزبان کا بچہ رونے لگا۔ ماں نے پہلے تو اسے پیار سے چپ کرانے کی کوشش کی اور جب وہ چپ نہ ہوا تو اس نے اسے آگ کی بھٹی میں پھینک دیا اور بچہ جل بھن کر کباب ہو گیا۔ رونگٹے کھڑے کر دینے والے اس منظر کو دیکھ کر سادھو کو بہت صدمہ ہوا اور اس نے میزبان کی دعوت قبول کرنے سے انکار کر دیا اور اُٹھ کر کھڑا ہو گیا لیکن میزبان نے بڑی لجاجت اور خوشامد سے اسے روکا اور کہا کہ وہ جادو کے زور سے ابھی بچے کو زندہ کر دے گا۔ یہ کہہ کر اس نے مٹھی بھر مٹی پر کچھ منتر پڑھا جو ایک کتاب کے صفحے پر لکھا ہوا تھا اور مٹی کو آگ پر پھینک دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے بچہ ہنستا کھیلتا آگ سے باہر نکل آیا۔ یہ دیکھ کر سادھو کو طمانیت محسوس ہوئی اور وہ کھانا کھانے لگا۔ میزبان نے دیوار کے ایک طاق پر کتاب کو رکھ دیا۔

رات کو جب تمام گھر سو چکا تو سادھو اس کتاب کو لے کر جس میں منتر لکھا ہوا تھا بھاگ آیا اور اپنے باقی دو ساتھیوں سے آملا۔ اس نے پہلے برہمن کی جھونپڑی کو دوسرے برہمن کی مدد سے توڑا اور مٹھی بھر خاک پر منتر پڑھا اور اسے لڑکی کی راکھ پر بُرک دیا۔ فوراً ہی مندراوتی اٹھ کر کھڑی ہو گئی لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ اس کا حُسن جلنے کے بعد اور بھی نکھر آیا تھا۔

اب تینوں برہمنوں میں جھگڑا شروع ہو گیا کہ لڑکی سے شادی کا حق دار کون زیادہ ہے۔

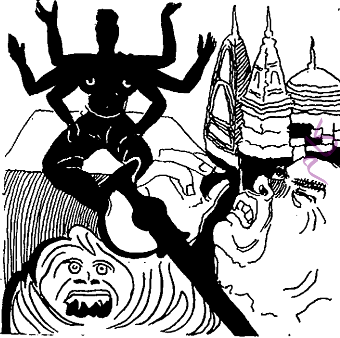
ایک نے کہا "یہ میرے منتر کے زور سے زندہ ہوئی ہے اس لئے میری ہے۔"

دوسرے نے کہا "واہ یہ تو گنگا جل کی برکت سے زندہ ہوئی ہے، اس پر میرا حق ہے۔"

اور تیسرے نے کہا "نہیں، میں نے اس کی راکھ کی حفاظت کی اس لئے یہ میری ہے۔"

اتنا کہہ کر۔ رُوح نے چند لمحے توقف کیا اور پھر راجا سے مخاطب ہوئی۔ "بتا اے راجا تیرا کیا خیال ہے، لڑکی سے شادی کا حق دار سب سے زیادہ کون ہے؟ مگر یاد رکھ کہ اگر تو جواب سے واقف ہے اور بتانے سے گریز کرتا ہے تو تیرا سر پاش پاش ہو جائے گا۔"

راجا نے جواب دیا۔ "وہ برہمن جس نے اپنے منتر کے زور سے لڑکی کو زندگی دی باپ کی حیثیت رکھتا ہے لہٰذا وہ اس کا شوہر نہیں بن سکتا جس شخص نے لڑکی کی ہڈیوں کو گنگا میں بہا دیا وہ بیٹے کی حیثیت رکھتا ہے۔ کیونکہ ہندو دھرم میں یہ کام دوسروں کے بہ نسبت بیٹوں کا زیادہ فرض ہے۔ البتہ وہ شخص جس نے مرگھٹ میں رہائش اختیار کر کے دنیا کو چھوڑ دیا اور لڑکی کی راکھ کی حفاظت کی اس کا شوہر بن سکتا ہے۔" راجا کے اس جواب کو سُن کر۔ رُوح راجا کے کندھے پر لدی ہوئی لاش کے ساتھ غائب ہو گئی۔ مگر وہ پھر شیشم کے درخت تلے واپس آیا اور اس نے لاش کو پھر ویسا کا ویسا ہی ٹنگا ہوا پایا۔ ایک مرتبہ پھر راجا اوپر چڑھا۔ اس لاش کو درخت پر سے اتارا اور اسے کندھے پر لاد کر پھر اپنی منزل کی جانب چلا لیکن۔ رُوح نے پھر راجا کو ایک کہانی سنائی۔



سر کسی کا دھڑ کسی کا

"قدیم زمانے میں ایک راجا تھا جس کا نام تھا یاساکیتو۔ اس کا محل شہر شوبھاوتی میں واقع تھا جہاں سفید دیوی کا ایک بڑا خوبصورت

مندر بھی تھا۔ اس مندر کے جنوبی حصے میں ایک خوبصورت تالاب تھا جسے دیویوں کا تالاب کہا جاتا تھا اور ہر سال اشدہ کے مہینے کی چودھویں تاریخ کو ہندوستان کے چپے چپے سے لوگ یہاں میلا دیکھنے آتے اور اس تالاب میں نہا کر اپنے گناہوں کو دھوتے۔

ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ نوجوان دھوبی جس کا نام دھولا تھا اس تالاب میں نہانے کے لئے آیا۔ یہاں اس کی نظر اسی گاؤں کے ایک اور دھوبی سُدھاپت کی نوجوان حسین لڑکی مدن سندری پر پڑی اور وہ اس پر سوجان سے فریفتہ ہو گیا۔ جب گھر واپس آیا تو وہ اپنے حواس کھو بیٹھا کیونکہ محبوب سے جدائی کا تجربہ اس کے لئے بالکل نیا تھا۔ اس کی ماں نے جب بیٹے کی یہ حالت دیکھی تو اس نے سبب دریافت کیا اور بیٹے نے ساری کتھا اسے سنادی۔ چنانچہ وہ اپنے شوہر وملامل کے پاس گئی اور اسے بلا لائی۔ وملا نے بیٹے کو دلاسا دیا اور کہا کہ سُدھاپت ہماری برادری کا ایک فرد ہے کوئی بات نہیں اگر ہم اس کی لڑکی تمہارے لئے مانگیں گے تو وہ انکار نہیں کرے گا وہ ہمیں جانتا ہے اور ہم اسے جانتے ہیں۔ بہت شریف آدمی ہے تم فکر نہ کرو بھگوان بھلی کریں گے۔

دوسرے دن وملامل اپنے بیٹے دھولا کو لے کر سُدھاپت سے ملنے شوبھاوتی جا پہنچا اور اس سے اپنے بیٹے کے لئے رشتہ مانگا اور تیسرے دن ہی لگن منڈپ کے پھیرے ہوئے اور مدن سندری دھولا سے بیاہ دی گئی اور یہ جوڑا ہنسی خوشی زندگی گزارنے لگا۔ ایک دن کا ذکر ہے کہ مدن سندری کا بھائی اس کے گھر آیا اور اس نے کہا "بہن مدن سندری تمہیں اور بھائی کو پتا جی نے بلایا ہے"۔ دھولا نے اپنے سالے کو روک کر اس کی چند دن خاطر مدارات کی اور پھر اس کے ساتھ مدن سندری کو لے کر سسرال روانہ ہوا۔ یہ تینوں جب سفید دیوی کے مندر کے قریب سے گزرے تو دھولا نے خواہش ظاہر کی کہ وہ مندر میں جا کر پوجا پاٹ کرنا چاہتا ہے لیکن سالے نے اس کی مخالفت کی اور کہا کہ مندر میں خالی ہاتھ نہیں جانا چاہئے۔ دھولا نہ مانا اور آخر کار مندر میں داخل ہو گیا اور دیوی کے سامنے منہ کے بل گر گیا اور اشلوک پڑھنے لگا۔ وہ سوچ رہا تھا، اس عظیم دیوی نے اپنے اٹھارہ طاقتور بازوؤں سے راکھشس رور و کو کس بری طرح شکست دی ہے اور کس طرح اس نے مہیش کو اپنے خوبصورت نرم و نازک پیروں تلے روندا تھا۔ ان خیالات کے ساتھ ہی اب اس نے سوچا کہ اس عظیم دیوی کی



خوشنودی کے لئے لوگ ہر قسم کی قربانیاں دیتے ہیں کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ میں خود اپنی قربانی اپنے ہاتھ سے پیش کر کے امر ہو جاؤں۔ یہ سوچ کر دھولا اندر گیا۔ وہاں ایک تلوار رکھی تھی وہ اسے اٹھا لایا اور اس سے اپنا سر قلم کر دیا اور گر کر ٹھنڈا ہو گیا۔

ادھر مدن سندری اور اس کا بھائی دونوں دھولا کا انتظار کر رہے تھے۔ جب وہ خاصی دیر گزرنے کے بعد بھی واپس نہ آیا تو مدن سندری کا بھائی حقیقت حال جاننے کے لئے مندر میں داخل ہوا، اور جب اس نے اپنے بہنوئی کو خاک و خون میں یوں لت پت دیکھا تو عالم تصور میں اسے اپنی پیاری بہن کا سہاگ اجڑا ہوا دکھائی دیا۔ پھر اس نے سوچا کہ جب بہن ہی دکھی رہے گی تو اس کا اپنا زندہ رہنا بیکار ہے۔ اسی تلوار سے اس نے بھی دیوی کی مورتی کے سامنے اپنے آپ کو ہلاک کر ڈالا۔ تھوڑی دیر بعد خود مدن سندری مندر میں پہنچی اور شوہر اور بھائی کی لاشوں کو اس نے نہایت صبر و تحمل سے دیکھا اور ہاتھ جوڑ کر دیوی کی مورتی کے سامنے کھڑی ہو گئی، کہنے لگی:-

"اے دیالو دیوی میرے بھاگ اتنے بڑے کہاں تھے کہ میں تیرے

حضور اتنی بڑی بھینٹ چڑھا سکتی۔ یہ سب کچھ تیرا ہے اور تیرے لئے ہے اپنے پیارے شوہر اور پیارے بھائی کی لاشوں کو دیکھ کر میرا سر فخر سے اونچا ہو گیا ہے۔ کاش میں تیرے کسی کام آسکتی۔ اب میری ایک تمنا ہے اور وہ یہ ہے کہ تو میری بھی قربانی قبول کر مگر اگلے جنم میں، میں جس شکل میں بھی پیدا ہوں میرا شوہر مجھے میرے شوہر کی حیثیت سے اور میرا بھائی مجھے میرے بھائی کی حیثیت سے ملے۔" یہ کہہ کر مدن سندری نے تلوار اٹھائی اور قبل اس کے کہ وہ اپنی گردن کو جدا کر سکتی مندر کی عمارت ایک نرم اور شیریں آواز سے گنگنا اٹھی۔ "لڑکی ہم تیرے تدبر تحمل اور جذبۂ ایثار سے خوش ہیں۔ اٹھ اور دونوں گردنوں کو ان کے دھڑوں سے جوڑ دے، یہ زندہ ہو جائیں گے۔ جا دیوتاؤں کی برکتیں تیرے ساتھ ہیں۔"

مدن سندری کا چہرہ یہ سن کر کنول کے پھول کی طرح کھل اٹھا اور اس نے دیوی کی ہدایت پر عمل کیا اور دونوں انسان زندہ ہو گئے لیکن جب یہ تینوں باہر نکلے تو یہ دیکھ کر مدن سندری پر غم کا ایک پہاڑ ٹوٹ پڑا کہ اس نے اپنے بھائی کی گردن شوہر کے دھڑ پر اور شوہر کی گردن بھائی کے دھڑ پر رکھ دی ہے۔"

کہانی سنا کر۔ روح خاموش ہو گئی۔ چند لمحوں کے بعد وہ پھر راجا سے مخاطب ہوئی۔ "ہاں تو راجا اب بتا کہ مدن سندری ان میں سے کسے اپنا شوہر کہے اور کسے اپنا بھائی؟ مگر یاد رکھ کہ اگر تو جواب سے واقف ہے اور نو بتانے سے گریز کرتا ہے، تو تیرا سر پاش پاش ہو جائے گا۔" راجا نے یہ دلچسپ کہانی غور سے سنی اور جواب دیا۔ "جس دھڑ پر مدن سندری کے شوہر کا سر لگا دیا گیا ہے وہ جسم مدن سندری کا شوہر ہے اور جس دھڑ پر اس کے بھائی کا سر ہے وہ اس کا بھائی ہے۔ کیونکہ کھوپڑی میں دماغ ہوتا ہے اور دماغ جسم کا بادشاہ ہے اور چہرے کی مدد سے ہی جسم کو پہچانا جاتا ہے۔" راجا یہ کہہ کر خاموش ہو گیا۔ — روح نہایت خاموشی سے لاش سمیت اس کے کندھے پر سے ہٹ گئی اور راجا کو پھر شیشم کے درخت تلے جانا پڑا۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ دلچسپ کہانیاں سن کر راجا اتنی محنتِ شاقہ کی صعوبت کو بھی بھول گیا تھا۔ اور دوسری طرف اسے سادھو سے کیا ہوا وعدہ پورا کرنا تھا۔ لہٰذا وہ ہر قیمت پر لاش کو سادھو تک پہنچانا چاہتا تھا۔ چنانچہ حسب سابق ایک بار پھر وہ لاش کو درخت پر سے اتار کر لایا۔ اور اب اس نے۔ روح سے جو کہانی سنی وہ یوں تھی:۔



نزاکت

"انگا کے قریب برہمنوں کی ایک بہت بڑی آبادی ہے جسے ورکشا گھاٹ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ یہاں کسی زمانے میں ایک امیر و کبیر برہمن رہا کرتا تھا جس کا نام وشنو سوامی تھا جو دیوتاؤں کو بڑی باقاعدگی کے ساتھ بھینٹ دیا کرتا تھا۔ اس کے تین بیٹے تھے۔ یہ تینوں بیٹے بڑے فلسفیانہ خیالات کے حامل تھے۔ ایک دن باپ نے ان سے کہا:۔

"بیٹا! مجھے دیوتاؤں سے مانی ہوئی ایک منت پوری کرنی ہے جاؤ اور دریا سے ایک مگر مچھ پکڑ لاؤ۔" چنانچہ تینوں بھائی دریا پر آئے اور انہیں ایک مگر مچھ مل گیا۔ سب سے بڑے بھائی نے اپنے دونوں چھوٹے بھائیوں سے کہا "دیکھو تم دونوں مگر مچھ کو اٹھا کر گھر لے چلو، میں اسے نہیں اٹھاؤں گا۔ چھی چھی، مجھے تو اس غلیظ لجلجی شے سے گھن آتی ہے۔" دونوں بھائیوں نے بھی یک زبان ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ "واہ جب آپ نہیں اٹھا سکتے تو ہم اسے کیوں اٹھائیں؟"

"لیکن میں کہتا ہوں کہ تمہیں اسے لے جانا پڑے گا۔ ورنہ اگر کوئی ایسی ویسی بات ہو گئی تو ذمہ دار تم خود ہو گے اور تم دونوں کا ٹھکانا جہنم ہو گا۔" بڑے بھائی نے غصّے سے کہا۔

دونوں بھائی ہنس پڑے۔ "خوب یعنی آپ ہمارا فرض تو ہمیں یاد دلا رہے ہیں اور خود اپنا فرض یاد نہیں ہے۔"

"مگر تم دونوں یہ تو سوچو کہ میں کھانوں کے معاملے میں کتنا نفاست پسند واقع ہوا ہوں کہ کسی ایسی شے کو جس سے مجھے ذرا سی بھی گھن محسوس ہوتی ہو، میں چھونا تک گوارا نہیں کرتا۔"

"اس لحاظ سے تو میں عورتوں کے معاملے میں بڑا نفاست پسند واقع ہوا ہوں۔" منجھلے بھائی نے کہا۔

"پھر تو چھوٹے بھائی کو گھر مجھے گھر لے جانا چاہیئے۔" بڑے بھائی نے فیصلہ دیا۔

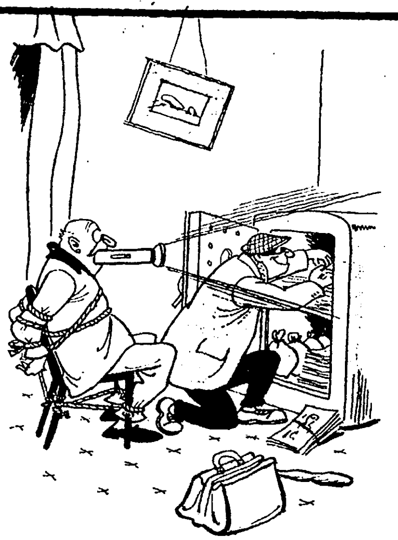
"ارے جاؤ جاؤ میں بستر کے معاملے میں تم دونوں سے زیادہ نفاست پسند واقع ہوا ہوں۔ ہوں! بھلا میں اسے کیوں لے جاؤں؟" تیسرے بھائی نے جل کر جواب دیا۔

تینوں بھائی لڑنے لگے اور آخرکار غصے میں بھرے ہوئے قریبی ضلع کے حاکم کے پاس پہنچے اور جا کر اس سے سارا واقعہ کہہ سنایا اور مدد کے طالب ہوئے۔

"اچھا تم تینوں میرے پاس ٹھہرو میں تم تینوں کا امتحان لیتا ہوں اس کے بعد فیصلہ دوں گا کہ کیا کرنا چاہیئے۔" حاکم نے جواب دیا۔ تینوں بھائی حاکم کے مہمان خانے میں پہنچا دیئے گئے۔ جب کھانے کا وقت آیا تو حاکم نے تینوں بھائیوں کو ایک مناسب جگہ پر بٹھا دیا اور حکم دیا کہ بہترین طریقے سے تیار کیا ہوا شاہی کھانا جو کچھ خوشبوؤں سے معطر ہو ان تینوں بھائیوں کو کھلایا جائے۔ جب کھانا سامنے آیا تو تینوں نوجوانوں میں سے ایک نے ناک پر انگلی رکھ کر اسے سونگھنا شروع کر دیا۔ یہ وہی نوجوان تھا جس نے اپنے آپ کو کھانوں کے بارے میں نفاست پسند بتایا تھا۔

"کھانا کھاؤ۔ کیا بات ہے؟ چاول تو بڑے لذیذ بنے ہیں" ؟ حاکم نے نہایت نرمی سے لڑکے سے کہا۔

"بات یہ ہے جناب عالی کہ اس چاول میں مجھے جلی ہوئی لاشوں کی بو آ رہی ہے۔ واقعی یہ بہت لذیذ ہے لیکن افسوس کہ میں اسے نہیں کھا سکتا"، لڑکے نے جواب دیا۔ حاکم کے حکم پر دسترخوان پر موجود تمام لوگوں نے پلیٹ کو کئی کئی بار سونگھا لیکن کسی کو بھی بدبو کا احساس نہ ہوا لڑکے نے اب ناک پر کپڑا باندھ لیا تھا اور وہ کسی قیمت پر کھانا کھانے پر راضی نہ تھا۔ چنانچہ حاکم نے تحقیقات کرائی، پتا چلا کہ جس زمین پر چاولوں کی فصل بوئی گئی تھی وہ کسی زمانے میں مرگھٹ کے طور پر استعمال ہوتی تھی۔ اب حاکم کو لڑکے کے اس دعوے کو کہ وہ کھانوں کے معاملے میں بڑا نفاست پسند واقع ہوا ہے تسلیم کرنا پڑا اور اس نے لڑکے کو کچھ اور چیزیں کھانے کی اجازت دے دی۔ کھانے کے بعد تینوں لڑکوں کو شاہی مہمان خانے میں الگ الگ کمروں میں بھیج دیا گیا۔ رات کے پچھلے



پہر راجا نے اپنے حرم کی انتہائی خوبصورت نوجوان لڑکی کو سجا بنا کر اس دوسرے لڑکے کے کمرے میں روانہ کر دیا جو اپنے دعوے کے مطابق عورتوں کے معاملے میں بڑا نفاست پسند واقع ہوا تھا۔ چاند سا دمکتا ہوا چہرہ سُرخ رخسار گلابی ہونٹ، گھرے سیاہ لانبے لانبے بال، پتلی پتلی انگلیاں نازک کلائیاں عشق پیچاں کی طرح بل کھاتی ہوئی کمر اس کے اندر گداز تھا اس کی آنکھیں کسی گہری جھیل کے مانند تھیں۔ غرض اس کے حسنِ جہاں سوز کو بیان کرنا زبان کی طاقت سے باہر ہے۔ جب یہ معطر دوشیزہ کمرے میں داخل ہوئی تو اس کے حسن کی چمک دمک سے کمرے کی تاریکی روشنی سے بدل گئی لیکن نوجوان برہمن نے اپنی ناک پر ہاتھ رکھ لیا اور چیخنے لگا۔ "اوہ! اسے یہاں سے نکالو۔ میں مرا... ہائے میں مرا... اس میں بکری کی سی گھراند آ رہی ہے"۔ حاکم کے خدمت گار جو اس عورت کو برہمن کے کمرے میں لائے تھے اسے واپس حاکم کے پاس لے گئے اور ماجرا سنایا۔ حاکم نے برہمن لڑکے کو بلایا اور کہا "بڑے تعجب کی بات ہے یہ دوشیزۂ نوبہار تمہیں پسند نہیں۔ ارے یہ تو میرے ذاتی حرم کی حسین ترین عورتوں میں سے ہے اور اس کے جسم کو بہترین خوشبوؤں سے معطر کیا گیا ہے" لیکن حاکم کی بات لڑکے کی سمجھ میں نہ آئی اور وہ اپنی ضد پر اڑا رہا۔ اور اب حاکم کے چہرے پر بھی الجھن اور شک کے آثار

نمودار ہونے لگے تھے۔ اس نے تحقیق کی تو پتا چلا کہ اس عورت کے والدین اسے بہت چھوٹا سا چھوڑ کر سورگ باش ہو گئے تھے اور وہ بکری کے دودھ پر پلی تھی۔ حاکم کو یہ سُن کر بڑا تعجب ہوا اور وہ لڑکے کی نفاست پسندی کا قائل ہو گیا۔ بعد ازاں حاکم نے خادموں کو حکم دیا کہ تیسرے نوجوان کے لئے ایک بستر تیار کیا جائے جس پر چھ نہایت نرم خوبصورت گدوں کی تہیں لگائی جائیں چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اور تیسرا نوجوان اس بستر پر سو گیا۔ لیکن ابھی اسے سوتے ہوئے چند لمحے بھی نہ گزرے تھے کہ وہ بیزاری سے منہ بناتا ہوا اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے اپنے ایک پہلو کو ہاتھ سے دبا رکھا تھا۔ خادموں نے نوجوان کے جسم کی اس جگہ کا جائزہ لیا جہاں اس نے ہاتھ رکھا ہوا تھا۔ وہاں انہیں ایک لمبی سُرخ سرخ لکیر دکھائی دی جیسے کسی نے سوئی کی نوک جلد کے اس حصے پر گزار دی ہو۔ خادم حاکم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سارا واقعہ اسے سنایا۔ حاکم نے حکم دیا کہ وہ غور سے بستر کی چادروں اور گدوں کو دیکھیں کہ کہیں کوئی نوکیلی چیز تو پڑی ہوئی نہیں ہے۔ انہوں نے بڑی احتیاط اور انہماک سے بستر کا معائنہ شروع کیا اور آخری چھٹے گدے کے نیچے انہیں ایک بال پڑا ملا۔ اس بال کی لمبائی سے جسم پر پڑی ہوئی سُرخ لکیر کی لمبائی کو ناپا گیا تو دونوں برابر تھیں۔ حاکم کو بڑا تعجب ہوا اور وہ تیسرے نوجوان کی نزاکت اور نفاست دونوں کا قائل ہو گیا۔ حاکم کو تینوں واقعات دیکھ کر از حد پریشانی ہوئی۔ وہ ساری رات بستر پر پڑا کروٹیں بدلتا رہا۔ اس کی بیویوں نے اسے جب اس حال میں دیکھا تو اس کی دلجوئی کرنے کی کوشش کی لیکن بے سود۔ دوسرے دن صبح کو حاکم نے اپنا فیصلہ سنایا اور کہا کہ تینوں نوجوان نفاست کے معاملے میں بے مثال ہیں۔ اس نے ان میں سے ہر ایک کو سو سو اشرفیاں بطور انعام دیں۔ برہمن نوجوان اب مگرمچھ کو بالکل بھول چکے تھے۔ انہوں نے اسی ضلع میں ہنسی خوشی رہائش اختیار کر لی۔

رُوح یہ کہانی سنا کر خاموش ہو گئی اور اس نے وکرم سین سے پوچھا "تو بتا راجا تینوں میں سے کونسا نوجوان سب سے زیادہ نفاست پسند تھا؟ مگر یاد رکھ اگر تو جواب سے واقف ہے اور بتانے سے گریز کرتا ہے تو تیرا سر پاش پاش ہو جائے گا۔"

نڈر راجا نے چند لمحے توقف کیا اور بولا۔ میرا خیال ہے کہ تیسرا نوجوان سب سے زیادہ نفاست پسند تھا کیونکہ ایک بال نے جو اس کے بستر میں چھٹے گدے کے نیچے پڑا تھا اس کے جسم پر زخم ڈال دیا اور باقی دو نوجوانوں کی نفاست پسندی اس نوجوان کی نفاست پسندی کا مقابلہ نہیں کر سکتی کیونکہ جو ثبوت انہوں نے اپنی نفاست پسندی کے بہم پہنچائے تھے وہ سُنی سنائی باتوں پر بھی مبنی ہو سکتے تھے۔ بادشاہ کا یہ جواب سُن کر۔ رُوح لاش سمیت اس کے کندھے پر سے غائب ہو گئی اور ایک بار پھر اسے شیشم کے اسی درخت تک جا کر لاش کو واپس لانا پڑا۔

راستے میں۔ رُوح نے راجا کو پھر ایک کہانی سنائی تاکہ ماحول کی بدمزگی راجا کو پریشان نہ کر سکے۔



تبدیلیٔ جنس

نیپال کے ایک شہر سیوا پور پہ کسی زمانے میں یا ساکیتو کی حکومت تھی۔ اس نے حکومت کے تمام کاروبار کی ذمہ داری اپنے معتبر وزیراعظم پرچنا ساگر کے کاندھوں پر ڈال رکھی تھی اور اپنی ملکہ چندر را پربھا کی محبت میں غرق، زندگی عیش و عشرت میں گزار رہا تھا۔ اس کی ایک بیٹی تھی ششی پربھا۔ حُسن میں جس کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ ایک دن کا ذکر ہے کہ موسم بہار کے تہوار سرسوتی کے موقع پر وہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ باغ میں پھول جمع کر رہی تھی۔ اس کے ایک ہاتھ میں ٹوکری تھی اور دوسرے ہاتھ سے وہ پھول اٹھا کر اس میں جمع کرتی جاتی تھی۔ ایک دفعہ جب اس نے ایک پھول توڑنے کے لئے ہاتھ آگے کی طرف بڑھایا تو اس کا سُرخ و سفید بدن کا کچھ حصہ عُریاں ہو گیا۔ اس حالت میں قریب سے گزرتے ہوئے ایک برہمن زادے کی نظر اس پر پڑی اور وہ مبہوت ہو کر اس قتالۂ عالم کے پریوں جیسے حُسن کی رعنائیوں میں گم ہو گیا۔ اس برہمن زادے

کا نام من سوامی تھا اور وہ بھی تہوار منانے کے لئے یہاں آیا تھا۔ ادھر ششی نے جب اس خوبرو نوجوان کو دیکھا تو اسے بھی اپنا ہوش نہ رہا۔ اور وہ اس حقیقت کو فراموش کر گئی کہ اس کی سہیلیاں اس کی ایک ایک حرکت پر ایک دوسرے کی طرف دیکھ دیکھ کر معنی خیز اشارے کر رہی ہیں اور مسکرا رہی ہیں۔ نوجوان کے ذہن میں حسن کی دیوی کو دیکھنے کے بعد خیالات کا ایک طوفان ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔

"کیا یہ عشق کی دیوی تو نہیں جو عشق کے دیوتا کے لئے موسم بہار کے عطا کردہ پھول جمع کر رہی ہے تاکہ انہیں تیر بنا کر اپنے محبوب پر وار کرے۔ یہ کون ہے۔ کون؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ دیوی آکاش سے اتر کر کرشنا کو خوش کرنے آئی ہو۔"

ادھر ششی بھی خیالوں کی دنیا میں کھوئی ہوئی تھی۔ اس کی نگاہیں اب بھی برہمن زادے کے چہرے پر ہی جمی تھیں۔

"اوہ! کتنا خوبصورت، کیسا وجیہہ اور بھلا جوان ہے۔" وہ اس سے زیادہ کچھ نہ سوچ سکی اور نوجوان کی نگاہوں میں نگاہیں ڈالے کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ یہ جمود اس وقت ٹوٹا جب چاروں طرف سے بھاگو بھاگو کی آوازیں سنائی دیں۔ دراصل ایک ہاتھی بگڑ کر بھاگ رہا تھا۔ شہزادی کی سہیلیاں تو خوف و دہشت کی وجہ سے بھاگ گئیں لیکن خود ششی گم سم سی اجنبی نوجوان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑی رہی اور وہ بھاگ نہ سکی۔ ہاتھی قریب آچکا تھا۔ اچانک نوجوان چونکا۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ فوراً راج کماری کو کولی بھر کے ایک طرف کو بھاگ گیا۔ اور ایک محفوظ مقام پر لے جا کر کھڑا کر دیا۔ راج کماری کے دل میں جذبات کا ایک طوفان بپا تھا۔ پیار، شرم اور خوف کے ملے جلے جذبات نے اسے عجیب سی ہیجانی کیفیت میں مبتلا کر دیا تھا۔ برہمن چلا گیا لیکن جاتے جاتے وہ پیچھے مڑ مڑ کر راج کماری کی جانب دیکھتا رہا۔ بالآخر وہ اس کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ ادھر راج کماری محل واپس آئی تو اس کی حالت بہت بگڑی ہوئی تھی۔ وہ اپنے آپ پر قابو پانے میں بڑی دشواری محسوس کر رہی تھی۔ اب محبوب سے جدائی کا غم اسے کائی کی طرح چاٹ رہا تھا۔ ادھر نوجوان برہمن زادہ اپنے گرو مولادیو کے پاس پہنچا جو اس زمانے کا مانا ہوا جادوگر تھا اور اسے اپنی پوری کتھا سنائی اور بتایا کہ وہ ششی کے بغیر زندہ نہ رہ سکے گا۔ چنانچہ مولادیو مسکرایا اور اس کی مدد کا وعدہ کر لیا۔ وہ اپنی کٹیا میں گیا اور دو گولیاں لے کر آیا۔ ایک گولی تو اس نے اپنے منہ میں ڈال لی اور دوسری گولی اس نے من سوامی کو دی۔ گولی منہ میں ڈالتے ہی مولادیو ایک ضعیف العمر برہمن میں تبدیل ہو گیا اور من سوامی ایک خوبصورت نوجوان لڑکی بن گئی۔ اب مولادیو اس لڑکی کو لے کر راجا یاسا کیتو کے دربار میں حاضر ہوا اور عرض کی "مہاراج میرا ایک ہی بیٹا ہے جس کی شادی میں اس لڑکی سے کرنا چاہتا ہوں۔ اس لڑکی کو میں ایک دور دراز ملک سے لایا ہوں لیکن یہاں آیا تو پتا چلا کہ میرا بیٹا کہیں جا چکا ہے۔ اب مجھے اس کو تلاش کرنا ہو گا۔ چونکہ میری غیر موجودگی میں یہ کنواری کنیا اکیلی رہے گی۔ اس لئے میں درخواست کرتا ہوں کہ جب تک میں واپس نہ آؤں یہ آپ کی نگرانی میں رہے اور آپ کی خدمت کرتی رہے۔ مجھے امید ہے کہ یہاں یہ محفوظ رہے گی۔"

راجا نے اس کی یہ درخواست قبول کر لی اور اسے اپنی بیٹی ششی کے ساتھ رہنے کا حکم دیا۔ چالاک مولادیو چلا گیا اور اب من سوامی اپنی محبوبہ ششی کے پاس پہنچ چکا تھا۔ رات کو جب من سوامی نے ششی کی بے کلی دیکھی تو اس کے دکھ کا راز جاننا چاہا جس پر ششی نے من سوامی پر اپنا تمام حال شروع سے آخر تک آشکار کیا۔ لڑکی کی کہانی سن کر من سوامی نے محسوس کیا گویا وہ ہواؤں میں پرواز کر رہا ہو اور اپنی منزل کے قریب پہنچ چکا ہو۔ چنانچہ اس نے جادو کی گولی اپنے منہ سے نکال لی اور اب وہی برہمن زادہ — ششی کا محبوب اس کے سامنے کھڑا تھا اور اس طرح زندگی میں پہلی بار ششی اور من سوامی نے عشق و محبت کی منزل کامیابی سے طے کی۔ وقت گزرتا گیا۔ اب من سوامی دن کے وقت ایک خوبصورت لڑکی اور رات کو ایک وجیہہ برہمن زادے کی حیثیت میں محل میں رہ رہا تھا۔ ان کے شب و روز عیش و نشاط میں گزر رہے تھے۔

ایک دن کا ذکر ہے راجا یاسا کیتو کے بہنوئی گنگادت کی لڑکی گنگاوتی کی شادی راجا کے سب سے معتبر وزیر پرجنا ساگر کے لڑکے سے ہوئی ششی بھی اپنی خاص سہیلی (من سوامی) کے ساتھ اپنے پھوپھا کے گھر گئی لیکن دولہا نے جب ششی کی سہیلی من سوامی کو دیکھا تو اس کی طبیعت مچل گئی اور اب اس نے مطالبہ کیا کہ وہ شادی کرے گا تو من سوامی سے ورنہ نہیں۔ بڑی مشکل سے موجودہ شادی کی رسوم طے ہوئیں لیکن دولہا اپنے ہوش و حواس میں نہیں تھا اسے کئی مرتبہ دورے پڑے۔ بالآخر وزیر نے ڈرتے ڈرتے راجا کے حضور تمام واقعہ پیش کیا۔ راجا بڑا ہی انصاف پسند اور نیک باطن تھا۔ اس نے اپنی کابینہ کے سامنے یہ مسئلہ



پیش کیا اور انہیں بتایا کہ ایک طرف تو امانت میں خیانت کا جرم ہے اور دوسری طرف پورے ملک کی سلامتی کا سوال ہے کیونکہ پرجناساگر حکومت کا تمام کاروبار سنبھالے ہوئے ہے اور ظاہر ہے کہ بیٹے کو نقصان پہنچنے کے بعد اس کی دلچسپی کسی چیز میں بھی باقی نہ رہ سکے گی۔ چنانچہ دونوں برائیوں پر غور کرنے کے بعد کابینہ نے فیصلہ دے دیا کہ وزیراعظم کے لڑکے کی شادی اسی لڑکی کے ساتھ کر دی جائے جس سے وہ چاہتا ہے تاکہ ملک تباہی سے بچ جائے۔ اب بادشاہ من سوامی کی طرف متوجہ ہوا اور اس نے اس کی رائے لی۔ بڑے سوچ بچار کے بعد من سوامی نے وزیراعظم کے لڑکے سے شادی کی تجویز منظور کر لی لیکن شرط یہ رکھی کہ وہ حق زوجیت اس وقت تک ادا نہیں کرے گی جب تک کہ اس کا شوہر کم ازکم مسلسل چھ ماہ تک مقدس مقامات اور تیرتھوں کی یاترا نہیں کر آتا۔ وزیراعظم کے لڑکے نے اس شرط کو منظور کر لیا اور ان دونوں کی شادی ہو گئی۔ اب وزیراعظم کے لڑکے کی دونوں بیویاں گنگادتی اور من سوامی ایک ہی مکان میں رہنے لگیں اور یہ خود وعدے کے مطابق یاترا پر چلا گیا۔ جب من سوامی نے گنگادتی کو ہجر کی طویل راتوں میں کروٹیں بدلتے پریشان اور اداس دیکھا تو ایک رات اس نے جادو کی گولی پھر اپنے منہ سے نکال لی اور اس پر ظاہر کیا کہ دیوتاؤں نے اسے اپنی جنس بدل لینے کی طاقت بالکل اسی طرح بخشی تھی جیسے سورج دیوتا کے خاندان کا ایک فرد پاربتی دیوی کی بددعا کے زیراثر ایک خوبصورت عورت میں تبدیل ہو گیا تھا اور راجا بدھ نے اس کے عشق میں مبتلا ہو کر اس سے شادی کی تھی اور پھر ان دونوں سے ہمارا ایک مشہور دیوتا پیدا ہوا تھا۔ سادہ لوح گنگادتی من سوامی کے جال میں پھنس گئی اور اب رات کو من سوامی ایک مرد ہوتا اور گنگادتی ایک عورت اور دن بھر یہ دونوں سوکنیں۔

ادھر جادوگر مولادیو کو من سوامی کی تمام سرگرمیوں کا علم تھا۔ ایک مرتبہ پھر وہ اسی برہمن کے روپ میں اپنے ایک اور جادوگر دوست چندن لال کو ایک نوجوان برہمن کے بھیس میں لے کر راجا کے دربار میں حاضر ہوا اور لڑکی کا مطالبہ کیا جسے وہ بطور امانت راجا کے سپرد کر گیا تھا تاکہ اس کی شادی اپنے بیٹے چندن لال سے کرے۔ راجا بڑا پریشان ہوا۔ اس نے اپنی کابینہ سے مشورہ کیا اور مولادیو سے کہا "دیکھو بھئی مجھے افسوس ہے کہ تمہاری وہ لڑکی تو کہیں چلی گئی اور اب میں اسے نہیں ڈھونڈ سکتا۔ ہاں اگر تم چاہو تو میں اپنی بیٹی ششی کو تمہارے بیٹے سے بیاہنے کے لئے تیار ہوں۔"

مولادیو یہ بات سن کر غصے سے سرخ ہو گیا لیکن آخرکار مولادیو نے ششی کو اپنے بیٹے ساسین (چندن لال) کے لئے قبول کر لیا۔ اور راجا نے بڑی شان و شوکت کے ساتھ ششی کو ساسین سے بیاہ دیا۔ چنانچہ مولادیو ششی کو لے کر گھر آ گیا۔ ادھر من سوامی محل سے نکل کر مولادیو کے گھر پہلے ہی پہنچ چکا تھا اور ششی کا انتظار کر رہا تھا۔ لیکن جب یہ لوگ آپس میں ملے تو چندن لال ششی سے من سوامی کے حق میں دستبردار ہونے کو تیار نہ تھا کیونکہ راجا نے بہرحال ششی کو اس کے ساتھ بیاہا تھا۔ اور اس طرح ان دونوں کے درمیان ایک جھگڑا شروع ہو گیا۔" اتنا کہہ کر روح ایک مرتبہ پھر خاموش ہو گئی اور اس نے راجا سے سوال کیا "ہاں تو اے راجا تو بتا۔ کہ اس مسئلے کا کیا حل ہے مگر یاد رکھ اگر تو جواب سے واقف ہے اور بتانے سے گریز کرتا ہے تو تیرا سر پاش پاش ہو جائے گا۔"

راجا اس کہانی سے خاص طور سے لطف اندوز ہوا تھا لہٰذا وہ بڑے اچھے موڈ میں تھا۔ اس نے جواب دیا "میری رائے میں ششی کا سچا حقدار ساسین یا چندن لال ہے کیونکہ ششی کے باپ نے قانونی طور پر اس کا ہاتھ چندن لال ہی کے ہاتھ میں دیا تھا۔ من سوامی نے بے شک لڑکی کو دھوکے سے حاصل کر لیا تھا لیکن اس کی شادی باقاعدہ اس کے ساتھ نہیں ہوئی تھی اور یہی قانون بھی کہتا ہے کہ چور اپنے آپ کو مسروقہ مال کے مالک کی حیثیت سے پیش نہیں کر سکتا۔"

روح نے جب یہ جواب سنا تو وہ فوراً ہی لاش سمیت راجا کے کندھے پر سے غائب ہو گئی اور اب پھر راجا شیشم کے درخت کی طرف واپس جا رہا تھا۔ ایک بار پھر بہادر اور ارادے کے اٹل راجا نے لاش کو درخت پر سے اتار کر کندھے پر رکھا اور اپنی منزل کی طرف چل دیا راستے میں۔ روح نے پھر راجا کو ایک کہانی سنائی۔



حسن کا جادو

دریائے گنگا کے کنارے کسی زمانے میں ایک شہر آباد تھا جس کا نام تھا کنک پور۔ یہاں یاسودھن کی حکومت تھی رعایا بڑے آرام سے زندگی گزار رہی تھی، جرم اور قانون کی خلاف ورزی کا کوئی تصور ہی نہ تھا۔ اپنے ملک کے دفاع کے لئے راجا بذاتِ خود ایک ناقابل تسخیر دیوار کے مانند تھا۔ وہ خود اگر کسی جگہ کمزور پڑتا ——— تو وہ موقع گناہ یا قانون کی خلاف ورزی کا موقع ہوتا تھا ورنہ وہ بڑا نڈر بڑا جری اور بہت ہی پُر ہیبت راجا تھا۔ وہ ہمیشہ گناہ کے ارتکاب سے خوفزدہ رہتا اور دیوتاؤں سے پرارتھنا کرتا رہتا کہ دیوتا اسے برائی سے بچائیں۔

اسی شہر میں ایک سوداگر رہتا تھا جو بڑا امیر کبیر تھا۔ اس کی ایک نوجوان حسین بیٹی بھی تھی جس کا نام اوما دیوی تھا۔ اس لڑکی کے حسن کا چرچا دُور دور تک تھا۔ لڑکی شادی کے لائق تھی چنانچہ اس کا باپ راجا کے دربار میں حاضر ہوا اور کہنے لگا "مہاراج! میری ایک بیٹی ہے جسے حسن کے اعتبار سے اس دُنیا کا بہترین ہیرا کہا جاسکتا ہے اور چونکہ مہاراج دنیا کے تمام ہیروں کے مالک ہیں لہٰذا میرا فرض ہے کہ قبل اس کے کہ میں یہ ہیرا کسی اور کو پیش کروں ضروری خیال کرتا ہوں کہ آپ کی خدمت میں پیش کر دیا جائے۔"

راجا نے یہ سُن کر دربار میں موجود جوتشیوں سے زائچہ بنوایا کہ دیکھیں اس لڑکی سے اس کی شادی ملک کے لئے سود مند ثابت ہوگی یا نہیں۔ جوتشی بڑے جہاندیدہ تھے۔ انہوں نے آپس میں اس بات سے اتفاق کیا کہ اگر راجا نے اتنی حسین لڑکی کو اپنی رانی بنا لیا تو پھر وہ اس کے حسن اور عشق میں گرفتار ہو کر ملک اور قوم کو فراموش کر بیٹھے گا اور عجب نہیں کہ اس کے نتائج اس سے بھی زیادہ تباہ کن ثابت ہوں چنانچہ انہوں نے دربار میں حاضر ہو کر راجا کو سلطنت کے حق میں لڑکی کے منحوس ہونے کی اطلاع دی۔ اور راجا نے ان کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے شادی سے انکار کر دیا لیکن راجا کی ہدایت پر لڑکی کے باپ نے اپنی بیٹی کی شادی راجا کے سپہ سالار بالادھر سے کر دی اور اوما دیوی اب اپنے شوہر کے ساتھ خوش و خرم رہنے لگی لیکن اسے غم اس بات کا تھا کہ راجا نے اپنے جوتشیوں کے کہنے پر اسے منحوس قرار دے کر اس سے شادی سے انکار کر دیا تھا۔ سرسوتی کے تہوار کے موقع پر راجا اپنے ہاتھی پر سوار ہو کر شہر میں میلے کا انتظام دیکھنے کے لئے نکلا۔ ہاتھی کے آگے آگے نقیب یہ ہدایت کر رہے تھے کہ شہر کی تمام عورتیں پردہ کر لیں کہیں ایسا نہ ہو کر راجا کے حسن کو دیکھ کر وہ اس پر فریفتہ ہو جائیں اور معاشرتی زندگی میں کسی انقلاب کا خطرہ لاحق ہو۔ اوما دیوی نے جب یہ اعلان سنا تو اس نے اوپر سے جھانک کر ہاتھی پر سوار راجا کو دیکھا۔ اُدھر راجا کی نظر بھی اس پر پڑی۔ اس حسین و جمیل عورت کو دیکھ کر خود راجا اپنے حواس گنوا بیٹھا اور بیہوش ہو گیا۔ اس حالت میں اس کے خدمت گار اسے محل میں لائے۔ جب راجا کے حواس بجا ہوئے تو اس نے اس عورت کے بارے میں دریافت کیا۔ اس کے غصے اور غم کا کوئی ٹھکانا نہ تھا جب اسے یہ معلوم ہوا کہ اسی لڑکی کے باپ نے راجا کو پیش کش کی تھی کہ وہ اس کی لڑکی سے شادی کرلے لیکن جوتشیوں کے کہنے میں آکر اس نے انکار کر دیا تھا۔ چنانچہ اس نے ان تمام بوڑھے جوتشیوں کو ملک بدر کر دیا جنہوں نے لڑکی کو منحوس قرار دیا تھا۔

اب راجا کے لئے ہجر و فراق کی راتیں گزارنا بڑا ہی کٹھن مرحلہ تھا۔ "یہ چاند کتنا ڈھیٹ اور بے شرم ہے کہ اس حسینہ کے سامنے چمکتا ہے۔" راجا اب رات دن انہی خیالوں میں غرق رہنے لگا۔ اب وہ سوکھ کر کانٹا ہو گیا تھا۔ آخر ایک دن اس کے مشیروں نے اصرار کر کے اس سے اس کے دل کا راز اگلوا ہی لیا۔

"اے راجاؤں کے راجا! یہ کون سی مشکل بات ہے۔ آپ اس سے شادی کر سکتے ہیں۔ آخر وہ آپ کی رعیت میں ہے۔" ایک منہ چڑھے درباری نے مشورہ دیا لیکن راجا نے اس کی بات ماننے سے انکار کر دیا۔

سپہ سالار بالادھر کو جب پتا چلا تو وہ راجا کی خدمت میں حاضر ہُوا اور فراخدلی کے ساتھ راجا کے حق میں اپنی بیوی سے دست بردار ہو جانے کی پیشکش کی لیکن اس پر راجا کو غصّہ آگیا۔ کہنے لگا۔

"تم جانتے ہو بالادھر، ہم اس ملک کی قسمت کے مالک ہیں۔ اگر ہم ہی اپنے بنائے ہوئے قانون کی خلاف ورزی شروع کر دیں تو رعایا میں کون ہو گا جو ہمارے حکم کی تعمیل دل و جان سے اور ہماری عزت رُوح کی گہرائیوں سے کرے گا؟ تم میرے قریبی عزیز ہو لیکن تمہیں یہ کیوں خیال آیا کہ چند لمحوں کی مسرت کی خاطر میں آنے والے زمانے کے لوگوں کو اپنے اوپر ہنسنے کا موقع دوں گا اور اپنی آئندہ نسلوں کے لئے ایک مستقل عذاب پیچھے چھوڑ جاؤں گا؟ یاد رکھو میری زندگی میں اگر کبھی ایسا موقع آیا تو میں ایسے فعل قبیح کا ارتکاب کرنے سے زیادہ موت کو پسند کروں گا" اور اس طرح اس مہان راجا نے قانون کی عظمت کو برقرار رکھا۔ کیونکہ جو لوگ عظیم ہوتے ہیں انہیں زندگی کی پرواہ نہیں ہوتی ـــــ دنیاوی خوشیاں حاصل کرنے کے لئے قانون کی بھینٹ دینا کبھی انہیں پسند نہیں ہوتا۔

جب راجا کی حالت زیادہ بگڑ گئی تو پرجا محل کے باہر جمع ہو کر راجا سے مطالبہ کرنے لگی کہ وہ اوما دیوی سے شادی کرے لیکن ہٹیلا راجا اپنے فیصلے پر اڑا رہا اور آخر کار ایک دن دنیا سے رُخصت ہو گیا۔ بالادھر نے جب راجا کی موت کی خبر سنی تو وہ اپنے عظیم مالک کی جدائی برداشت نہ کر سکا اور راجا کی جلتی چتا میں کود پڑا اور خود بھی جل مرا۔"

کہانی سنا کر۔ رُوح نے پھر راجا سے سوال کیا۔ "ہاں تو اے راجا! بتا کہ دونوں میں کون زیادہ پرخلوص تھا۔ راجا یا سپہ سالار؟ مگر یاد رکھ کہ اگر تو جواب سے واقف ہے اور بتانے سے گریز کرتا ہے تو تیرا سر پاش پاش ہو جائے گا۔"

راجا نے جواب دیا "راجا زیادہ پُرخلوص تھا"

"کیوں؟"۔ رُوح نے اعتراض کیا "کیا سپہ سالار زیادہ پُرخلوص نہ تھا؟ اس نے راجا سے اس درجے وفاداری کا ثبوت دیا کہ اُس نے اپنی بیوی کو جس کی رفاقت میں ایک طویل عرصہ گزارا تھا، راجا کی خدمت میں پیش کر دیا اور پھر یہ کہ وہ خود راجا کی چتا میں جل کر ہلاک ہُوا۔ اس کے خلوص اور قربانی کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے؟"

راجا تری وکرم سین مسکرایا "تیرا خیال دُرست نہیں۔ سپہ سالار جو راجا کا ایک خادم تھا اس نے جو کچھ کیا وُہ اس کا فرض تھا کیونکہ خدّام کا یہ فرض ہوتا ہے کہ وہ اپنے مالکوں کو بچانے کے لئے جانوں کی قربانی سے بھی دریغ نہ کریں، لیکن ذرا راجا کی طرف تو دیکھ، طاقت کے نشے میں چُور۔ قانون اس کا غلام، جاہ و جلال اور شان و شوکت کا وہ امین۔ ایسے لوگ اگر اتنا کچھ قبضے میں رکھنے کے باوجود بھی قانون کی بالادستی کو قائم رکھیں اور شہوانی خواہشات کو عوام کی فلاح و بہبود اور ملک کے سکون و اطمینان پر قربان کر دیں اور نفس کو کچل دیں۔ وہ واقعی عظیم کہلانے کے مستحق ہیں۔ اب تو ہی بتا۔ کون زیادہ پُرخلوص تھا؟ راجا یا فوجی سردار؟ یقیناً راجا ہی تھا۔"

وکرم سین یہ کہہ کر چپ ہو گیا۔ رُوح جواب سُن کر ایک بار پھر راجا کے کاندھے سے غائب ہو گئی اور راجا پھر شیشم کے درخت پر سے لاش کو کندھے پر اٹھا لایا۔ رُوح راجا کی ثابت قدمی سے بہت خوش تھی۔ راجا ایک بار پھر اپنی منزل کی جانب ـــــ لاش کے ساتھ آگے بڑھ رہا تھا۔ چنانچہ۔ روح نے راجا کو ایک اور کہانی سُنائی۔



ایک بیٹا تین باپ

کسی زمانے میں جنوبی ہندوستان میں وکرولا کا نامی شہر آباد

تھا۔ جس پر مہاراجا سوریا پربھا کی حکومت تھی۔ یہ مہاراجا طاقت اور شان و شوکت میں کسی طرح راجا اندر سے کم نہ تھا۔ بڑا بانکا سجیلا نوجوان تھا۔ ریاست میں ہر طرف امن و امان تھا۔ اس کی رعایا نے اس کے عہد میں سکھ ہی سکھ دیکھا تھا۔ مہاراجا کی زندگی عیش و عشرت کا جیتا جاگتا نمونہ تھی اور اُسے اگر شکایت تھی تو صرف یہ کہ اُس کا کوئی بیٹا نہ تھا۔

اس شہر کے بعد کسی دوسرے درجے کی ریاست میں ایک بندرگاہ نما بستی واقع تھی جہاں ایک بڑا امیر و کبیر سوداگر رہتا تھا جس کا نام دھن پال تھا اس کی ایک نہایت حسین و جمیل لڑکی تھی۔ اور اس کا نام دھن وتی تھا اس کے حُسن کو دیکھ کر گمان ہوتا تھا کہ دیوتاؤں نے اسے اپنے ہاتھوں سے بنایا ہے۔ آکاش میں رہنے کے لئے۔ مگر کسی بددُعا کے زیر اثر یا کسی جرم کی پاداش میں اُسے زمین پر پھینک دیا گیا تھا۔ جب یہ شعلہ رُخ لڑکی شادی کی عمر کو پہنچی تو اس کے باپ کا انتقال ہو گیا۔ اب ان ماں بیٹی پر بُرا وقت آن پڑا۔ دھن پال کی دولت پر اُس کے بھائی قابض ہو گئے اور ان دونوں کو شہر سے نکلنے پر مجبور ہونا پڑا۔ چنانچہ دھن پال کی بیوی نے چند جواہر جو اُس نے آڑے وقت کے لئے چھپا کر رکھے تھے، اپنے ساتھ لئے اور گھر سے بیٹی کو لے کر نکل گئی۔ شہر سے باہر نکلی تو ایک ویرانے میں پہنچ گئی۔ رات تاریک تھی۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔ دھن وتی اپنی ماں کا ہاتھ پکڑے ٹھوکریں کھاتی چلی جا رہی تھی۔ کبھی کبھی کسی درخت کا کوئی پتہ کھڑکتا یا دُور سے کسی گیدڑ کے رونے کی آواز سُنائی دیتی تو نازونعم میں پلی ہوئی یہ دونوں ماں بیٹی خوف سے تھر تھر کانپنے لگتیں۔ ایک طرف کسی چٹان سے پیٹھ لگا کر بیٹھ جاتیں اور جب ذرا حواس بجا ہوتے تو پھر اپنا سفر شروع کر دیتیں۔

چلتے چلتے دھن وتی کی ماں کا پیر کسی جسم سے ٹکرایا۔ جو دراصل ایک ڈاکو تھا اور اپنے ساتھیوں ہی سے حصے کی بٹائی پر لڑ پڑا تھا اور زخمی ہو گیا تھا۔ وُہ اب بھی زندہ تھا۔ جب سوداگر کی بیوہ کا پیر اس کے زخمی کندھے سے ٹکرایا تو وُہ درد سے چیخ اُٹھا۔ دھن وتی اور اس کی ماں فوراً زمین پر بیٹھ گئیں تو دھن وتی کی ماں نے اس سے پوچھا۔

"اجنبی تم کون ہو۔ اور تمہاری یہ حالت کیسے ہوئی۔ کیا تمہارا کوئی گھر نہیں؟"

"دھیرج دیوی دھیرج! ایک سمے میں ایک سوال!" ڈاکو نے مسکرا کر کہا۔ "میں دراصل ایک ڈاکو ہوں جسے خود اس کے ساتھی زخمی کر کے یہاں ڈال گئے ہیں۔ مگر اتنا سخت جان ہوں کہ موت نہیں آتی۔ ساری زندگی دوسروں کو دُکھ دیتا رہا ہوں اس سمے خود دکھ اُٹھا رہا ہوں۔ اور جب خود دُکھ اُٹھا رہا ہوں تو زندگی سے نفرت ہو رہی ہے۔ بھگوان بھلی کرے۔ مگر دیوی تم تو اپنے بارے میں کچھ بتاؤ تم کون ہو۔"

دھن وتی کی ماں نے اُسے پُورا ماجرا سنایا۔ جب وہ بول رہی تھی۔ اچانک بادلوں نے شرارت کی اور چاند کے چہرے سے گھونگھٹ اُٹھ گیا۔ چاروں طرف چاندنی پھیل گئی اور جب ڈاکو نے سوداگر کی نوجوان بیٹی کو دیکھا تو بے حال ہو گیا۔ کہنے لگا "دیوی بھگوان کے کارن میری ایک پراتھنا قبول کر۔ مجھے اپنی اس کنیا سے بیاہ دے۔ میں مرنے سے پہلے اپنی ایک آشا پوری کرنی چاہتا ہوں۔ اور وہ یہ ہے کہ میرا بھی کوئی بیٹا ہو۔ جس سے میرے بعد میرا نام چلے۔"

"مگر تم تو سورگ باش ہونے کے قریب ہو۔ تمہارے لئے میری بچی کس کام کی؟" ماں نے پوچھا۔

"سنو دیوی یہ لڑکی میری رضا سے میرے لئے ایک لڑکے کو جنم دے گی۔ تم بس وہی کرو، جو میں کہہ رہا ہوں۔ دیکھو وہ سامنے جو درخت دکھائی دے رہا ہے اس کی جڑ میں دس ہزار اشرفیاں دبی ہوئی ہیں تم وہ اشرفیاں نکال لو وُہ تمہاری ہیں اور قریب ہی ایک چشمہ بہہ رہا ہو گا۔ وہاں سے ایک کٹورے میں پانی لے آؤ۔"

بیوہ کو لالچ نے آ لیا۔ اُس نے وہی کیا جو ڈاکو نے بتایا تھا۔ وُہ پانی کی دھار ڈاکو کے ہاتھ پر ڈالتی جاتی اور کہتی جاتی "میں اپنی بیٹی دھن وتی کو تم سے بیاہتی ہوں۔ اور اس طرح دنیائے حسن کا یہ گوہر نایاب ایک قریب المرگ ڈاکو کی گود میں جا پڑا۔ ڈاکو نے دھن وتی کو ہدایت کی۔

"دیکھ پتنی، میں بھگوان کے پاس جا رہا ہوں تجھے اجازت ہے کہ اپنی پسند کے کسی بھی نوجوان سے مل کر میرے لئے ایک بیٹے کو جنم دے۔" اس کے بعد وہ دھن وتی کی ماں سے مخاطب ہوا۔

"دیوی جی میری موت کے بعد میری چِتا کو جلادینا اور میری پتنی کو ٹوکرولاکا لے جانا تم بھی وہیں رہنا اور اسے بھی وہیں رکھنا یہاں تم ہر طرح امن چین سے گزر بسر کرسکو گی۔" یہ کہہ کر ڈاکو خاموش ہو گیا اس کے چہرے پر موت کی زردی چھاگئی اور تھوڑی دیر بعد وہ اس دنیا سے رخصت ہوگیا۔ یہ ماں بیٹی چُپ چاپ قریب ہی واقع اپنے ایک عزیز کے گھر چلی گئیں جہاں وہ اس وقت تک رہیں جب تک کہ ڈاکو کی چِتا جلا نہ دی گئی اور اس کی ہڈیاں دریا بُرد نہ کردی گئیں۔

دوسرے دن یہ دونوں مسافر اپنے زر و جواہر کے ساتھ ٹوکرولاکا شہر پہنچ گئے اور یہاں انہوں نے ایک مکان خرید لیا۔ زندگی آرام سے گزر رہی تھی۔ دوپہر کا وقت تھا دھن وتی جھلملیوں سے باہر بازار کا نظارہ کررہی تھی کہ اُسے ایک نہایت خوبصورت اور وجیہہ برہمن زادہ نظر آیا۔ اُس کا نام من سوامی تھا۔ اس کا باپ استاد تھا اور بڑا عالی نسب تھا۔ دھن وتی نے جب اس نوجوان کو دیکھا تو اُسے اپنے شوہر کی ہدایت یاد آئی۔ بھاگی بھاگی اندر آئی اور ماں سے مشورہ کیا چنانچہ ماں نے نوجوان بیٹی کو اجازت دے دی اور فوراً ہی ایک خادمہ کو بھیج کر اُسے بلوالیا۔

اب اس نوجوان کی بھی سنیے یہ ایک حسینہ آفتاب جبینہ ماہتاب طوائف زادی پر جان چھڑکتا تھا لیکن طوائف نے نتھ اترائی نذرانہ پانچسو اشرفیاں مقرر کر رکھا تھا اور اس نوجوان کو پانچسو اشرفیوں کی ضرورت تھی۔ جب خادمہ اس کے پاس اپنی مالکہ کا پیغام لیکر آئی تو اُس نے کہا کہ مجھے تمہاری مالکہ کے حکم کی تعمیل میں کوئی اعتراض نہیں لیکن میں اس کام کی اُجرت پانچسو اشرفیاں لوں گا۔ خادمہ نے یہ بات مالکہ کو بتائی تو وہ راضی ہوگئی اور برہمن زادہ دھن وتی کے کمرے میں پہنچ گیا۔ اس طرح دھن وتی نے اپنے شوہر کی آرزو کو پورا کیا۔ آخر کار وہ دن بھی آگیا جب دھن وتی نے اپنے مرحوم شوہر کے للنا کو جنم دیا اور پھر ایک رات خواب میں دھن وتی اور اس کی ماں نے شیو دیوتا کی ہدایت سُنی۔ "اس بچے کو ایک ٹوکری میں رکھ کر اچھے کپڑے پہنا کر اور اس کے ساتھ ایک ہزار اشرفیاں رکھو اور مہاراجا سوریا پربھا کے محل کے دروازے پر صبح ہونے سے پہلے پہلے چھوڑ آؤ۔" اسی وقت ماں بیٹی کی آنکھ جو کھلی تو انہوں نے ایک دوسرے کو اپنا خواب بتایا اور پھر ان دونوں نے شیو کی ہدایت پر عمل کیا اور بچے کو مہاراجا کے محل کے دروازے پر صبح ہونے سے پہلے پہلے چھوڑ کر چلی آئیں۔

اِدھر شیو دیوتا نے سوریا پربھا کو خواب میں ہدایت کی۔

"دیکھو ہم نے تمہاری دیرینہ آرزو پوری کی۔ تمہارے محل کے باہر ایک ٹوکری میں ایک بچہ پڑا ہوا ہے۔ اسے منگوالو اور بیٹے کی طرح پالو۔ ہم تم سے بہت خوش ہیں۔ جاؤ اور خوشیاں مناؤ۔" مہاراجا کی آنکھ جو کھلی تو اُس نے فوراً ہی خدمتگاروں کو حکم دیا کہ محل کا دروازہ کھول دیں۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد خدمتگار وہ ٹوکری اٹھائے چلے آرہے تھے۔ مہاراجا بہت خوش تھا۔ سارے ملک میں دھوم مچ گئی۔ ہر طرف خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ چاروں طرف شادیانے بج رہے تھے اور جشن منائے جارہے تھے۔ مہاراجا نے جوتشیوں کے مشورے سے بچے کا نام چندر پربھا رکھا۔ یہ لڑکا اب راجکمار تھا۔ ولیعہد سلطنت تھا اور اس کی پرورش اور تربیت بڑے ناز و نعم اور وید اور رامائن کے عالموں کی زیر نگرانی ہو رہی تھی۔ راجکمار بڑا ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ اب وہ سوریا پربھا کے ساتھ مل کر ملک کے نازک مسائل بڑی حاضر دماغی کے ساتھ حل کرنے لگا۔ دربار کے بڑے بڑے عالم اور وزرائے باتدبیر اس کی صلاحیتوں کے معترف ہی نہیں گرویدہ تھے۔ اب سوریا پربھا کا نام کم اور چندر پربھا کا نام ہر معاملے میں زیادہ سنائی دیتا۔ جب حالات نے یہ صورت اختیار کی تو سوریا پربھا نے نظامِ حکومت چندر پربھا کو دیا اور خود تیرتھ یاترا کے لئے متھرا اور بنارس چلا گیا۔ وہیں گیان دھیان میں اتنا مصروف ہوا کہ پھر واپس نہ آیا۔ نوجوان چندر پربھا کو جب باپ کی موت کا علم ہوا تو اس نے ملک کا انتظام اپنے ایک پرانے نمک خوار قابلِ اعتماد وزیر کے سپرد کیا اور ارکانِ کابینہ سے مخاطب ہوا۔

"ــــــــــــ میں اپنے سورگ باشی پتا کی کوئی خدمت زندگی میں نہ کرسکا۔ اب میں چاہتا ہوں کہ پہلے بنارس جاؤں اور اُن کی ہڈیوں کو خود اپنے ہاتھوں سے دریا برد کروں اس کے بعد میں گیا جانا چاہتا ہوں تاکہ اپنے تمام اسلاف کی سمادھیوں پر چڑھاوے چڑھا سکوں اور اس کے بعد میں مقدس سفر پر روانہ ہونا چاہتا ہوں اور اس مقصد کے لئے میں انتہائی مشرقی ساحلوں تک پہنچنا چاہتا ہوں تاکہ کوئی جگہ ایسی نہ بچے جہاں

میں نے پوجا پاٹ نہ کی ہو۔"

کابینہ کے بہت سے وزیروں نے عوام اور ریاست کی خوشحالی کا واسطہ دے کر نوجوان مہاراجا کو اس طویل سفر سے باز رکھنا چاہا لیکن اولوالعزم راجا نے کسی کی نہ سنی اور سفر پر روانہ ہو گیا۔ عمائدین سلطنت اور عوام کی بہت بڑی تعداد نے مہاراجا کو رخصت کیا۔ راجا کے ساتھ اس کے خاص پروہت بھی تھے اور چند برہمن بھی جن کے علم وفضل سے اس کے باپ اور خود اُس نے بہت کچھ سیکھا تھا۔ یہ چھوٹا سا قافلہ بہت سے ملکوں اور ریاستوں سے گزرا۔ راجا ہر ملک اور ہر ریاست کے مختلف رسوم ورواج لباس لوگوں کی چال ڈھال، بول چال دیکھ کر بہت خوش ہُوا۔ پھر ایک دن انہوں نے دریائے گنگا کو بھی دیکھا اور اشنان کیا۔

اشنان کے بعد مہاراجا نے برہمنوں اور سادھوؤں کو دان دیا۔ باپ کی ہڈیوں کو دریا بُرد کیا اور اس کے بعد دوسری مذہبی رسوم ادا کی گئیں۔ اب وہ اور اس کے ساتھی پھر سفر پر تھے۔ وہ پریاگ گئے جہاں دریائے گنگا اور جمنا کا سنگم واقع ہے۔ اس کے بعد وہ بنارس اور بنارس سے گیا پہنچے۔ یہاں بھی انہوں نے دل بھر کے پوجا پاٹ کی۔ گیا میں اس نے اپنے اسلاف اور آنجہانی باپ کی سمادھیوں پر پھول چڑھائے اور پروہتوں کو نذرانے پیش کئے۔ پھر وہ ایک پنڈا بنا کر گیا کے مقدس چشمے پر پہنچا اور قدیم رسم کے مطابق کھڑا ہو گیا تاکہ باپ کا ہاتھ باہر نکلے تو اس پر رکھ دے (پنڈا ایک خاص قسم کی مٹھائی ہوتی ہے جو ہندو اپنے مرحوم بزرگوں اور رشتہ داروں کو گیا کے مقدس چشمے پر پیش کیا کرتے تھے۔ بالکل اسی طرح جس طرح یہ مہاراجا اپنے باپ کو پیش کرنے کے لئے اتنی دُور کا سفر کر کے یہاں آیا تھا) لیکن اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب اُس نے دیکھا کہ ایک کے بجائے تین ہاتھ چشمے سے باہر نکلے اور اس کے سامنے پھیل گئے۔ چنانچہ اس نے اپنے خاص پروہت کو بلایا اور اس سے کہا کہ اس عقدے کو حل کرے۔ چنانچہ برہمن نے ہاتھوں کا بغور معائنہ کرنے کے بعد یہ فیصلہ دیا۔

"حضور ان میں سے ایک ہاتھ تو یقیناً کسی ڈاکو کا معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ اس میں ایک آہنی سُوئی آرپار ہوئی ہوئی ہے۔ دوسرا ہاتھ جس میں چند تنکے دکھائی دے رہے ہیں وہ مقدس گھاس کے ہیں اور یقیناً یہ کسی برہمن کا ہاتھ ہے اور تیسرا ہاتھ تو آپ دیکھ ہی رہے ہیں۔ اس میں شاہی انگوٹھی موجود ہے جو اس بات کی ضامن ہے کہ یہی سورگ باش مہاراجا سوریا پربھا کا ہاتھ ہے۔"

"لیکن یہ تو بتاؤ کہ یہ پنڈا کس ہاتھ میں رکھا جائے۔ آخر اس کا مطلب کیا ہے۔" مہاراجا نے زچ ہو کر سوال کیا۔ لیکن برہمن مہاراجا کی کوئی مدد نہ کر سکا۔

رُوح یہ کہانی سنا کر خاموش ہو گئی۔ چند لمحے توقف کے بعد اُس نے پھر راجا سے اس مسئلے کا حل دریافت کیا اور کہا کہ اگر تو جواب سے واقف ہے اور بتانے سے گریز کرتا ہے تو تیرا سر پاش پاش ہو جائے گا۔"

راجا تری وکرم سین جس کی ذہانت کے قائل قارئین اب بہت اچھی طرح ہو گئے ہوں گے۔ اس مسئلے کا حل اس طرح پیش کیا۔

"بھئی میں ہندو دھرم سے خوب واقف ہوں۔ اور میری رائے میں مہاراجا کا اصلی باپ ڈاکو تھا اور اُسے پنڈا اس کے ہاتھ پر رکھنا چاہیئے۔ برہمن گو قانونِ فطرت کی رو سے اس کا باپ تھا لیکن چونکہ اس نے ایک فعل اُجرت لے کر انجام دیا تھا لہٰذا اسے مہاراجا کا حقیقی باپ نہیں کہا جا سکتا۔ اسی طرح سوریا پربھا گو چندر پربھا کا باپ تھا لیکن صرف اس حد تک کہ اس نے اس کو بیٹے کی طرح تعلیم دی اور دیوتاؤں نے اُسے کسی مصلحت کے تحت اس کے سپُرد کر دیا اور یہ کہ اُس نے اس کی پرورش کی اور اپنے بعد اپنا جانشین مقرر کر دیا۔ لیکن دیوتاؤں نے جہاں سوریا پربھا پر اس بچے کی نگہداشت کی ذمہ داری ڈالی وہیں اس کا خرچہ ایک ہزار اشرفیوں کی شکل میں پیشگی ادا بھی کر دیا تھا۔ لہٰذا سوریا پربھا بھی صحیح معنوں میں چندر پربھا کا باپ نہیں کہلا سکتا۔ یہی میرا جواب ہے۔"

راجا کا یہ جواب سُن کر۔ رُوح ایک بار پھر لاش سمیت اس کے کندھوں پر سے غائب ہو گئی اور ایک مرتبہ پھر اُسے شیشم کے درخت تک جانا پڑا۔





ایثار و قربانی

ہندوستان کے ایک مشہور شہر کا نام ستراکوٹ ہے۔ کسی زمانے میں اس شہر پر کندرا والوک نامی راجا کی حکومت تھی۔ ہر طرف امن اور خوشحالی کا دور دورہ تھا۔ عوام ذات پات کی تفریق کو گناہِ عظیم سمجھتے تھے۔ راجا کے دربار میں بڑے بڑے عالم جمع تھے اور وہ خود بھی ایک بڑے عالم کی حیثیت سے اپنا جواب نہ رکھتا تھا۔ اس کے قلم کی کاٹ بہادر سے بہادر دشمن کی تلوار کی کاٹ سے کہیں زیادہ مہلک تھی۔ وہ غریبوں کا ہمدرد تھا اور اپنی پرجا کا محبوب۔ ان تمام اوصاف کے ساتھ وہ ایک نہایت وجیہہ و شکیل مرد بھی تھا۔ غرض انسان جن ممکنہ نعمتوں کا متمنی ہو سکتا ہے اُسے حاصل تھیں کمی تھی تو صرف اتنی کہ ابھی تک اُسے کوئی ایسی دوشیزہ نہ مل سکی تھی جسے وہ اپنی رانی بنا سکتا۔

ایک روز ذہن کی پراگندگی کو دُور کرنے کی غرض سے راجا اپنے مصاحبوں کے ساتھ ایک وسیع و عریض جنگل کی طرف شکار کی غرض سے چل پڑا۔ وہ نہایت شاندار پوشاک میں ملبوس بڑی شان کے ساتھ شکار کرتا چلا جا رہا تھا۔ سورج پوری آب و تاب کے ساتھ آسمان پر چمک رہا تھا۔ اس نے نہ معلوم کتنے شیروں کو پچھاڑا اور نہ معلوم کتنے گینڈوں کو زیر کیا۔ شکار کرتے کرتے راجا کی خواہش ہوئی کہ وہ خود تنہا جنگل کے اندر دور تک نکلتا چلا جائے۔ چنانچہ گھوڑے کو ایڑ لگا کر اس نے سرپٹ دوڑا دیا۔ دو تین چابکوں ہی نے یہ حال کر دیا کہ اب گھوڑا ہوا سے باتیں کر رہا تھا۔ اور راجا کو سمت تک کا احساس نہ رہا تھا۔ پلک جھپکتے ہی راجا جنگل کے اندر تیس میل تک پہنچ چکا تھا۔

ایک مقام پر پہنچ کر راجا نے گھوڑے کو قابو کر لیا اور چاروں طرف گھومنے لگا۔ چلتے چلتے وہ ایک تالاب کے قریب پہنچ گیا۔ انگشت نما خوبصورت کنول کھلے ہوئے جھوم رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ راجا کو تالاب کے قریب آنے کی دعوت دے رہے ہوں۔ راجا گھوڑے سے اُترا۔ اُسے نہلایا۔ پانی پلایا اور ہری ہری گھاس چرنے کے لئے چھوڑ دیا۔ پھر اُس نے خود غسل کیا۔ پانی پیا اور خالی خالی نظروں سے چاروں طرف دیکھنے لگا۔ اچانک اُس کی نظر ایک دوشیزہ پر پڑی جو اشوک کے درخت تلے خوبصورت پھولوں سے لدی پھندی بیٹھی تھی۔ یہ ایک سادھو کی بیٹی تھی۔ اُس کے ساتھ اُس کی ایک سہیلی بھی تھی۔ اُس کے بال بڑے قاعدے سے ایک جوڑے میں گندھے ہوئے تھے اور اس کا حُسن بے مثال تھا۔ راجا نے محسوس کیا جیسے عشق کا دیوتا اس پر محبت کے پھولوں کے تیر برسا رہا ہو۔ اس نے سوچا "یہ لڑکی کون ہو سکتی ہے؟ کیا ساوتری یہاں غسل کرنے آ گئی ہے؟ یا یہ شیوجی کی ٹھکرائی ہوئی پاربتی دیوی ہے جو دوبارہ تاسف اور رنج و غم کا اظہار کر کے اُسے جیتنے کی کوشش کر رہی ہے یا کہیں یہ چاند کا پرتو تو نہیں جو خود غروب ہونے کے بعد دن کے وقت اس خطۂ زمین پر اُتر آیا ہے۔ چلو دیکھیں یہ کون ہے؟"

اس وقت وہ پھولوں کا ایک ہار بنا رہی تھی۔ اس نے راجا کو اپنی طرف آتے جو دیکھا۔ تو ہار اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑا وہ مبہوت اور بدحواس ہو کر راجا کے حُسن میں کھو گئی۔ دل میں کہنے لگی "اس جنگل میں ایسا شکیل و جمیل انسان! یہ کون ہو سکتا ہے؟ کوئی فرشتہ تو نہیں؟ اس کی شکل و صورت اتنی دلکش ہے کہ دُنیا کے تمام انسان اُسے دیکھ کر جئیں۔"

ان خیالات میں کھوئی ہوئی وہ اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ وہ شرمیلی نظروں سے اس کی طرف دیکھتی جاتی اور چلتی جاتی۔ اس کی ٹانگیں لڑکھڑا رہی تھیں۔ جیسے اُس نے جام کے جام لنڈھا دیئے ہوں۔ یہ جام شرابِ عشق کے جام تھے۔ عشق جو زندگی ہے، حسن ہے، نیکی ہے اور عظمت و سربلندی کا نشان۔

راجا تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اُس کے قریب جا پہنچا۔ اور نہایت مہذب اور لجاجت بھرے لہجے میں اس سے مخاطب ہُوا۔

"اے دوشیزۂ بے مثال۔ اے ملکۂ حسن۔ ایک مسافر بہت دُور سے تیرے پاس آیا ہے کیا تو اُسے خوش آمدید نہیں کہے گی؟ وہ تیرے حسنِ جہاں سوز کا گرویدہ ہے اور جو تیرا مہمان ہے کیا تو اس سے دو باتیں بھی نہ کرے گی؟ کیا سادھوؤں کا شیوہ یہی ہے کہ جب کوئی مسافر اُن کے یہاں پہنچے تو وُہ اس سے پیچھا چھڑائیں؟"

اس کی سہیلی نے جو بڑی ذہین تھی اور خود بھی حسن و رعنائی کا نمونہ تھی۔ راجا کا عندیہ فوراً سمجھ لیا اور جُھک کر اُسے پرنام کیا اور ایک مہمان کی حیثیت سے اُس کا سواگت کیا۔

راجا اس حسینہ کی زلفِ گرہ گیر کا اسیر ہو چکا تھا۔ اُس نے اُس کی سہیلی سے دریافت کیا "اے حسین نیک بخت دوشیزہ کیا تو مجھے اپنی سہیلی کے بارے میں کچھ نہ بتائے گی؟ یہ کون ہے؟ کہاں رہتی ہے؟ اس کے ماں باپ کہاں ہیں؟ اس کا نام کیا ہے؟ اور یہ اس سنسان اور ویران مقام میں آخر سادھوؤں کی سی زندگی کیوں گزار رہی ہے۔ آخر یہ کیوں اپنے حسن کی جلوہ سامانیوں سے دنیا کو محروم تماشا کئے ہوئے ہے؟"

سہیلی نے جواب دیا "سن اے اجنبی! یہ لڑکی عظیم سادھو کنوا اور عظیم دیوی مینا کا کی کنواری بیٹی ہے؟ یہ یہیں پلی اور یہیں بڑھی۔ اس کا نام اندوار پربھا ہے۔ ابھی کچھ دیر پہلے میری سہیلی اپنے باپ کی اجازت سے اس تالاب پر غسل کرنے آئی تھی۔ اس کے باپ کی کٹیا یہاں سے کچھ زیادہ دُور نہیں۔"

راجا مسرت و انبساط کے عالم میں سادھو کی کٹیا کی طرف چل دیا تاکہ لڑکی کے لئے اپنا پیغام دے سکے۔ اُس نے اپنے گھوڑے کو کٹیا کے باہر چھوڑا اور خود اندر چلا گیا۔ مہاتما کنوا کٹیا کے اندر موجود تھے اُن کے چہرے پر تازگی اور نور تھا۔ راجا اُس کی طرف بڑھا۔ بڑے ادب سے پرنام کیا اور چند نذرانے پیش کئے۔ جب راجا ایک طرف آرام سے بیٹھ گیا تو سادھو اس سے مخاطب ہُوا "میرے بچے کندرا دالوک میں جو کچھ تمہیں تمہارے فائدے کے لئے بتا رہا ہوں۔ غور سے سنو۔ زندگی آواگون کا ایک مسلسل عمل ہے اور کائنات کے تمام جاندار اس عمل سے متاثر ہیں اور ہر وقت اسی خوف میں مبتلا رہتے ہیں کہ دیکھئے آئندہ جنم میں انہیں کون سا رُوپ ملے۔ تو میرا کہنا یہ ہے کہ تمہیں زندگی سیر و شکار اور تفریح کے لئے نہیں ملی ہے۔ بھگوان نے تم بہادروں کے ہاتھ میں تلوار اس لئے دی ہے کہ تم اس سے کمزوروں کی حفاظت کرو۔ حقداروں کا حق دلاؤ۔ جو تمہاری سلطنت، تمہاری پرجا کے لئے خوف اور خطرے کا باعث ہیں۔ ان زہریلے کانٹوں کو اکھاڑ پھینکنے کے کام میں اپنی تلوار استعمال کرو۔ ہر لمحے تغیر پزیر قسمت کی موافقت چاہتے ہو تو اپنے ہاتھیوں، اپنے گھڑسواروں اور اپنے عمالِ حکومت کو اُن کی فطری صلاحیتوں کے مطابق کام پر لگاؤ۔ بھگوان نے جو راج پاٹ تمہیں عطا کیا ہے اُس کی نعمتوں کا شکر ادا کرو اور خوشیاں اور مسرتیں حاصل کرو۔ غریبوں، کمزوروں اور سادھوؤں پر رحم کرو۔ انہیں دھن دولت دے کر اپنی شہرت و عظمت میں اضافہ کرو اور یہ فضول کام جس کے لئے تم نے یہ طویل سفر کیا ہے اسے ترک کر دو۔ کیونکہ یہ تمہارا کام نہیں ہے۔ ایسی چیزوں کے پیچھے مارے مارے پھرنا نہیں تم گھر بیٹھے حاصل کر سکتے ہو۔ تمہارے جیسے ذمہ دار اور عقل مند انسان کو اپنا وقت اس طرح برباد نہیں کرنا چاہیئے۔ کیا تجھے نہیں معلوم کہ پندو جیسا بہادر ایک معمولی جانور کے ہاتھوں اپنی جان گنوا بیٹھا تھا۔ اس سے دیوتا الگ ناراض ہو گئے تھے کہ اتنے بہادر انسان نے ایک حقیر سے مقصد میں کمزور جانور کے ہاتھوں اپنی جان دے دی۔

راجا کندرا دالوک کو سادھو کی یہ تقریر بڑی دلکش محسوس ہُوئی اُس نے سادھو کا شکریہ ادا کیا، کہنے لگا "محترم بزرگ آپ نے انمول اُپدیش دے کر مجھ پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ انہیں میں زندگی بھر فراموش نہ کر سکوں گا۔ میں آئندہ اس سیر سپاٹے کی زندگی سے اجتناب کروں گا تاکہ اپنی پرجا پر زیادہ توجہ دے سکوں۔ اور ملک کی خوشحالی کے لئے کام کر سکوں۔

"مجھے خوشی ہے کہ تمہیں اپنی رعایا کی خوشی کا خیال ہے بولو کیا مانگتے ہو؟"

موقع بڑا اچھا تھا۔ راجا فوراً بول پڑا "اے نیک دل بزرگ میں آپ کی بیٹی اندوارا پربھا سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

ایسا ہی ہُوا۔ جب لڑکی اشنان کر کے واپس آگئی تو سادھو نے راجا کے ہاتھ میں اس کا ہاتھ دے دیا۔ اسی وقت شادی کی رسمیں ادا ہوئیں اور یہ حسین کی دیوی اپنے پتی کے ساتھ بابل کی کٹیا

سے روانہ ہوئی۔ اس کٹیا سے جہاں اُس نے زندگی کا ایک بڑا ہی طول وطویل زمانہ گزارا تھا۔ ایسا زمانہ جس کی یاد زندگی بھر عورتوں کے دل میں چٹکیاں لیتی رہتی ہے۔ اس کی سہیلیاں اس کی جدائی کے غم میں اشک بار تھیں اور وہ خود بھی بڑی افسردہ اور ملول دکھائی دیتی تھی لیکن اُس کو یہ طمانیت بھی حاصل تھی کہ اُسے ایک ایسا جوان مل گیا تھا جسے اُس نے پہلی ہی نظر میں عشق کی تمام تر شدتوں سے چاہا تھا۔ اُس کے ساتھ پوری زندگی گزارنے کا حسین تصوّر بھی روح افزا تھا۔ سادھو لڑکی کی سہیلیاں اور سادھو کے چیلے دُور تک دونوں کو رخصت کرنے آئے اور پھر راجا گھوڑے پر سوار ہو کر اپنے سفر پر روانہ ہو گیا۔

اوپر چمکتا ہوا سورج راجا کا یہ مہماتی سفر سارا دن بڑی دلچسپی سے دیکھتا رہا تھا لیکن اب وہ تھک چکا تھا اس لئے وہ آرام کرنے کے لئے پہاڑیوں کے پیچھے چلا گیا۔ رات سیاہ ماتمی چادر اوڑھے برہا کی اگنی میں جلتی ہوئی کسی بدقسمت دوشیزہ کی مانند فضائے بسیط پر محیط ہو گئی۔ گویا دنیا والوں کی نظروں سے بچ کر چھپ چھپ کر رو رہی ہو۔

— راجا کا سفر جاری تھا کہ ایک تالاب کے کنارے اُسے ایک درخت دکھائی دیا جسے چاروں طرف سے چھوٹے چھوٹے پودوں نے گھیر رکھا تھا۔ یہ جگہ بڑی پُر فضا تھی۔ راجا نے یہیں شب بسری کا فیصلہ کیا۔ وہ گھوڑے پر سے اُتر پڑا اور اپنی حسین پتنی کو بھی اُتارا اس نے چند لمحے تالاب کے کنارے پھیلی ہوئی گھاس پر اپنی حسین پتنی کے ساتھ آرام کیا۔ وُہ منظر کے حسن میں کھو گیا پھر اس نے وہاں کے نرم نرم پتوں سے درخت کے نیچے بستر بنایا اور اپنی بیوی کے ساتھ وہیں دراز ہو گیا۔ ٹھیک اسی لمحے چاند نے اپنے چہرے سے تاریکی کی نقاب الٹ دی اور مشرق کا منہ چوم لیا اور فضا نور سے معمور ہو گئی۔ چاند کی روشنی درخت کی پتیوں سے چھن چھن کر اس جوڑے پر پڑ رہی تھی۔ یہ دونوں دنیا و مافیہا سے بے خبر عشق و محبت کی بھول بھلیوں میں گم تھے۔ دونوں راز و نیاز میں محو تھے۔ راجا آہستہ آہستہ اندوار پربھا کے دریائے حسن میں ڈوبا جا رہا تھا۔ بڑی بڑی خوبصورت غزالی آنکھیں، لمبے لمبے گھنیرے سیاہ بال۔ بید لرزاں کی مانند سرو قد، اس نے اس کے ہونٹوں۔ آنکھوں۔ رخساروں اور اُن تمام اعضا پر جو شدتِ عشق کے حامل کہے جا سکتے ہیں۔ والہانہ مجنونانہ علامات محبت ثبت کیں اور اس طرح یہ رات راجا کی زندگی کی انتہائی پُرجوش، طوفانی اور ہیجان انگیز رات ثابت ہوئی۔ رات گزر گئی۔ لیکن راجا کے لئے یہ طویل رات چند لمحوں سے زیادہ نہ تھی وُہ اب بھی پیاسا تھا۔ اُس کی روح اب بھی پیاسی تھی۔ اس میں اب بھی تڑپ تھی اور اس تڑپ میں اب بھی گرمی موجود تھی۔

صبح کو دونوں اٹھے۔ اور راجا اپنے ساتھیوں اور مصاحبوں کے پاس واپس پہنچنے کے لئے چل کھڑا ہوا۔ ٹھیک اسی وقت سورج دیوتا نے اپنی شعاعوں کے تیر سے رات کی دیوی کو ہلاک کر دیا جس نے کنول کے پھولوں کو اس قدر مرجھا دیا تھا کہ اب وُہ زندگی کی آخری سانسیں لیتے دکھائی دیتے تھے۔ راجا کے چلتے ہی ایک زوردار دھماکا ہوا۔ گویا قیامت ٹوٹ پڑی ہو۔ اور ایک برہمن کا بھوت (راکھشس) جس کے جسم پر بھبھوت ملا ہوا تھا۔ راجا کے سامنے آ کھڑا ہوا اس کے گلے میں انسان کے اندرونی اعضا کی مالائیں پڑی ہوئی تھیں اس کے بائیں کاندھے سے داہنے کولھے تک انسانی بالوں سے بُنا ہوا دھاگا پڑا ہوا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں انسانی کاسۂ سر تھا جس میں انسانی خون اور گوشت بھرا ہوا تھا۔ پہلے وہ گوشت کا ایک ٹکڑا منہ میں ڈالتا اور پھر خون کے گھونٹوں سے اسے گلے کے نیچے اتار دیتا۔ اس فوق الفطرت مخلوق کے منہ سے ایک قہقہہ پھوٹ پڑا۔ ایسا معلوم ہوا جیسے سینکڑوں بدروحیں ایک ساتھ مل کر چیخی ہوں۔ اس نے گرجدار آواز میں راجا سے کہا:

”نابکار! سُن، میں ایک راکھشس (بھوت) ہوں اس درخت پر میرا بسیرا ہے۔ اس درخت کی بے حرمتی کی دیوتاؤں تک کو جرأت نہیں ہو سکتی اور تُو تو۔ تمام رات اس کے نیچے ایک عورت کے ساتھ لوٹیں لگاتا رہا۔ تو نے حد سے تجاوز کیا ہے۔ اچھا ہوا کہ میں رات سیر کے بعد ٹھیک اس وقت یہاں پہنچا جبکہ تو یہاں سے روانہ ہونے ہی والا تھا، اب تو اپنے کئے کی سزا بھگتنے کے لئے تیار ہو جا۔ تو میرا مجرم ہے۔ اب میں تیرا دل چیروں گا اور تیرا خون پیئوں گا۔“

یہ دھمکیاں سُن کر راجا پر لرزہ طاری ہو گیا۔ اُس نے نہایت لجاجت آمیز انداز میں کہا ”اے طاقتور راکھشس! مجھ سے یہ سب کچھ نادانستگی میں سرزد ہوا ہے۔ لہٰذا مجھے معاف کر دے۔ مجھے اپنا ایک ایسا مہمان سمجھ جو رات گزارنے کے لئے تیرے گھر آ کر ٹھہر گیا تھا میں

ہر وہ کام کرنے کے لئے تیار ہوں جو تو چاہے۔ میں تیری پسند کا انسانی شکار بھی مہیا کر سکتا ہوں لیکن مجھ پر رحم کر اور مجھے معاف کر دے۔"

راجا کے ان الفاظ سے راکھشس (بھوت) کی تسلی ہو گئی اور اُس نے دل میں سوچا "کوئی حرج نہیں" اور پھر زور سے بولا "میں تیرے اس جرم کو چند شرطوں پر معاف کر سکتا ہوں۔ شرطیں یہ ہیں آج سے ٹھیک ساتویں دن تو خود اپنے ہاتھ سے ایک ایسے سات سالہ بچے کی قربانی دے گا۔ جو برہمن ہو اور وہ خود تیری جگہ قربانی کے لئے پیش کر دے مگر خیال رہے کہ وہ بچہ عمدہ کردار کا مالک اور مضبوط قوتِ فیصلہ کا حامل ہو اور قربانی کے وقت خود اس کے ماں باپ اس کے ہاتھ پاؤں پکڑ کر اسے زمین پر لٹائیں۔ اور اس وقت تک اُسے پکڑے رہیں جب تک کہ قربانی مکمل نہ ہو جائے۔ اگر یہ شرائط پوری نہ ہوئیں تو میں پلک جھپکتے میں تجھے اور جو کچھ تیرے پاس ہے سب کو بھسم کر دوں گا۔"

خوف سے لرزتے ہوئے راجا نے ان تمام شرائط کو پورا کرنے پر آمادگی ظاہر کی اور راکھشس (بھوت) فوراً غائب ہو گیا۔ ملول اور افسردہ راجا نے اپنی حسین رانی کو گھوڑے پر سوار کیا اور اپنے ساتھیوں کی تلاش میں چل پڑا

"او ہو" اُس نے سوچا "میں بھی کتنا احمق ہوں کہ شکار جیسے فضول شوق میں ایک ایسا خطرہ مول لے لیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بندر کی طرح مجھے بھی اپنی زندگی سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔ ایسا بچہ جو ان تمام شرائط پر پورا اترتا ہو مجھے کہاں سے مل سکتا ہے۔ آونہہ" اس نے سر کو جھٹک دیا اور خود سے کہا "پہلے تو شہر چلنا چاہیئے اور اس کے بعد آنے والے واقعات کا انتظار کرنا چاہیئے"

ایسے ہی خیالات میں راجا اپنے ساتھیوں سے جا ملا اور پھر یہ سب لوگ شہر آ گئے جہاں راجا کے اعزاز میں شاندار دعوت دی گئی اور اُس کی شادی کا جشن منایا گیا۔ راجا کے اندرونی غم سے رانی کے سوا کوئی واقف نہ تھا۔ اور نہ راجا نے کسی پر اس کا اظہار کیا۔

جشن کے دوسرے دن راجا نے اپنے وزیر مشیروں کا ایک خاص اجلاس طلب کیا اور تمام واقعہ بلا کم و کاست ان کو سنا کر مشورہ طلب کیا۔ ان میں سے ایک وزیر جو بہت بوڑھا، تجربے کار اور با تدبیر تھا۔ اُس نے اس کام کو اپنے ذمے لے کر راجا کو اطمینان اور سکون سے رہنے کی خوش خبری دی۔ اس وزیر نے فوراً ہی سونے کا ایک ٹھوس قیمتی بُت بنوایا جو ایک سات سالہ خوبصورت سے بچے کا تھا اور پھر اس پر موتیوں اور قیمتی پتھروں کی مالائیں ڈال دیں اور حکم دیا کہ اُسے ایک گاڑی میں رکھ کر تمام شہر میں گھمایا جائے اور اعلان کیا جائے کہ اگر کوئی سات سالہ برہمن بچہ ملک اور قوم کی خوشیوں پر خود کو ایک راکھشس (بھوت) پر قربان کرنے پر تیار ہو جائے اور اس کے والدین اس کی قربانی کے لئے اس کے ہاتھ پیر پکڑے رہنے پر آمادہ ہوں اور اُس کے فیصلے کی توثیق کریں تو راجا اس بچے کے والدین کو سونے کا یہ بُت جس میں قیمتی موتی جڑے ہوئے ہیں، اور جس کے گلے میں قیمتی مالائیں پڑی ہوئی ہیں بچے کی زندگی کے عوض یہ ساری چیزیں بڑے عزت و احترام کے ساتھ نذرانے کے طور پر پیش کرے گا۔"

برہمنوں کی کسی آبادی میں ایک سات سالہ بچے نے جو بہت خوبصورت اور نیک سیرت تھا۔ یہ اعلان سنا۔ اتفاق کی بات کہ انسانی خدمت اور نیکی کے جذبات اُس کی رگ رگ میں سرایت کئے ہوئے تھے۔ یہ لڑکا راجا کے کارندوں کے پاس پہنچا اور کہنے لگا۔

"تم لوگ یہیں ٹھہرو۔ میں اپنے ماتا پتا سے اجازت حاصل کر کے ابھی آتا ہوں۔ میں قربانی دینے کو تیار ہوں۔"

اعلان کرنے والے کارندے خوش ہو گئے اور انہوں نے بچے کو اپنے ماتا پتا سے اجازت لے کر آنے کی اجازت دے دی۔

بچہ گھر گیا اور ماں باپ کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا "میرے پیارے ماتا پتا! میں اپنے اس فانی جسم کو انسانی خوشحالی پر قربان کرنا چاہتا ہوں مجھے اجازت دیں تاکہ آپ کے بھی دن پھر جائیں اور راجا سے میرے ہی جتنا سونے کا بُت حاصل کر کے بقیہ زندگی خوش و خرم بسر کریں۔ پھر آپ جب خوش حال ہو جائیں گے تو بھگوان آپ کو میرے جیسے بہت سے بیٹے دے گا۔"

ماں باپ کو بیٹے کی اس جرأت پر بہت غصہ آیا اور کہنے لگے "لڑکے تیرے حواس تو بجا ہیں؟ بھلا کوئی والدین دولت کے لئے اپنے بچوں کو بھی قربان کیا کرتے ہیں؟ تو یہ کیا کہہ رہا ہے؟ کہیں کسی بھوت پریت کا سایہ تو تجھ پر نہیں پڑ گیا؟"

لڑکے نے جواب دیا "آپ میری بات سمجھنے کی کوشش کریں دیکھیئے یہ فانی جسم۔ گوشت اور خون کا یہ لوتھڑا ایک دن راکھ ہو جائے گا یا کچھ دن بعد ہو فرق صرف اتنا ہے کہ اگر اس وقت یہ جسم فنا ہو جائے تو اس سے ایک طرف تو میں اپنے ملک اور انسانیت کے لئے ایک قربانی دوں گا اور دوسری طرف آپ کے برُے دن دور ہو جائیں گے اور آپ خوشحال ہو جائیں گے۔ ورنہ دوسری صورت میں میری موت بھی دوسرے عام آدمیوں کی سی موت ہو گی جس سے سوائے اس کے کہ آپ میرے جسم کو آگ کے سپُرد کر دیں۔ اور کچھ حاصِل نہ ہو گا تو آپ ہی بتائیں کہ کیوں نہ وہ کام کروں جس میں سب کا بھلا ہو۔ ان الفاظ سے مضبوط قوتِ ارادی کے مالک لڑکے نے اپنے والدین کو رام کر لیا اور ان سے اجازت حاصل کر لی۔

وہ راجا کے کارندوں کے پاس اور ان سے سونے کا بُت لے کر اپنے والدین کے پاس آگیا۔ راجا نے انہیں سو مزید گاؤں بھی انعام میں عطا کئے۔ اور پھر وہ لڑکا اپنے والدین کے ساتھ کارندوں کی ہمراہی میں راجا سے ملنے کے لئے ستراکوٹ کی طرف چلدیا۔ راجا بچے کو دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ راجا نے بچے کے گلے میں ہار ڈالے نئے کپڑے پہنائے اور ایک ہاتھی پر سوار کر کے اس کے والدین کے ساتھ اسی درخت کی جانب چلا جہاں راکھشس رہتا تھا۔ راجا کے درباری سادھو نے درخت کے نیچے ایک حلقہ کھینچ دیا۔ آگ جلائی اور ضروری رسوم انجام دیں اور پھر قہقہہ لگاتا ہوا راکھشس آن موجود ہوا۔ وہ وید کے اشلوک پڑھ رہا تھا وہ اس وقت بھی خون پی رہا تھا۔ وہ ناچتے ہوئے قہقہے لگا رہا تھا اور اشلوک پڑھ رہا تھا۔ اس کی سُرخ سُرخ آنکھیں اور سیاہ وجود موقع پر موجود تمام لوگوں کو لرزائے دے رہے تھے۔ راکھشس جیسے ہی ان لوگوں کے سامنے آیا راجا گھٹنوں کے بل اس کے سامنے جُھک گیا "مقدس ہستی میں تیرے لئے انسانی شکار لے آیا ہوں، آج ساتواں دن ہے۔ میرے اوپر رحم کر، اور یہ قربانی قبول فرما۔"

راکھشس نے اپنی سُرخ سُرخ آنکھیں گھما کر برہمن لڑکے کو دیکھا اور زبان سے ہونٹوں پر لگے ہوئے خون کے قطروں کو چاٹا ادھر بچہ دل ہی دل میں بہت خوش تھا اور کہہ رہا تھا "میری یہ قربانی دوسرے جہان میں چاہے مجھے جنّت میں لے جائے یا جہنم میں، جہاں دوسروں کی مدد کا کوئی تصور ہی نہیں لیکن میری تمام تر تمنا یہ ہے کہ بھگوان مجھے ہر جنم میں اس قابل رکھیں کہ میں دوسرو[ں] کی خوشیوں کے لئے خود کو قربان کرتا رہوں۔" جیسے ہی یہ خیال لڑکے کے ذہن میں آیا ــــ اچانک آسمان چاروں طرف فرشتوں سے بھر گیا ــ جو اس پر عقیدت کے پھول برسا رہے تھے

پھر اس کا جسم راکھشس کے سامنے لایا گیا۔ ماں باپ بچے ک[ے] ہاتھ پاؤں پکڑے ہوئے تھے۔ اور جب راجا نے اُسے ذبح کرنے کے لئے تلوار اٹھائی تو بچہ ہنسنے لگا اور تمام موجود لوگ یہاں تک کہ خود راکھشس بھی یہ سوچ کر کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔ سب فوراً ہ[ی] رک گئے اور بچے کے سامنے جھک گئے۔ ہاتھ باندھ کر منہ کے بل سجدے میں گر گئے۔

اس دلچسپ اور سبق آموز کہانی کو ختم کرنے کے بعد روح[ِ] تری وکرم سین سے مخاطب ہوئی۔ "بتا راجا، ایسے خوفناک حالا[ت] میں وہ لڑکا کیوں ہنسا؟ یہ سوال مجھے پریشان کر رہا ہے۔ مگر یاد ر[کھ] کہ اگر تو جواب سے واقف ہے اور بتانے سے گریز کر رہا ہے تو تیر[ا] سر پاش پاش ہو جائے گا۔

"دوسن میں تجھے بچے کے ہنسنے کی وجہ بتاتا ہوں۔ یہ فطر[ی] اصول ہے کہ ایک کمزور سا وجود جب کسی خطرے کو محسوس کرتا ہے [تو] فوراً ماں باپ کو پکارتا ہے۔ اگر ماں باپ مر چکے ہوتے ہیں تو را[جا] کو یاد کرتا ہے جو اس کا سرپرست ہوتا ہے اور اگر راجا بھی نہیں [تو] تو وہ پھر کسی دیوی یا دیوتا کی مدد چاہتا ہے لیکن اگر یہ تمام ہستیاں [جو] اس کی مدد کر سکتی تھیں اور جو اس کے سامنے موجود تو تھیں لیکن قطعی مختلف رولوں میں۔ مثلاً اس کے والدین اُسے ذبح کرانے کے ل[ئے] اس کے ہاتھ اور پیر پکڑے ہوئے تھے تاکہ انہیں دولت مل سکے راجا اُسے ذبح کرنا چاہتا تھا تاکہ خود کو بچا سکے۔ پھر دیوی یا دیو[تا] کی مورتی خود راکھشس تھا جو بچے کی ہلاکت سے اپنا مقصد پورا کر[نا] چاہتا تھا۔ اب تم اسی سے اندازہ لگا لو کہ انسان اس بے قیمت جس[م] سے فانی گوشت پوست کے جسم کے ہاتھوں کس قدر دھوکا کھا[تا] ہے کہ انسانیت کو اس نے بالائے طاق رکھ دیا ہے اور ہوس کا بن کر کتنے غم اور دُکھ اس نے اپنے پیچھے لگا لئے ہیں چنانچہ بچے نے سوچا کہ سے برہما، اندر، وشنو اور شیو جیسی ہستیاں گزر گئیں تو خود ا[س]

اپنا وجود کیا اہمیت رکھتا ہے اور پھر یہ کہ ان ہستیوں کو دوسرے جہاں میں ابدی زندگی ملی۔ نیز یہ کہ اس کی اپنی زندگی کے مقاصد پورے ہو رہے تھے اور انسانی خدمت کے لئے وہ جان دے رہا تھا۔ دنیا کی بے ثباتی، اپنوں کی بے رخی اور مسرت جو اس نے اپنے وجود میں محسوس کی۔ اس کے زیر اثر بچہ ہنس پڑا تھا۔" جب راجا اپنی بات پوری کر چکا تو بدروح ایک بار پھر اس کے کاندھے پر سے اتر کر غائب ہو گئی۔ ناچار ایک بار پھر راجا کو شیشم کے درخت تلے جانا پڑا لاش پھر حسب سابق درخت سے لٹکی ہوئی تھی۔ راجا نے اُسے اتارا اور کندھے پر لاد کر پھر اپنی منزل کی جانب روانہ ہوا۔ سچ ہے کہ جن انسانوں کے دل ناقابلِ تسخیر اور ارادے چٹانوں کی مانند اٹل ہوتے ہیں۔ وہ عظیم ہوتے ہیں۔ جب یہ اولوالعزم راجا لاش کو لے کر جا رہا تھا۔ تو راستے میں۔ روح نے پھر اُسے ایک کہانی سنائی۔



بیوقوفی:

کسی زمانے میں ہندوستان کے دھرنی والا نامی شہر پر ایک راجا کی حکومت تھی۔ اس کی سلطنت میں برہمن کثرت سے تھے اور برہمن تھلا نامی آبادی میں ایک برہمن رہا کرتا تھا۔ جس کا نام وشنو سوامی تھا۔ اس کی بیوی خوبصورت ہونے کے ساتھ ساتھ خوب سیرت بھی تھی۔ اُن کے چار بیٹے تھے۔ جب ان چاروں نے وید کا علم سیکھ لیا اور بڑے ہو گئے تو ان کے ماں باپ سورگ باش ہو گئے۔ یہ چاروں اپنے ماں باپ کے مرجانے سے بڑی ناگوار صورتحال سے دوچار ہو گئے۔ کیونکہ رشتے داروں نے ان کے ماں باپ کی چھوڑی ہوئی تمام جائیداد اور دولت پر قبضہ کر لیا تھا۔ ایک دن انہوں نے آپس میں مشورہ کر کے بیٹھے کیا کہ اب اس ملک میں ان کے لئے کوئی کشش باقی نہیں رہ گئی ہے۔ بہتر ہے نانا کے پاس چلے جائیں ـــــ اور پھر یہ مانگتے کھاتے اپنے نانا کے گھر کی طرف چل دیئے۔ راستے کی تمام مشکلات اور دشواریوں کو برداشت کرتے ہوئے جب یہ اپنے نانا کے پاس پہنچے تو معلوم ہوا کہ ان کے نانا کا بھی انتقال ہو چکا ہے۔ یہاں ان کی ملاقات اپنے ماموں زاد بھائیوں سے ہوئی۔ ان چاروں نے انہی کے پاس رہائش اختیار کر لی۔ لیکن جلد ہی انہیں احساس ہو گیا کہ ان کے ماموں زاد بھائی ان کے رہنے سہنے اور کھلانے پلانے پر خوش نہیں۔ یہ تحقیر آمیز سلوک ان چاروں بھائیوں کو بڑا ناگوار گزرا اور آخر کار ایک دن انہوں نے خاموشی سے ایک دوسری جگہ آپس میں مشورہ کیا کہ اس ناگوار صورت حال سے کس طرح نمٹا جائے؟

سب سے بڑے بھائی نے کہا "عزیزو! آدمی قسمت کے آگے مجبور ہے۔ ایک بدقسمت انسان کیا کر سکتا ہے۔ مثال کے طور پر میں تمہیں اپنا آج کا تجربہ سناتا ہوں۔ میں آج بلا مقصد ادھر اُدھر رہا تھا کہ میرا گزر شمشان بھومی سے ہوا۔ میں نے وہاں ایک لاش دیکھی جو پوری طرح سڑ چکی تھی۔ میں نے اس لاش کو دیکھ کر سوچا کہ یہ شخص کتنا خوش قسمت ہے جس کے سر سے غموں کا بوجھ اتر چکا ہے اور اب یہ آرام کر رہا ہے۔ اس خیال کے آتے ہی میں نے فیصلہ کیا کہ مجھے اپنی زندگی کو ختم کر لینا چاہیئے۔ میں نے ایک درخت میں رسی باندھ کر اپنے آپ کو پھانسی دے دی۔ میں تقریباً بے ہوش ہو گیا تھا۔ اور قریب تھا کہ میرا جسم روح سے آزاد ہو جاتے۔ میں نے محسوس کیا کہ پھندا ایک دم سے کٹا اور میں زمین پر آ گرا۔ جب میرے ذرا ہوش بجا ہوئے تو میں نے ایک شفیق اور ضعیف چہرے کو اپنے اوپر جھکے ہوئے پایا۔ یہ شخص اپنی قمیص کے دامن سے مجھے ہوا دے کر ہوش میں لانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"میرے دوست!" اس نے کہا "ذرا مجھے یہ تو بتاؤ کہ وہ کیا وجہ ہے جس نے تم جیسے پڑھے لکھے آدمی پر اس درجہ مایوسی اور ناامیدی کو غالب کر دیا ہے کہ تم خودکشی جیسے مہاپاپ پر مائل ہو

گئے ہو۔ تم یہ کیوں بھول گئے کہ خوش قسمتی نیک اعمال کے بدلے
اور بد قسمتی بداعمالی کے سبب انسان کو ملتی ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں
کہ تمہارے چہرے پر تلخی کے آثار ہیں۔ تم زندگی سے خوش نہیں ہو لیکن
میری ہدایت صرف یہ ہے کہ جاؤ اور نیک کام کرو۔ بھگوان تمہارا بھلا
کرے گا۔ کیا تم جہنم کا عذاب پسند کرو گے؟ اگر تم ہاں کہو گے تو
میں تمہیں خودکشی سے نہیں روکوں گا۔ ضرور کرو۔ مگر یاد رکھو زندگی
کے تلخ حقائق سے منہ موڑ کر نامردوں کی طرح بھاگنا بھگوان کو
پسند نہیں۔"

"جب میری حالت قدرے درست ہو گئی تو وہ شخص میرے
پاس سے اُٹھ کر چلا گیا اور مجھے خودکشی کے تمام ارادوں کو ذہن سے
یکسر نکال دینا پڑا۔ اب میں اس بات کا قائل ہو گیا تھا کہ اگر قسمت
میں نہ ہو تو انسان خودکشی بھی نہیں کر سکتا۔ چنانچہ میں گھر چلا آیا اور
اب میرا ارادہ ہے کہ کسی مقدس جگہ پر جا کر خود کو قربان کر ڈالوں۔ اس سے
اور کچھ نہیں تو کم از کم افلاس سے تو نجات مل ہی جائے گی۔"

چھوٹے بھائی نے کہا۔ "مگر بھائی! میں آپ سے متفق نہیں ہوں
کیونکہ یہ کبھی ہو ہی نہیں سکتا کہ ایک شخص ذہین بھی ہو اور مفلس بھی
کیا آپ کو نہیں معلوم کہ ذہانت بجائے خود ایک بہت بڑی دولت
ہے ـــــ اور کیا آپ نہیں جانتے کہ اس دنیا میں ساری دولت
موسم خزاں کے آنے جانے والے بادلوں کی مانند ہے۔ دنیوی خوش قسمتی
ایک ایسی بیوی کی طرح ہے جو آپ سے مستقلاً محبت نہیں کر سکتی یہ
ایک بے وفا دوست ہوتی ہے۔ بالکل ہرجائی محبوب کی طرح جسے
آپ حاصل کر کے کچھ دیر تو اپنے پاس رکھ سکتے ہیں لیکن مستقلاً نہیں
ایک ذہین اور طباع شخص کسی خاص علم میں کمال پیدا کر کے اس کی
مدد سے اس ہرجائی محبوب یا دولت کو حاصل کر سکتا ہے۔"

چھوٹے بھائی کے ان الفاظ نے بڑے بھائی کو سہارا دیا وہ
چونک پڑا۔ "اچھا تو ہمیں کس قسم کے علم پر عبور حاصل کرنا چاہیئے؟"
اُس نے پوچھا۔

اب وہ سب اس نکتے پر غور کرنے لگے اور کچھ دیر بعد ایک
دوسرے سے کہنے لگے "بہتر یہ ہے کہ ہم سیاحت کے لئے نکل جائیں
اور روئے زمین پر جو علم سب سے زیادہ دلچسپ اور مفید ثابت
ہو اُس کو سیکھیں۔"

اب ایک خاص مقام مقرر کیا گیا کہ چاروں بھائی علم سیکھ کر
فلاں جگہ جمع ہوں گے۔ اور اپنے اپنے علم کے استعمال کی تدبیر
سوچیں گے۔

وہ چلے گئے۔ وقت گزرتا گیا اور آخرکار مدتوں بعد ایک
دن وہ چاروں مقررہ جگہ پر جمع ہو گئے اور ایک دوسرے سے
اس کے سیکھے ہوئے علم کے بارے میں سوالات کرنے لگے۔

ایک نے کہا "میں نے جو علم سیکھا ہے وہ بہت ہی عظیم ہے
اگر مجھے کسی جانور کی کوئی ہڈی مل جائے تو میں اپنے علم کے زور
سے اس ہڈی کا گوشت اُسے واپس دلا سکتا ہوں۔"

دوسرے نے کہا "میں ایک ایسے جانور کے جسم پر جس
کی ہڈیاں اور گوشت موجود ہوں، اپنے سیکھے ہوئے علم کی بدولت
اس کی کھال اور بال دوبارہ اُگا سکتا ہوں۔"

تیسرے نے کہا "اگر مجھے گوشت ہڈیاں کھال اور بال
دے دیئے جائیں تو میں اپنے علم کے ذریعے جاندار کے اعضا پیدا
کر سکتا ہوں۔"

"اور میں" چوتھے نے کہا "اپنے علم کی مدد سے ایسے کسی
بھی جسم کو جس پر گوشت پوست اور اعضا موجود ہوں۔ زندہ کر
سکتا ہوں۔"

"بہت خوب، تب پھر چل کر اپنے اپنے علوم کو آزمائیں"
ایک نے کہا اور چاروں جنگل کی طرف چل پڑے۔ اب انہیں ہڈیوں
کی تلاش تھی۔ قسمت کے ماروں کو ہڈیاں بھی ملیں تو وہ شیر کی تھیں
لیکن یہ لوگ اس حقیقت سے بے خبر تھے کہ ان کے ہاتھ میں شیر
کی ہڈیاں ہیں۔ بس پھر ایک نے ہڈی پر گوشت پیدا کیا دوسرے نے
کھال اور بال، تیسرے نے اعضا اور تب انہیں معلوم ہوا کہ شیر
ان کے سامنے ہے۔ چنانچہ نتائج سے بے خبر چوتھے نے اس میں
زندگی کی رُوح پھونک دی۔ شیر اینڈتا ہوا بیدار ہوا۔ بھوکا تھا اس
لئے چاروں کو چٹ کر گیا اور بڑے مطمئن انداز میں جنگل میں
غائب ہو گیا۔

اور اس طرح یہ چاروں نوجوان موت کی نیند جا سوئے
غربت سے انہیں نجات مل گئی اب کوئی ان سے نفرت کرنے والا نہ
تھا۔ ان کی معصومیت اور سادہ لوحی کہ ان کا اپنا ہی پیدا کیا ہوا شیر انہیں

ہضم کر گیا تھا۔ یہاں پر یہ حقیقت بھی کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ علم کے ساتھ ساتھ اس کے برتنے کا سلیقہ بھی آنا چاہیئے۔ اور پھر یہ کہ یہ کوئی لازمی بات نہیں کہ ایک علم یا ایک خاص ایجاد جو کوئی شخص حاصل کرتا ہے۔ اس کی اپنی ذات کے لئے بھی سود مند ثابت ہو کیونکہ اگر قسمت یاوری نہ کرے تو اس کا یہی علم یا یہی ایجاد جس کے حصول کے لئے دُنیا کے تمام انسان رشک کر سکتے ہیں ممکن ہے اس کے اپنے لئے پیغامِ اجل ثابت ہو جائے۔ صرف اس صورت میں کہ اگر اس علم کے درخت کی جڑیں مضبوط ہوں اور اس کی آبیاری ذہانت سے کی گئی ہو۔ مفادات کی ہواؤں سے اس درخت کو بچایا گیا ہو تو اس کا درخت بار آور ثابت ہو سکتا ہے اور اس کا لگانے والا اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔"

"اے مستقل مزاج، بہادر اور طباع راجا۔ اب بتا کہ ان چاروں بھائیوں میں سے کون سا بھائی شیر کی پیدائش اور اپنی اور اپنے باقی تین بھائیوں کی موت کا سبب بنا لیکن یاد رکھ اگر تو جواب سے واقف ہے اور بتانے سے گریز کرتا ہے تو تیرا سر پاش پاش ہو جائے گا۔"

راجا نے سوچا۔ اگر میں نے اپنی خاموشی کو توڑا تو یہ روح پھر غائب ہو جائے گی اور لاش کو پھر سے درخت پر سے اُتار کر لانا پڑے گا۔ ہونہہ، کوئی بات نہیں میں پھر لاش کو درخت پر سے اُتار لاؤں گا۔

پھر اس نے روح سے کہا "اس تمام تباہی کا ذمہ دار صرف وہ نوجوان ہے جس نے شیر کو زندگی دی تھی۔ باقی تینوں نوجوان معصوم تھے۔ انہوں نے اپنے اپنے علم کے زور سے جب شیر کی ہڈی پر کام شروع کیا تو وہ اس سے ناواقف تھے کہ یہ ہڈی کس کی ہے؟ لیکن آخری نوجوان کے سامنے شیر اپنی پوری قدرتی شکل اور اعضا کے ساتھ موجود ہو گیا تھا۔ اب عقل مندی کا تقاضا تو یہ تھا کہ وہ اسے زندگی نہ دیتا لیکن صرف اپنے علم کا زور دکھانے کے لئے اس نے شیر کو زندگی دے دی جو چاروں کی ہلاکت کا نتیجہ ثابت ہوئی۔ پس ثابت ہوا کہ وہی نوجوان برہمنوں کی ہلاکت کا ذمہ دار اور مجرم ہے۔"

راجا کا جواب سُن کر ایک بار پھر وہ روح اس کے کندھے پر غائب ہو گئی۔ مہاراجا تری وکرم سین کو پھر درخت تک جانا اور لاش کو اتار کر لانا پڑا۔ راستے میں پھر اس بھوتنی روح نے راجا کو یہ کہانی سنائی۔



اعادۂ شباب

"ہندوستان کی مشہور راجدھانی میں کسی زمانے میں شوبھاوتی نام کا ایک شہر آباد تھا۔ اس شہر میں بے شمار علماء و فضلاء اور شرفاء رہتے تھے۔ جس طرح دوسرے جہان میں اندر کی قلمرو میں صرف عالم فاضل اور شریف لوگ ہی رہتے ہیں۔ یہاں کا حکمراں پرادیومنا تھا جو طاقت، عظمت اور جاہ وجلال کے اعتبار سے قدیم راجا پرادیومنا سے کسی طرح بھی کم نہ تھا۔ جس کے کارناموں سے تاریخیں بھری پڑی ہیں۔ اس کی سلطنت میں بدقسمتی کا نام ونشان تک نہ تھا۔ ٹیڑھا یا ترچھا پن صرف کمانوں میں دکھائی دیتا تھا۔ تیزی اور طراری صرف حاضر جوابی اور با تدبیری میں پائی جاتی تھی۔

اس شہر کے اطراف میں راجا نے زمین کا ایک قطعہ برہمنوں کے لئے وقف کر دیا تھا جہاں یہ بہت بڑی تعداد میں آباد تھے اس قطعۂ آبادی کو یجنا ستھلا کہتے تھے۔ اس بستی میں وید کا ایک بہت بڑا عالم رہتا تھا جس کا نام یجنا سوما تھا اس کی امارت کا عالم یہ تھا کہ دیوتا اس کے مہمان ہوا کرتے تھے اور وہ ان پر خوب بھینٹیں چڑھاتا تھا۔ اس برہمن کو بھگوان نے بڑی دعاؤں کے بعد ایک بیٹا دیا "ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات" کے مصداق یہ لڑکا دیوتا سمان تھا

ہی سے علم کی جانب توجہ دی۔ اور جب وُہ سولہ سال کا ہوا تو عادات و اطوار، سیرت اور علم کے معاملے میں اس نوجوان نے سب کو پیچھے چھوڑ دیا۔ لیکن اچانک اُسے بخار نے آلیا۔ ماں باپ نے اس قدر جانفشانی کے ساتھ بیٹے کی تیمارداری کی کہ مثال بن گئی اور جب وہ مرگیا تو کافی عرصے تک دونوں اس کی لاش کو مسالہ لگا کر سینے سے لگائے رہے اور مرگھٹ بھیجنے پر تیار نہ ہوئے۔

"برہمن! تعجب ہے کہ تم جیسا آدمی جو دنیا کے نشیب و فراز سے اچھی طرح واقف ہے اور وید کے علوم پر بے مثل عبور رکھتا ہے۔ ایسی حرکت کر رہا ہے۔ تمہیں نہیں معلوم کہ یہ زندگی کس قدر ناپائیدار اور بے وفا ہے۔ یہ دُنیا سراب کی طرح ہے اور زندگی سطح آب کے بلبلے سے زیادہ دیرپا نہیں ہے۔ بڑے بڑے جلیل القدر اور باجبروت راجا جن کی سیناؤں سے کبھی دھرتی کا کلیجہ کانپتا تھا اور جن کی خدمت میں بے شمار حسین اور نوخیز دوشیزائیں داسیوں کی طرح لگی رہتی تھیں۔ جن کے جسم ہمیشہ مشک و عنبر کی خوشبوؤں سے مہکتے تھے جو ہمہ وقت محلوں میں خوبصورت جڑاؤ کے بستروں پر پڑے ہوئے مدھم سریلی دھنوں سے جی بہلایا کرتے تھے۔ وہ سب ایک ایک کر کے شمشان بھومی لائے گئے اور چِتا میں جلا دیئے گئے۔ اگر انہیں سُرخ سُرخ زبانیں لپکاتے ہوئے شعلوں کے حوالے نہ کیا گیا ہوتا۔ تو وہ گیدڑوں کی خوراک بنتے اور وقت نے ان کے جسموں کو خاک میں ملا دیا ہوتا۔ آج ہم ان کے لئے بھی آنسو کا کوئی قطرہ نہیں بہاتے تو دوسروں کا کہنا ہی کیا۔ بھلا موت پر کسی کا کیا زور۔ اب تو ہی بتا اے عقلمند عالم آخر اس لاش کو سینے سے چمٹائے پھرنے سے کیا حاصل؟"

بستی کے لوگوں نے اس انداز میں بیجنا سوما کو سمجھا بجھا کر لاش کو مرگھٹ پہنچانے پر مجبور کیا۔ بڑی ردو قدح کے بعد وہ اپنے بیٹے کی لاش لوگوں کے حوالے کرنے پر رضامند ہوا۔ مذہبی رسوم ادا کی گئیں اور لاش کو ایک چارپائی پر رکھ کر لوگ مرگھٹ کی جانب لے کر چلے ایک جم غفیر تھا جو لاش کے پیچھے روتا، پچھاڑیں کھاتا چل رہا تھا۔ مرگھٹ میں ایک یوگی سادھو جو شِو کے پجاری طبقے مہاپاسوتپا سے تھا۔ ایک چھوٹی سی کھوہ میں اپنے ایک چیلے کے ساتھ رہا کرتا

لاغری کے اس درجے کو پہنچ گیا تھا کہ اس کے جسم کی وریدیں تاروں کی مانند جسم میں پھیلی ہوئی تھیں جن سے جسم جڑا ہوا تھا اگر ایسا نہ ہوتا تو اس کے جسم کا ایک ایک حصہ الگ ہو کر گر پڑتا۔ اس کا نام راماشو تھا۔ اس کے جسم پر چھوٹے چھوٹے سے بال تھے جو راکھ سے اَٹے ہوئے تھے۔ اس کے سر کے سنہرے بال ایک تاج کی مانند جوڑے میں بندھے رہا کرتے تھے۔ وُہ عظیم دیوتا شو کا مہا پجاری تھا۔ اس کا شاگرد بڑا ہی بیوقوف اور شیطان صفت لڑکا تھا جو مانگ تانگ کر گزارا کرتا تھا

سادھو نے لوگوں کے رونے دھونے کی آواز سنی تو اپنے شاگرد سے کہا "جا اور جا کر دیکھ کہ یہ غیر معمولی ماتم کی آواز کہاں سے آرہی ہے۔ جا اور جلد واپس آ۔"

"ہونہہ، میں کیوں جاؤں؟ میرا مانگنے کا وقت جا رہا ہے جاؤ اور خود معلوم کرو۔" منہ پھٹ اور گستاخ شاگرد نے جواب دیا۔

"لعنت ہو تم پر۔ پیٹ کے پجاری۔ ابھی صبح بھی ٹھیک سے نہیں ہوئی۔ یہ تمہاری روزی کا کون سا وقت ہے؟" سادھو نے کہا۔

"لعنت ہو تم پر بڈھے، ہڈیوں کے پنجر، کھوسٹ۔ نہ میں تمہارا شاگرد نہ تم میرے استاد۔ میں جا رہا ہوں۔ اپنا تام جھام سنبھالو۔" یہ کہہ کر لڑکا اٹھا اور باہر نکل گیا۔

سادھو مسکراتا ہوا اٹھا اور باہر آگیا۔ برہمن لڑکے کا جنازہ چِتا کی جانب لے جایا جا رہا تھا۔ نوجوان کی لاش دیکھ کر برہمن کی رال ٹپک پڑی۔ وہ اپنے موجودہ جسمانی غلاف سے اکتا چکا تھا اور اب اسے بدلنا چاہتا تھا۔ چنانچہ اُس نے کھڑے کھڑے فیصلہ کیا کہ وُہ برہمن لڑکے کے جسم میں حلول کرلے گا۔ فوراً ہی ایک ویران گوشے میں چلا گیا اور پوری آواز سے چلّانے اور رونے لگا اور پھر ٹھمک ٹھمک کر ناچنا شروع کر دیا اور یوگا کے جادو کے ذریعے برہمن نے اپنی رُوح کو جسم کے لباس سے آزاد کیا اور فوراً ہی برہمن لڑکے کے نوجوان جسم میں داخل ہو گیا۔ سوکھی لکڑیوں پر رکھی ہوئی لڑکے کی لاش میں حرکت پیدا ہوئی۔ لڑکے نے آنکھیں کھول دیں اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ جب لڑکے کے رشتہ داروں نے اُسے زندہ ہوتے دیکھا تو مسرت و انبساط کے نعرے بے اختیار ان کے ہونٹوں سے نکل گئے

وہ چیخے:

مہا پجاری نے لوگوں کو حقیقت سے آگاہ نہیں کیا بلکہ کہنے لگا "میں ابھی ابھی دوسری دنیا سے واپس آرہا ہوں۔ دیوتا شو نے ذاتی طور پر اپنے حکم سے مجھے یہ زندگی دی ہے اور حکم دیا کہ میں مہا پاسو تپا طریقے سے اپنا ناتا جوڑ کر گیان دھیان میں جیون گزار دوں۔ چنانچہ میں فوراً ہی دُنیا کو تج کر جنگلوں میں چلا جانا چاہتا ہوں ورنہ میری زندگی پھر مجھ سے چھین لی جائے گی۔ لٰہذا مجھے میرے حال پر چھوڑ دو تاکہ میں اپنا فرض بجالاؤں۔"

لوگوں کو جب یہ بات معلوم ہوئی تو غم اور خوشی کے ملے جلے جذبات کے ساتھ واپس چلے گئے۔ اس کے بعد یہ یوگی جس نے دوسری مرتبہ شباب حاصل کر لیا تھا۔ اپنا پرانا جسم ایک گڑھے میں دبا کر کسی دوسرے علاقے میں چلا گیا۔"

کہانی سنا چکنے کے بعد روح نے راجا سے پھر سوال کیا "بتا اے راجا کہ یوگی لڑکے کے جسم میں داخل ہونے سے پہلے چلّایا اور رو دیا کیوں اور بعد میں ناچا کیوں۔ مگر یاد رکھ اگر تو جواب سے واقف ہے اور تو بتانے سے گریز کرتا ہے تو تیرا سر پاش پاش ہو جائے گا۔"

راجا نے جواب دیا "سُن۔ بوڑھے پجاری کے ذہن میں جو خیال تھا وہ یہ تھا 'اب میں اپنے اس جسم کو خیرباد کہہ رہا ہوں جس کی پرورش میرے ماتا پتا نے کی تھی۔ جس کی رفاقت میں میں نے بچپن گزارا، جوانی گزاری۔ یہاں تک کہ بوڑھا ہو گیا اور جس کی مدد سے میں نے یوگا سیکھا۔ اسی غم میں وہ رونے لگا۔ کیونکہ ہر شخص کو اپنے جسم سے بے پناہ محبّت ہوتی ہے۔' اس کے بعد وہ ناچنے لگا۔ وہ سوچ رہا تھا۔ میں ایک نئے جسم میں داخل ہو کر نئی شکتی حاصل کرنے جا رہا ہوں۔ جس کے بعد میں اس سے بھی طاقتور یوگا سیکھ سکوں گا۔ ظاہر ہے کہ نوجوانی کی تمنّا ہر شخص کو ہوتی ہے نوجوانی کے حصول کا خیال ہی اس کے لئے حیات آفریں تھا۔ وہ اپنے پرانے جسم کو کھونے اور نئے جسم کو پانے کی خوشی اور غم کی مختلف اور متضاد کیفیتوں میں مبتلا تھا۔"

راجا کا یہ جواب سن کر ایک بار پھر روح اس کے کندھے پر سے غائب ہو گئی اور اسے پھر ایک مرتبہ درخت تک جا کر لاش کو واپس

سنائی۔



آخری کہانی

کسی زمانے میں جنوبی ہند پر ایک گورنر کی حکومت تھی یہ شخص انصاف پسند حکمرانوں کی فہرست میں سرِفہرست تھا۔ اس کے بہت سے رشتے دار بھی تھے اس کا نام دھرم تھا اس کی بیوی مالوے کی رہنے والی تھی یہ عورت بھی اپنے خاوند کی طرح حسین عورتوں میں اپنا جواب آپ تھی۔ اس کا نام چندراوتی تھا اور اس عورت سے دھرم کی صرف ایک بیٹی تھی جس کا نام لونیاوتی تھا۔ یہ لڑکی حسن و جمال میں یکتائے روزگار تھی۔ جب اس لڑکی نے جوانی کی حدود میں قدم رکھا تو گورنر کو سازشی عناصر نے معزول کر دیا اور اس طرح گورنر کی دولت اور ملک کے حصے بخرے ہو گئے۔ گورنر اپنی بیوی اور بیٹی کو لے کر رات کی تاریکی میں محل سے فرار ہو گیا۔ زر و جواہر کا خزانہ جو اس نے ایسے ہی کسی آڑے وقت کے لئے محفوظ کیا تھا اپنے ساتھ لے گیا۔ دھرم اپنے خسر کے پاس جانا چاہتا تھا چنانچہ وہ عازم مالوہ ہوا چلتے چلتے رات ہو گئی اس وقت تینوں مسافر کو ہ وندھیاچل کے جنگلات میں داخل ہو چکے تھے۔

راجا جنگل میں چلتا رہا۔ ایسے وقت میں رات اس کی رفیق تھی۔ تاریکی اور ہواؤں کی سنسناہٹ اور شبنم کے گرتے ہوئے قطرے، گویا یہ سب دھرم کے سب سے زیادہ وفادار ساتھی کی حیثیت سے پیش پیش تھے رات جیسے سیاہ ماتمی لباس میں اس

کی بربادی پر بسک رہی تھی۔ چلتے چلتے یہ قافلہ ایک ایسے مقام پر
پہنچا جہاں بھیل قبائل آباد تھے ان لوگوں کا پیشہ لوٹ مار، قتل و
غارت گری تھا انہوں نے جیسے ہی دھرم کو شاہی لباس میں دیکھا
ایک گروہ مہلک ہتھیاروں سے مسلح لوٹ مار کی غرض سے باہر نکل
آیا۔ دھرم نے جب یہ صورتحال دیکھی تو اپنی بیوی اور بیٹی کو جھاڑیوں
کے پیچھے چھپ جانے کے لئے کہا اور خود تلوار اور ڈھال لے کر
مقابلے کے لئے تیار ہو گیا۔ دونوں عورتیں جھاڑیوں میں چھپی تھر تھر
کانپ رہی تھیں۔ راجا نے ڈاکوؤں کا بڑی جوانمردی سے مقابلہ کیا۔
اور ان میں سے بہت سے لوگوں کو مار گرایا ان کے سردار نے جب
یہ صورتحال دیکھی تو وہ قبیلے کے تمام افراد کو راجا کے مقابلے پر لے آیا
اور آخر کار یہ بہادر انسان دادِ شجاعت دیتے ہوئے زخمی ہو کر گرا
اور ختم ہو گیا۔ ڈاکو راجا کی قیمتی پوشاک اور تمام دولت لوٹ کر
لے گئے ان کے جانے کے بعد چندراوتی جھاڑیوں سے اپنی نوجوان
بیٹی کے ساتھ باہر نکلی راجا کی لاش دیکھ کر ماں بیٹی کے دل خون ہو
گئے اور غم و اندوہ کے تاریک سائے ان کے چہروں پر واضح طور
سے دیکھے جا سکتے تھے۔ صبح ہو چکی تھی۔ لہٰذا یہ دونوں وہاں سے
چل دیں اور ایک دوسرے جنگل سے مالوے کی طرف روانہ ہوئیں۔

دوپہر ڈھل رہی تھی رانی چندراوتی اپنی بیٹی کو لئے چلی جا
رہی تھی آخر اشوک کے ایک درخت کے نیچے سستانے کے لئے دونوں
بیٹھ گئیں اور رونے لگیں اسی دوران ایک معزز اور نیک دل کندا سھا
نامی شخص اپنے بیٹے سھا پر اکر ما کے ساتھ شکار کی غرض سے گھوڑے
پر ادھر سے گزرا اچانک اس کی نظر دونوں ماں بیٹی کے قدموں کے
نشانات پر پڑی ریت میں یہ نشانات بہت واضح تھے اس نے اپنے
بیٹے سے مشورہ کیا کہ ان نشانات کا پیچھا کرنا چاہیئے۔ اگر ان میں سے کوئی
عورت میں نے تمہارے لئے موزوں پائی تو میں اس سے تمہاری شادی
کر دوں گا۔"

"پتا جی یہ چھوٹے چھوٹے قدموں والی عورت مجھے بڑی خوبصورت
معلوم ہوتی ہے میری خواہش ہے کہ اسی سے شادی کروں" بیٹے نے
کہا" مجھے یقین ہے کہ یہ عورت میرے لئے اچھی بیوی ثابت ہو گی۔
اور وہ بڑے قدموں والی عورت! اس سے آپ شادی کر لیجئے گا۔"

"واہیات۔ ابھی تمہاری ماں کو مرے دن ہی کتنے ہوئے
ہیں جو میں دوسری کی فکر کروں۔ بھلا اس جیسی وفا شعار اور حسین
بیوی مجھے اب کہاں مل سکتی ہے" باپ نے جواب دیا۔

"پتا جی میں اس بات کو نہیں مانتا۔ آپ کو شادی کرنی پڑے
گی۔ ایک گرہستی والا گھر عورت کے بغیر سونا ہوتا ہے اور کیا آپ نے
مول دیو کا یہ قول نہیں پڑھا کہ اگر کسی گھر میں خوبصورت بھاری کولہوں
اور متناسب جسم کی عورت شوہر کا انتظار دروازے پر کھڑی نہ کرتی ہو تو
وہ گھر ایک جیل ہے جہاں بغیر بیڑیاں پہنائے قیدیوں کو رکھا جاتا
ہے اور جس میں صرف بے وقوف لوگ ہی داخل ہو سکتے ہیں۔ اگر
آپ نے اس بڑے قدموں والی عورت سے شادی نہ کی تو میں اس
زندگی پر لعنت بھیج دوں گا۔"

ناچار کندا سھا نے بیٹے کی اس خواہش پر اپنی رضامندی ظاہر
کر دی اور یہ لوگ خاموشی اور آہستگی کے ساتھ اشوک کے درخت
کی جانب بڑھنے لگے جہاں یہ معزز خواتین بیٹھی بین کر کر کے رو رہی
تھیں۔ تھوڑی دیر بعد انہوں نے ماں بیٹی کو جا لیا۔

دونوں عورتیں ابھی تک تھر تھر کانپ رہی تھیں۔ خوف و
ہراس اور رنج و الم کے آثار ان کے چہروں سے ظاہر تھے۔

"تم دونوں آخر اس قدر پریشان کیوں ہو؟ بیٹھ جاؤ اور
ہمیں اطمینان سے بتاؤ کہ کون ہو اور یہاں کیوں آئی تھیں؟ اپنے
تمام اندیشوں کو دل سے نکال دو۔ تمہارے نام مستی اور مسرت
تو نہیں ہیں جو عشق کی موت پر آنسو بہانے آئی ہو۔ جیسے شو، دیوتا
کی تیسری آنکھ سے نکلنے والی آگ نے کیلاش کے پہاڑ پر جلا کر بھسم کر
دیا تھا؟ تم دونوں کا حسن تو اس قابل ہے کہ محلوں میں رانیاں بن کر
رہو اور بہت سے انسانوں کے دلوں پر حکومت کرو۔ تم دونوں
روتے دھوتے اور تکلیفیں اٹھانے کے لئے نہیں پیدا کی گئی ہو۔ دیکھو
تمہارے پیروں میں چھالے پڑ گئے ہیں۔ جگہ جگہ کانٹے چبھے دکھائی
دیتے ہیں حالانکہ یہ پیر تو اس قابل ہیں کہ اطلس و کمخواب کے فرش پر
رکھے جائیں۔ ہمیں تم دونوں کو اس حال میں دیکھ کر سخت صدمہ
ہوا ہے۔ یہ حسین چہرے جن کے حسن کی آب و تاب کو خاک دھول کی
اتنی موٹی تہہ بھی دھندلا نہ سکی۔ آہ! ان کی قدر و قیمت کوئی ہمارے دلوں
سے پوچھے۔ تم پہلے ہمیں اپنی کتھا سناؤ ہم تو سوچ بھی نہیں سکتے کہ تم
جیسی دیویاں اس خونخوار درندوں سے پُر جنگل میں بھی پہنچ سکتی ہیں۔"

کنداسبھاکی اس مہذب پُراثر اور طویل تقریر سے دونوں ماں
بیٹی کے دلوں کو قدرے سکون ملا اور چندراوتی نے اپنی دردناک
داستان اسے سنادی۔ باپ بیٹے پر اس داستان کا بڑا اثر ہوا اور وہ
انہیں نہایت عزت و احترام سے اپنے محل میں لائے جو تناپاپوری میں
واقع تھا۔ بڑے پیروں والی عورت چندراوتی کی بیٹی ثابت ہوئی اور
اس نے کنداسبھا یعنی باپ سے شادی کی اور چھوٹے قدموں والی عورت
ماں ثابت ہوئی یعنی چندراوتی اور اس نے سبھاپراکرما سے شادی کر لی
کیونکہ دونوں باپ بیٹوں میں پہلے ہی اس مسئلے پر قول و قرار ہو چکا تھا۔

" اس طرح قدموں کے نشانوں سے پیدا ہونے والی غلط فہمی
نے یہ دلچسپ صورتحال پیدا کر دی کہ ماں اپنی بیٹی کی بہو بنی اور بیٹی
ماں کی ساس کچھ عرصے کے بعد دونوں ماں بیٹی کے بیٹا اور بیٹی پیدا
ہوئے اور پھر ان کی نسل چلی اور اس طرح اس نئے خاندان نے جنم
لیا" جب راستے میں روح نے اپنی اس کہانی کو ختم کر دیا تو اس
نے تری وکرم سین سے پوچھا "راجا بتا۔ ماں بیٹی اور باپ بیٹے سے اس
طرح پیدا ہونے والے بچوں کا رشتہ آپس میں کیا ہوگا؟ مگر یاد رکھ کہ اگر
تو جواب سے واقف ہے اور بتانے سے گریز کرتا ہے تو تیرا سر
پاش پاش ہو جائے گا۔"

یہ سوال بہت مشکل تھا۔ راجا نے بڑا غور و خوض کیا لیکن اس
کی سمجھ میں نہ آسکا اور وہ خاموشی سے راستہ طے کرتا رہا۔ ادھر روح
یہ سوچ رہی تھی کہ راجا اس مسئلے کو حل نہیں کر سکتا اور وہ بڑی خوشی
سے اپنی منزلِ مقصود کی طرف جا رہا ہے مگر میں اس نیک دل بہادر
اور عظیم راجا کو دھوکے میں نہیں رکھنا چاہتی کیونکہ وہ بدمعاش سادھو
گھات لگائے بیٹھا ہے کہ کب راجا لاش اس کے پاس لے کر پہنچے اور
کب وہ اپنے مکروہ عزائم کو پورا کرے۔ مگر میں اس کے تمام عزائم
خاک میں ملا دوں گی وہ خبیث ہے اور اسے وہ نعمت نہیں ملنی چاہیئے
جس کے لئے اس نے یہ سب کھٹراگ پالا ہے میں وہ عظمت و سربلندی
جس کے لئے اس ناہنجار سادھو نے اتنے مہان راجا کو دھوکے میں ڈال کر
اس کی جان تک لینے کی کوشش کی ہے اسی راجا کو عطا کر دوں گی کیونکہ
یہ حقیقتاً اس کا مستحق ہے یہ سوچ کر روح راجا سے مخاطب ہوئی "اے
مہان راجا! مجھے اس بات کا احساس ہے کہ اتنی دفعہ آنے جانے سے
تو تھک چکا ہوگا لیکن حیرت کی بات تو یہ ہے کہ اب تک تیرے چہرے
پر اکتاہٹ یا ماتھے پر غصے کے آثار نظر نہیں آئے میں تیرے اس
غیر معمولی تحمل سے بہت خوش ہوں اور میں تجھے اجازت دیتی ہوں
کہ اس لاش کو اس سادھو کے پاس پہنچا دے جس سے تو نے وعدہ
کیا ہے لیکن سُن جب تو وہاں پہنچے گا تو وہ ناہنجار سادھو پہلے تو اپنے
عمل کے زور سے مجھے طلب کرے گا چنانچہ میں اس کے سامنے پہنچوں
گی تو وہ میری پوجا کرے گا اس کے بعد تجھ سے کہے گا کہ زمین پر اس
طرح سجدہ کر کہ تیرے آٹھوں اعضاء زمین کو چھوئیں۔ تجھے ایسا حکم دے
کر در اصل وہ تجھے قربان کرنا چاہے گا۔ چنانچہ تو اس سے کہنا پہلے تم خود
سجدہ کر کے دکھاؤ تاکہ میں ویسا ہی کروں۔ بس وہ خود عملی طور پر سجدہ
کر کے تجھے بتائے گا کہ تجھے اس طرح سجدہ کرنا ہے۔ بس یہی موقع تیرے
لئے ہوگا کہ تو فوراً اس کا سر تن سے جدا کر دے۔ ایسا کرنے کے بعد
اس کی جگہ تو لے لے گا اور ماورائے ادراک قوتوں پر تجھے حکمرانی مل
جائے گی۔ بس تو اسے ختم کر دے اور روئے زمین پر تیری حکمرانی ہوگی"
یہ کہہ کر وہ روح راجا کے کندھوں پر سے غائب ہو گئی اور راجا لاش
کو لئے چلتا رہا۔ اسے اس بات کا بڑا غم تھا کہ سادھو نے اسے اتنا بڑا دھوکا
دیا اور اس کی سادگی سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔

راجا لاش کو لئے سادھو کے پاس پہنچ گیا۔ مرگھٹ اس وقت
بھی بڑا بھیانک منظر پیش کر رہا تھا۔ سادھو نے درخت کے نیچے ایک
حلقہ کھینچ رکھا تھا جس میں زمین پر چاروں طرف خون ہی خون دکھائی
دیتا تھا یہ حلقہ انسانی ہڈیوں کے سفوف سے کھینچا گیا تھا۔ حلقے کے اندر
چاروں طرف چراغ جل رہے تھے جن میں انسانی چربی استعمال کی گئی
تھی اور اس طرح اس سادھو نے وہ تمام ماحول مہیا کر دیا تھا جو ایسے
کسی جاپ کے لئے ضروری ہو سکتا ہے۔ راجا کو لاش لاتے دیکھ کر
سادھو کی باچھیں کھل گئیں۔ خباثت کے اثرات اس کے چہرے پر گہرے
ہو گئے اور اس نے کہا "مہاراج کی جے تو نے میرے لئے ایک ناممکن
کام کو ممکن بنا دیا ہے۔ بھلا تیرے جیسی جلیل القدر ہستی کا یہاں اس
ویرانے میں اس خوفناک مقام پر کیا کام! واقعی اگر تیرے عوام تجھ پر
جان چھڑکتے ہیں تو غلط نہیں کرتے کیونکہ تو اس کا مستحق ہے۔ تو دل سے
کا سچا ہے اور شجاعت میں لاجواب ہے۔ تجھے خراج عقیدت
پیش کرتا ہوں جیسا کہ داناؤں نے کہا ہے کہ عظیم انسان کی عظمت کا
راز اس حقیقت میں پوشیدہ ہوتا ہے کہ وعدہ کر کے اس کے الفاظ میں

اگر جان بھی جاتی ہو تو پیشانی پر شکن ڈالے بغیر موت کو قبول کرلے۔"

باتیں کرتے ہوئے سادھو نے راجا کے کندھے پر سے لاش اتروائی اسے خوشبوؤں میں بسایا اس پر پھولوں کے ہار چڑھائے اور حلقے کے اندر لاکر رکھ دیا۔ چند لمحے وہ بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ اس کے بائیں کندھے سے دائیں کولہے تک ایک دھاگا جو تمام برہمن پہنتے ہیں اور جسے جنیؤ کہتے ہیں، پڑا ہوا تھا۔ یہ دھاگا انسانی ——————— بالوں سے بنا گیا تھا۔ اس کا تمام جسم سفید راکھ سے اٹا ہوا تھا اور وہ منتر پڑھ رہا تھا۔ اپنے جادو کے زور سے اس نے اسی روح کو بلایا اور اس لاش کے اندر داخل ہونے پر مجبور کیا۔ اس کے بعد اس نے پوجا پاٹ شروع کی پہلے اس نے روح کو نذرانے پیش کئے جو ایک انسانی کاسہ سر میں رکھے ہوئے تھے۔ نذرانے میں انسانی دانت، ایک پھول، ایک خوشبودار کریم، دو انسانی آنکھیں، اور انسانی گوشت اور اس طرح پوجا پاٹ سے فارغ ہونے کے بعد وہ راجا کی طرف مڑا۔

"اے نیک دل راجا اس مہان جادوگر کے سامنے جو اس وقت یہاں موجود ہے سجدہ کر اس طرح کہ تیرے آٹھوں اعضاء زمین کو چھوئیں اور دلی مراد حاصل کر۔"

راجا کو روح کی ہدایت یاد آگئی اور اس نے سادھو سے پہلے خود سجدہ کرنے کو کہا تاکہ وہ دیکھے کہ یہ سجدہ کس طرح ہوگا۔ سادھو فوراً ہی سجدے میں گر پڑا اور راجہ نے ہدایت کے بموجب اس کی گردن تن سے جدا کردی۔ پھر اس کا سینہ چاک کرکے دل کے ٹکڑے ٹکڑے کئے اور سر اور دل روح کے حضور بطور نذرانہ پیش کئے۔

راجا بہت سی نامعلوم روحوں کی آوازیں سن رہا تھا جو اسی لاش کے اندر سے آتی ہوئی سنائی دے رہی تھیں ان آوازوں میں اس روح کی آواز سب سے زیادہ نمایاں تھی جو تھوڑی دیر پہلے اس سے مخاطب تھی۔

"اے راجا جب تیری سلطنت پر سے تیری حکمرانی ختم ہو جائے گی تو بہت سی آسمانی قوتوں پر تیری حکمرانی شروع ہوگی۔ میں نے تجھے بڑی تکلیف پہنچائی اور تو نے نہایت استقلال سے اسے برداشت کیا میں تجھ سے بہت خوش ہوں۔ بول کیا مانگتا ہے؟"

"اے مقدس روح جب تو مجھ سے خوش ہے تو تیری خوشی سے زیادہ مجھے کسی اور بات کی تمنا نہیں ہوسکتی لیکن اگر یہ تیرا حکم ہے تو میں تجھے اپنی خواہش سے آگاہ ضرور کروں گا۔ میری خواہش ہے کہ تیری یہ چوبیس کہانیاں جو تو نے مجھے سنائی ہیں رہتی دنیا تک انسانوں کے درمیان مقبول رہیں۔"

"ایسا ہی ہوگا" روح یہ کہہ کر غائب ہوگئی اس کے بعد بھگوان دیوتاؤں کے ساتھ خود آئے انہوں نے کہا "اے میرے سپوت تو نے بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے بڑی بہادری کا ثبوت دیا ہے میں تجھ سے بہت خوش ہوں یہ ناہنجار بدکردار بوڑھا طاقت کے بل پر ان دیکھی طاقتوں کو زیر کرنا چاہتا تھا۔ جان لے کہ میں نے تجھے خود اپنے جسم کے ایک حصے سے پیدا کیا ہے تاکہ تو وحشی انسانوں کے درمیان موجود بھوت پریتوں کا خاتمہ کرسکے۔ تو بہادر ہے تو مہان ہے جب تجھے تمام روئے زمین پر اور اس کے اندر جو کچھ ہے اس پر غلبہ حاصل ہو جائے گا تو آسمان تجھے اپنی آغوش میں لے لے گا۔ تو وہاں کا بہت عظیم حکمراں ثابت ہوگا۔ لیکن ایک دن تجھے میرے پاس لوٹنا ہوگا۔ لے یہ تلوار میری طرف سے تحفہ ہے جو نصرت کا نشان ہے اور جس کی مدد سے ہر وہ شئے جو تو چاہے گا تجھے ملے گی" اور اس طرح بھگوان تری وکرم سین کو تلوار دے کر رخصت ہوئے۔



"راجا نے جب دیکھا کہ تمام کھیل ختم ہوچکا تو وہ اپنی راجدھانی کی طرف لوٹا رات ختم ہو رہی تھی۔ صبح کا وقت تھا راجا محل کی طرف جا رہا تھا۔ شہر پہنچا تو شہر کے دروازے پر عوام کو استقبال کے لئے تیار پایا کیونکہ انہیں راجا کی اس مہم کا علم ہوگیا تھا جس پر وہ رات گئے خفیہ طریقے سے چلا گیا تھا۔ سارے ملک میں خوشی کے شادیانے بجائے گئے جشن منائے گئے اور راجا سارا دن غریبوں اور کمزوروں کی مدد کرتا رہا چند ہی سالوں کے مختصر سے عرصے میں راجا نے بھگوان کی عطا کردہ تلوار اور اپنی بہادری سے تمام روئے زمین پر اور زمین کے اندر جو کچھ ہے اس پر بھی حکومت حاصل کرلی اور جب اس کا دل اس شان و شوکت سے بھر گیا تو وہ بھگوان سے جا ملا۔



لکھنؤ کا افسانہ

الیاس سیتاپوری



اورنگ زیب کو اس جہان سے رخصت ہوتے ابھی زیادہ عرصہ

نہ گزرا تھا کہ شہزادہ معظم نے اپنے دوسرے بھائیوں کو مغلوب اور ہلاک کرکے شاہ عالم بہادر شاہ کے نام سے اورنگ زیب کی جانشینی اختیار کی اور صرف پانچ سال حکومت کرسکا۔ جس میں سے آخری تین سال تک وہ دریائے راوی کے ساحل پر خیمہ زن رہا۔ شہزادہ معظم شاہ عالم بہادر شاہ کی سنجیدگی اور دانائی بے مثل تھی لیکن جب اس نے ساحلِ راوی پر خیمہ زنی کے دوران لاہور کے تمام کتوں کو ہلاک کیے جانے کا مہمل اور بے معنی فرمان جاری کیا تو اس کے ساتھی ہکا بکا رہ گئے اور اِس نتیجے پر پہنچے کہ اس پر ضرور جن یا کسی آسیب کا سایہ پڑ گیا ہے۔ بعد میں جب وہ بیمار پڑا تو اس کے چار بیٹوں میں سے دو اس کے پاس ہی موجود تھے۔ جہاں دار شاہ اور عظیم الشان۔ جہاں دار شاہ اپنے چاروں بھائیوں میں سب سے بڑا تھا اور عظیم الشان اس سے چھوٹا۔ ان دونوں عظیم الشان کو اپنے بادشاہ باپ کا سب سے زیادہ قرب حاصل تھا۔

لشکری خیموں اور بازاروں میں سراسیمگی اور ہراسانی پھیلی ہوئی تھی۔ جس طرح طوفان کی آمد سے پہلے ہی اکثر پرندے اپنی پُراسرار جبلت سے اس کا علم حاصل کرکے ترکِ مکانی کرجاتے ہیں اسی طرح کوئی چیز تھی جس نے لشکریوں کو خوفزدہ کر رکھا تھا۔ سوداگر اپنا سامان سمیٹ کر چپ چاپ وہاں سے فرار ہورہے تھے جس کو دیکھنے بچوں کی انگلیاں پکڑے یا گود میں دبائے نقاب یا چادر میں سرتاپا چھپائے عورتوں کے ساتھ اپنی گاڑیوں کی طرف بھاگا چلا جارہا تھا۔ شاہی لشکرگاہ اجڑ گئی۔ بازاروں میں لوٹنے کے لیے کتے بھی عنقا تھے۔ بس خاص خاص امرا، شہزادگان اور ان کی سپاہ کے خیمے اپنی اپنی جگہ ایستادہ تھے اور یہ سب بادشاہ کی موت کے منتظر تھے اور اپنی اپنی پسند کے شہزادوں کی حکومت کے لیے تدبیریں اور سازشیں کرنے میں مشغول تھے۔ لوگوں کی بھگدڑ نے پوری فضا کو گرد آلود کردیا تھا۔ بخار میں مبتلا بادشاہ کو اس منحوس اور ہنگامی کیفیت سے لاعلم رکھا گیا تھا۔

شاہ عالم بہادر شاہ کے خیمے میں موت کا سکوت طاری تھا۔ سب سے بڑا بیٹا جہاندار شاہ سامنے سر جھکائے مؤدب کھڑا ہوا تھا۔ اس سے کافی دور ایک گوشے میں بادشاہ کا سب سے زیادہ چہیتا بیٹا عظیم الشان سرکاری کاغذات جھکا ہوا بیمار باپ کی طرف سے احکام جاری کررہا تھا۔ باپ کی شاہی مہر اس کے قبضے میں تھی۔ وہ کاغذات پڑھتا، ان پر کچھ لکھتا اور دستخط کرکے مہر لگا دیتا۔ جہاندار شاہ نے ایک آدھ بار نگاہ غلط انداز سے اپنے خوش نصیب بھائی کو دیکھا اور اندر ہی اندر کھول گیا۔ عظیم الشان اس کا چھوٹا بھائی غاصب تھا، جو عنقریب اس کا حق غصب کرنے والا تھا۔ خیمے کے پچھلے حصوں میں کپڑے کے پردوں کے اس پار شاہی بیگمات تھیں جو امید و بیم میں معلق بوڑھے بادشاہ کے سنبھالے یا موت کی منتظر تھیں۔

بخار میں تپتے ہوئے بہتر سالہ بوڑھے بادشاہ نے اپنی آنکھیں کھولیں اور سرسری نظروں سے خیمے کا جائزہ لیا۔ شہزادہ جہاندار شاہ تعظیماً ذرا سا جھک گیا۔ بادشاہ نے حسرت سے اسے دیکھا اور اس کی پیشانی غصے سے شکن آلود ہوگئی۔ اس نے اپنا منہ دوسری طرف کرلیا اور لرزتی ہوئی آواز میں پُروقار لہجے میں سوال کیا۔ "لال کنور کہاں ہے؟"

جہاندار کے چہرے پر سرخی دوڑ گئی۔ "جہاں پناہ! اپنے خیمے میں۔"

"ہاں!" بادشاہ بڑبڑایا۔ "تم ولی عہد تھے۔ ہمارے سب سے بڑے بیٹے۔ لیکن تمہاری اقلیمِ دل پر لال کنور نے قبضہ کرلیا ہے۔ یہ لال کنور وہی ہے نا جو ہمارے جدِ بزرگ اکبر اعظم کے درباری گویّے تان سین سے رشتے داری رکھتی ہے۔"

"جہاں پناہ کا علم شک و شبہے سے بالا ہے۔ یہ وہی ہے۔" جہاندار شاہ نے انکسار اور رجاحت سے جواب دیا۔

"بے شرم!" بادشاہ نے غصے سے پھر کروٹ بدلی۔ "تم نااہل ہونے کے ساتھ ساتھ بے شرم بھی ہو۔ ہم لال کنور کو ہرگز برداشت نہ کریں گے۔"

جہاندار شاہ نے اور زیادہ ہمت سے کام لیا۔ "قبلۂ بندگان! اب تو وہ جہاں پناہ کی بہو ہونے کا شرف بھی حاصل کرچکی ہے۔"

شاہ عالم کا چہرہ تمتما اٹھا۔ "ہم اسے بہو بھی تسلیم نہ کریں گے۔ وہ ہمارے حضور اپنے طائفوں کے ساتھ رقص و موسیقی کے کمالات دکھانے آیا کرتی تھی۔ ہمیں کیا معلوم تھا کہ ایک تیموری شہزادہ اور ولی عہد سلطنتِ مغلیہ اس کی خم دار زلفوں اور گھنگھرو کی پشواز پر اپنا سب کچھ قربان کردے گا۔ عزت، آبرو، وقار، شان، دبدبہ، سطوت، عظمت، حمیت، تم نے سب کچھ اس ڈومنی پر قربان کردیا۔"

جہاندار شاہ کو باپ کی باتیں بری تو بہت لگیں لیکن دو چار گھڑی کے مہمان بوڑھے باپ کی ساری باتیں مصلحتاً برداشت کی گئیں۔ حالانکہ اس وقت وہ اپنی چہیتی محبوبہ دلنواز لال کنور کے ایما پر ہی بارگاہِ عالی میں حاضر

ہوا تھا۔ لال کنور کی اس وقت سب سے بڑی خواہش یہی تھی کہ شاہ عالم کے مرنے سے پہلے وہ اُس کی خدمت میں حاضر ہو کر اس کی بہو تسلیم کر لئے جانے کا شرف حاصل کرلے لیکن بوڑھا بادشاہ بخار کی شدت اور ہیجان میں بھی لال کنور کو بہو ماننے پر تیار نہ تھا۔ جہاندار شاہ جب باپ کے خیمے میں داخل ہوا تھا تو وہ بہت پرامید تھا لیکن باپ کا قلب تو اس چٹان کی مانند تھا جس پر رحم اور نرمی کے بیج نہیں بوئے جاسکتے تھے۔ وہ خاموش ہوگیا۔ جہاندار کو اپنا مستقبل تاریک دکھائی دے رہا تھا۔ ایک طرف حکومت تھی ہندوستان جیسے وسیع و عریض ملک کی حکومت دولت و ثروت تھی، خزانے تھے، وسیع اختیارات تھے، افواج تھیں۔ اور بے انتہا حسین اور خوشگوار مستقبل تھا بھرا پُرا شاہی خاندان تھا، عالیشان اور بے مثال محلات اور قلعے تھے، تو دوسری طرف لال کنور تھی، طائفے تھے، آلاتِ موسیقی تھے۔ کلاونتوں کی فوج تھی، راگ رنگ، ساز و آواز، لال کنور کے بھائی بند، اُس کی ہم پیشہ طرحدار گانے والیاں تھیں فیصلہ بہت آسان اور واضح تھا۔ جہاندار کو اپنی اصل کی طرف جانا چاہیے تھا لیکن اُس نے لال کنور کے مقابلے میں ہر شے کو ٹھکرا دیا تھا۔ سلطنتِ مغلیہ کے بانی اور اس کے جدِ اعلیٰ نے کہا تھا اِس وقت وہی اُس کے ذہن میں گونج رہا تھا:

"بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست"

یہ ایک فال تھی، شگون تھا۔ وہ انہی خیالوں میں ڈوبا ہوا تھا کہ شدتِ غم اور عالمِ مایوسی میں شاہ عالم نے اپنی آنکھیں بند کرلیں جہاندار شاہ نے گوشے میں بیٹھے ہوئے اپنے چھوٹے بھائی عظیم الشان کی طرف دیکھا۔ دونوں کی نظریں ایک دوسرے سے ٹکرائیں۔ عظیم الشان نے اپنے سامنے رکھے ہوئے خنجر کو اُٹھا لیا اُس کی نظریں بڑے بھائی جہاندار شاہ پر تھیں اور ہاتھ خنجر سے کھیل رہے تھے۔ جہاندار شاہ کو غلط فہمی ہوئی کہ چھوٹا بھائی اسے ہلاک کرنا چاہتا ہے۔ اُس نے ایک نظر اپنے بیمار اور کمزور باپ پر ڈالی۔ اُس میں اتنی جان نہ تھی کہ اگر عظیم الشان، جہاندار شاہ پر خنجر سے حملہ کردے تو وہ اُٹھ کر اس کا دفاع کرے۔ وہ خوفزدہ اور سراسیمہ سا خیمے کے دروازے کی طرف مڑا۔ ادابِ شاہی کا بوکھلاہٹ میں خیال ہی نہ رہا۔ دیوانوں کی طرح بھاگ کھڑا ہوا۔ خیمے کے دروازے سے ٹکر ہوئی سر میں چوٹ آئی اور سر کی پگڑی دور جاگری۔ بھاگنے میں جوتیاں بھی آڑے آرہی تھیں اُن سے بھی گلو خلاصی حاصل کرلی گئی اور ننگے پیر ہی خیمے سے باہر نکل گیا۔ باہر خیمے کی ڈوریوں نے پیر پکڑے اور وہ لڑکھڑا کر ڈھیر ہوگیا۔ باہر اُس کی پالکی تیار تھی۔ جہاندار شاہ کے ذاتی ملازمین نے اُسے خیمے کے باہر ڈوریوں سے اُلجھ کر اوندھے منہ گرتے جو دیکھا تو خود بھی گھبرا گئے۔ وہ سمجھے کہ اندر ضرور کسی محلاتی سازش سے شہزادہ جان بچا کر بھاگا ہے۔ اُنہوں نے اپنے ولی نعمت کو جلدی سے اٹھایا اور اسے پالکی میں بٹھا، یہ جا وہ جا، فرار ہوگئے۔

اس افراتفری اور ہلکے سے ہنگامے میں شاہ عالم کی آنکھ کھل گئی۔ اُس نے اس جگہ دیکھا جہاں تھوڑی دیر پہلے جہاندار شاہ کھڑا تھا۔ اب وہ جگہ خالی تھی۔

عظیم الشان اپنی جگہ سے اُٹھا اور اپنے بڑے بھائی کی جوتی اور پگڑی کو قابو میں کیا۔ بوڑھا باپ اپنے مفرور بیٹے کی بابت اب کچھ بھی نہیں پوچھنا چاہتا تھا۔



جہاندار شاہ جب اپنے خیموں کی حدود میں داخل ہوگیا تو اس کی جان میں جان آئی۔ اُس کے ذاتی خیمے کے گرد دور دور تک اُس کے دربار سے وابستہ امرا اور سپاہیوں کے خیمے نصب تھے۔ جب وہ پالکی سے اُتر کر اپنے خیمے میں داخل ہو رہا تھا تو لال کنور کا حقیقی بھائی خوشحال خاں مجرا بجا لایا۔ یہ شخص طنبورہ بجانے میں ماہر تھا اور اپنی بہن کے توسط سے جہاندار شاہ کے خاص مقربین میں داخل ہوگیا تھا۔ جہاندار شاہ ایک شانِ بے نیازی سے خیمے میں داخل ہوگیا۔ لال کنور اس کی پذیرائی تک کو نہ اٹھی۔ اُس نے ایک ادائے دلبرانہ سے جہاندار شاہ کو دیکھا اور اپنے نرم و نازک بستر میں ڈوب گئی۔ پورا خیمہ عنبر اشہب سے مہک رہا تھا۔ خوشحال خاں باہر ہی رہ گیا۔ وہ جہاندار شاہ کی خدمت میں باریابی کا خواہشمند تھا۔

جہاندار شاہ حسین و جمیل معموم اور اُداس لال کنور کے قریب پہنچ گیا اور اُس نے اس کے رخساروں کو چھو کر دیکھا اُس کا خیال تھا شاید لال کنور کی طبیعت خراب ہوگئی ہے لیکن رخسار ٹھنڈے تھے۔ لال کنور نے منہ پھیر لیا اور کروٹ بدل کر آنکھیں بند کرلیں۔ جہاندار شاہ دوسری طرف پہنچ گیا۔ اور اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے۔ "کیا بات ہے یہ تم بیزاری کا اظہار کیوں کرتی ہو؟"

لال کنور نے اٹھلا کر جواب دیا "میں لال کنور ولی عہدِ سلطنتِ مغلیہ کی محبوبہ ہوں لیکن میں ابھی تک اپنی صحیح قدر و قیمت حاصل نہیں کرسکی ہوں۔"

لاَل کنور گستاخی کی حد تک جہاندار شاہ سے بے تکلّف تھی ۔

جہاندار شاہ نے اُسے اُٹھا کر اپنی آغوش میں لے لیا اور پوچھا" کہو کیا کہنا چاہتی ہو۔" پھر کچھ ٹھہر کر آہستہ سے بولا" تمہاری صحیح قدر و قیمت تو اُس وقت بڑھے گی جب ہم اپنے جملہ بھائیوں کو ہلاک یا بیکار کرکے بلا شرکتِ غیرے ہندوستان کے بادشاہ ہو جائیں گے لیکن عظیم الشّان کی موجودگی سب سے بڑی رکاوٹ ثابت ہو رہی ہے ۔"

" بوڑھے بادشاہ کا دَم نکلا یا نہیں ؟" لال کنور نے سبک لہجے میں دریافت کیا ۔

جہاندار شاہ اپنے باپ کے لئے یہ نازیبا اور اہانت آمیز الفاظ سُن کر تلملا گیا لیکن وُہ لال کنور کو بے حد چاہتا تھا۔ یہ ذلّت بھی گوارا کرلی ۔

حسین لال کنور نے جہاندار شاہ کا ایک ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور پوچھا" کیا بھائی خوشحال خاں سے مُلاقات ہوئی ؟"

" ہاں " جہاندار نے جواب دیا۔" وہ اب بھی خیمے کے دَر پر موجود ہوگا۔"

لال کنور نے ولی عہد کے سینے سے اپنا سَر لگا دیا۔ جہاندار اُس کے بستر پر بیٹھ گیا ۔

" خوشحال خاں اس لئے حاضر ہُوا ہے کہ وُہ مجھے یہاں سے لے کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کہیں دُور چلا جائے"۔ لال کنور کہنے لگی" لیکن میں تم سے محبّت کرتی ہوں، میں نہیں جانا چاہتی ۔" اور وُہ سسکیاں بھرنے لگی ۔

جہاندار کا دَم کھنچنے لگا" لیکن ہم تمہیں نہیں جانے دیں گے تم سلطنت مغلیہ کی ملکہ بننے والی ہو ہم تمہیں وُہ مقام عطا کریں گے جو ہمارے بزرگوں نے نورِ جہاں اور ممتاز محل کو عطا کیا تھا ۔"

" شہزادے !" لال کنور نے زبان کھولی ۔" عظیم الشّان تمہیں ہرگز بادشاہ نہ بننے دے گا ۔"

" ہم بھی یہی سمجھتے ہیں۔" اس کے بعد جہاندار شاہ نے تھوڑی دیر پہلے شاہی خیمے میں پیش آنے والے واقعے کا ذکر کرکے کہا" ہم سوچتے ہیں کہ اگر ہم رسمِ تاجپوشی ادا نہ کرسکیں اور مغلیہ تاج و تخت سے محرُوم رہیں تو ہمیں نہایت خاموشی سے اپنے زیرِ انتظام صوبے مُلتان چلا جانا چاہیئے۔"

اچانک خیمے کی داہنی دیوار کے پیچھے سے سسکیوں کی آواز اُبھری

جہاندار شاہ نے چونک کر اس طرف دیکھا اور اشاروں ہی اشاروں میں لال کنور سے کچھ دریافت کیا۔ لال کنور تو جیسے اس موقعے کی منتظر ہی تھی ۔

کہنے لگی" کیا یہ سچ ہے کہ تم مجھے بہت چاہتے ہو ؟"

" بالکل ۔" جہاندار شاہ نے جواب دیا۔" اگر درمیان میں تم نہ ہوتیں تو بلا کسی کشمکش اور تردّد کے قبلہ عالم ہمیں اپنا جانشین نامزد فرما دیتے ۔" پھر سرد آہ بھر کر بولا" انہیں تم سے نفرت ہے کہتے ہیں تم نان سین کے خاندان کی ایک ناچنے گانے والی عورت ہو، تمہاری اس سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں، تم خاندانی وجاہت سے محرُوم ہو ۔"

لال کنور نے جہاندار شاہ کے ہاتھ کو جھٹک دیا۔ غصّے میں تن تنا کر کھڑی ہو گئی" تب تو یہ بُوڑھا جب مَر جائے گا تو میں خوشی میں شیرینی تقسیم کروں گی یہ تمام شاہ خاندانی وجاہتوں کے پیچھے ہی پڑے رہیں گے ۔"

جہاندار شاہ کی تیموری غیرت تو اسی دن رُخصت ہو چکی تھی جب اُس نے لال کنور جیسی معمولی عورت کو اپنا دل دے دیا تھا۔ اپنے باپ کے حق میں اُس کے یہ گستاخانہ کلمات بھی اسے مشتعل نہ کرسکے۔ اس عالم میں خیمے کے باہر سے کچھ شور و غل کی آوازیں آنے لگیں۔ ایسا معلوم دیتا تھا، جیسے کچھ مشتعل لوگ جہاندار شاہ کے خیمے میں داخل ہونا چاہتے ہوں شہزادہ ابھی تک عظیم الشّان کے خنجر والا تاثر دل سے نکال نہ سکا تھا۔ اسے شُبہ گزرا کہ یقیناً شاہ عالم کا انتقال ہو چکا ہے اور اس کا بھائی اپنی فوج لے کر اُس کی گرفتاری کے لئے سَر پر آ گیا ہے۔ وہ معاملے کی تفتیش کئے بغیر ہی لال کنور کو خیمے کے پچھلے حصّے سے لے کر فرار ہو جانا چاہتا تھا۔ وُہ بدحواس ہو کر خیمے کے اندر اِدھر اُدھر بھاگنے لگا۔ اسی عالم میں کسی اجازت کے بغیر خوشحال خاں اندر آ گیا۔ وُہ خود بھی بہت ڈرا سہما تھا۔ اس نے گھُٹی گھُٹی آواز میں کہا" شہزادے! پناہ! مجھے بچالو، یہ موذی مجھے جان سے مار دیں گے ۔"

جہاندار شاہ کے شک کو اور تقویت پہنچی اُس نے لال کنور کا ہاتھ پکڑا اور اسے کھینچتا ہُوا چھوٹے سے دروازے سے نکل کر داہنی جانب چلا گیا۔ یہ وہی حصّہ تھا جہاں سے تھوڑی دیر پہلے سسکیوں کی آواز اُبھری تھی۔

جہاندار شاہ کے بھاگتے ہُوئے قدم ایک دم رُک گئے، اُس کے سامنے ایک سولہ سترہ سالہ حسین لڑکی بندھی پڑی تھی۔ لڑکی کی سیاہ اور لمبی زُلفوں نے اُس کے درخشاں چہرے پر نقاب ڈال رکھی تھی۔ اُس کے دونوں ہاتھ پُشت پر لے جا کر باندھ دیئے گئے تھے اور اسی رسّی سے دونوں پیر بھی جکڑ دیئے گئے تھے۔ بالوں کے پیچھے سے جھانکتی ہُوئی دو خوفزدہ آنکھیں بے بسی سے انہیں دیکھ رہی تھیں ۔

جہاندار شاہ ٹھٹک کر رُک گیا" یہ کون ہے ؟" اس نے لال کنور سے دریافت کیا۔ لیکن ابھی کوئی جواب بھی نہ ملا تھا کہ چھوٹے ہُوئے جیسے

کی طرف سے بھاگتی ہوئی ایک خواص آئی اور اس نے پریشانی کے عالم میں عرض کیا۔ "شہزادے! باہر کچھ آدمیوں کے ساتھ میر بخشی ذوالفقار خان آپ سے ملاقات کرنا چاہتا ہے۔"

اب شہزادے کی جان میں جان آئی کیونکہ ذوالفقار خان اس کے دادا اورنگ زیب کے وزیر اعظم سعد خان کا جواں مرد بیٹا تھا اور شہزادے کو اس کی بھرپور حمایت حاصل تھی۔ جہاندار شاہ نے ایک بار پھر مظلوم لڑکی کو دیکھا۔ اسی لمحے خوشحال خان نے اپنی بہن لال کنور کو کچھ اس طرح دیکھا جیسے وہ کہہ رہا ہو کہ یہی وہ موقع ہے کہ بات صاف صاف کرلی جائے۔ ذوالفقار خان کی ملاقات سے پہلے ہی لال کنور بڑھ کر جہاندار شاہ کے سینے سے لگ گئی اور تحکمانہ لہجے میں بولی "ٹھیک ہے تم ذوالفقار خان سے مل لو، میں جانتی ہوں یہ وزیر کا بچہ تم سے کیا باتیں کرے گا لیکن دوران گفتگو تم اس سے کوئی وعدہ نہ کر بیٹھنا۔ یہ لڑکی زینت بھائی خوشحال خان کی محبوبہ اور امانت ہے۔ خوشحال خان اسے چاہتا ہے۔ لوگ زینت اور خوشحال خان کے درمیان خاندانی برتری اور کمتری کے نام سے دیواریں کھڑی کردینا چاہتے ہیں لیکن وہ یہ نہیں دیکھتے کہ آج خوشحال خان کے خاندان سے زیادہ معزز ہندوستان میں دوسرا کوئی خاندان نہیں۔"

یہ کہتے کہتے لال کنور کسی سہانے خواب میں کھو گئی۔ اپنی آنکھیں بند کرلیں اور آہستہ آہستہ جہاندار شاہ کے ہاتھ کو سہلانے لگی۔ "میں مستقبل کے ہندوستان کی ملکہ ہوں اور خوشحال خان ملکہ کا بھائی ہے اور اس کا یہ اعزاز ہندوستان کے دوسرے خاندانوں کے مقابلے میں غیر معمولی اور بے مثال ہے۔"

جہاندار شاہ فوراً معاملے کی تہہ کو پہنچ گیا۔ اس نے ایک نظر لڑکی پر ڈالی، وہ پہلی بار غصے میں چیخی: "میں اس کمینے کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔ مجھے اس سے نفرت ہے۔ میں جان دے دوں گی لیکن اس کے ساتھ نہ رہوں گی۔" یہ کہتی ہوئی وہ بستر سے پھسل کر زمین پر گر گئی اور پاگلوں کی طرح اپنے سر کو زمین پر ٹپکنے لگی۔ خوشحال خان نے دوڑ کر اس کے سر کو پکڑ لیا۔ لڑکی نے کسی طرح اس کے ہاتھ کو دانتوں سے چبا ڈالا۔ خوشحال خان کی چیخ نکل گئی۔ لال کنور نے جہاندار شاہ کو چھوڑ دیا اور غصے میں لڑکی کی طرف بڑھی۔ انتہائی درندگی سے بالوں کو پکڑ کر کئی جھٹکے دیے اور پے در پے اس کے سر پر کئی ٹھوکریں رسید کیں۔ "میرے سامنے تیری یہ ہمت کہ تو آداب شاہی کو اٹھا کر بالائے طاق رکھ دے۔ میں تجھے قتل بھی کرا سکتی ہوں لیکن میں تجھے زندہ رکھوں گی اور خوشحال خان سے منسوب کرکے تیرے ذاتی اور خاندانی پندار کو پارہ پارہ کردوں گی۔"

لڑکی نے خوشحال خان کے ہاتھ کو دانتوں کی گرفت سے آزاد کر دیا اور بے دم ہو کر پڑ رہی۔

لال کنور نے جہاندار شاہ کو حکم دیا "تم باہر جاؤ اور ذوالفقار خان سے صاف صاف کہہ دو کہ وہ اس لڑکی کی وکالت سے باز آجائیں، یہ واپس نہیں جائے گی، بھائی خوشحال خان کے پاس رہے گی۔" اس کے بعد وہ زینت سے مخاطب ہوئی "تمہارا کھانا پینا بند۔ تم اطمینان سے اپنا سر پھوڑتی رہو۔ ہم دوسرے خیمے میں تمہارے اپنے ہی ہاتھوں تمہاری موت کے منتظر ہیں۔"

اس کے بعد لال کنور اور خوشحال خان جہاندار شاہ کے ذاتی خیمے میں چلے گئے اور خود جہاندار شاہ مذبذب اور دو دلا خیمے سے باہر نکل گیا۔ باہر اب بھی شور و غل اور ہنگامہ برپا تھا۔



باہر ذوالفقار خان چند معزز اُمراء کے ساتھ جہاندار شاہ کا منتظر تھا وہ جیسے ہی نمودار ہوا سبھی آداب بجا لائے۔ ذوالفقار خان دو قدم آگے بڑھا اور فیصلہ کن بھاری آواز میں بولا: "غلام تو شہزادے کو ہندوستان کا تاج و تخت دلانے کی کوششوں میں مصروف ہے لیکن شہزادے کے بعض نادان اور کم عقل مقرب اپنی غلط حرکتوں سے گڑھے کھود رہے ہیں۔ اگر شرفاء کی عزت و آبرو ہی محفوظ نہ رہی تو پھر لوگ خلوص و ایثار کہاں سے لائیں گے۔"

جہاندار شاہ وقت کی نزاکت اور ذوالفقار خان کی لطیف دھمکی سے واقف تھا اس نے معصومیت سے دریافت کیا "ہم تمہاری اعانت کے بغیر کچھ بھی نہیں، واقعے کو تفصیل سے عرض کیا جائے اورنگ زیب کا پوتا انصاف سے کام لے گا۔"

امراء کے چہروں پر جہاندار شاہ کے مرتبے اور دبدبے کا کوئی تاثر نہ تھا۔ ذوالفقار خان نے ایک پریشان حال ادھیڑ عمر تاجر کو اشارے سے اپنے قریب بلایا۔ اس کا چہرہ سوجا ہوا تھا اور کپڑے تار تار تھے کہنیوں اور پنڈلیوں سے خون رس رہا تھا۔ وہ ذوالفقار خان کے قریب آکر کھڑا ہو گیا۔ "خوشحال خان اس کی لڑکی سے زبردستی شادی کرنا چاہتا ہے اور شہزادے کے سپاہیوں کی مدد سے اسے اغوا کرلایا ہے،"

یہ میرا پڑوسی ہے غلام کی درخواست ہے کہ ازراہِ خسروانہ لڑکی کو واپس دلایا جائے اور اس رکیک حرکت کے مرتکبین کو قرار واقعی سزا دی جائے۔"

جہاندار شاہ نے اس مظلوم کی طرف دیکھا جو یقیناً خوشحال خاں کی ایما پر اس کے سپاہیوں کے ہاتھوں اپنی لڑکی کو بچاتے ہوئے زخمی ہُوا تھا۔ وہ سر جھکائے خاموش کھڑا تھا۔ شہزادہ سخت مُشکل میں تھا کہ ذوالفقار خاں کو کیا جواب دے۔ کیونکہ اندر اس کی حسین محبوبہ لال کنور پہلے ہی یہ تنبیہہ کر چکی تھی کہ وہ زینت کے سلسلے میں کوئی وعدہ ہرگز نہ کرے۔

ذوالفقار خاں نے دو دِلے اور مذبذب شہزادے کی کیفیت کو بھانپ لیا۔ اُس نے اپنا فیصلہ سُنا دیا "اگر شہزادے کو میری درخواست کے ماننے میں تامّل ہے تو غلام بھی کسی دوسرے دربار میں قسمت آزمائی کی کوشش کرے گا۔"

اور جہاندار شاہ کو ایسا محسوس ہُوا جیسے مغلیہ تاج و تخت دُھوئیں کی طرح فضا میں تحلیل ہوتا جا رہا ہے۔ اس نے مُردہ سی آواز میں کہا: "ذوالفقار خاں تمہیں مایوس نہیں کیا جائے گا۔"

ذوالفقار خاں حاوی تھا "ہم بندگانِ مغلیہ سرکار اسی وقت بامُراد واپس جانا چاہتے ہیں۔"

جہاندار شاہ نے جواب دیا "تمہاری درخواست کا ایک حصّہ اسی وقت منظور کر لیا جائے گا اور اس پر عمل درآمد بھی ہو جائے گا لیکن بقیہ کا فیصلہ بعد میں کیا جائے گا۔"

ذوالفقار خاں اور اس کے ساتھی دوسرے اُمرا سمجھ گئے کہ جہاندار شاہ لڑکی کو تو اسی وقت واپس دلا دینا چاہتا ہے لیکن خوشحال خاں اور اس کے ساتھیوں کو سزا نہیں دینا چاہتا۔ انہوں نے بھی اصرار نہ کیا

تھوڑی دیر بعد زینت اس کے باپ کے حوالے کر دی گئی اور اندر خوشحال خاں بے بسی سے اس کی واپسی پر آنسو بہاتا رہا۔ لال کنور کو ایسا محسوس ہوا جیسے زینت اس کے منہ پر تھوک کر چلی گئی ہو۔ جہاندار شاہ دیر تک حالات، وقت کی نزاکت اور اپنی مجبوری کا رونا روتا رہا۔ اس نے لال کنور کو بتلایا کہ اگر ذوالفقار خاں دل برداشتہ ہو کر اس کا ساتھ چھوڑ دے تو وہ دوسرا دربار جس سے وہ وابستہ ہو جائے گا اس کے جانی دشمن بھائی عظیم الشان کے سوا نہ ہوگا۔ اور جس کا یہ مطلب ہو گا کہ مغلیہ تاج و تخت کی حصولیابی محض سنہری خواب بن کر رہ جائے گا جو شاید کبھی بھی شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے اور پھر وہ خود کبھی بھی ملکۂ عالیہ نہ بن سکے گی۔ لال کنور پہلے تو خوب بپھری اور ناز و غمزے دکھاتی رہی پھر وقت سے سمجھوتا کر لیا۔ اسے اپنے بھائی خوشحال خاں سے سخت شرمندگی ہو رہی تھی کہ وہ جہاندار شاہ ولی عہد سلطنتِ مغلیہ کی محبوبہ ہونے کے باوجود ایک حقیر تاجر کی لڑکی کو جبراً رکھنے میں ناکام رہی تھی۔

اس واقعے کے کئی دن بعد شاہ عالم کا انتقال ہو گیا اور برسرِ اقتدار آنے کے لئے شہزادوں میں کش مکش اور مقابلہ شروع ہو گیا۔ عظیم الشان فائدے میں تھا کیونکہ باپ کی موت کے وقت وہ اس کے قریب ہی تھا اور دورانِ علالت سارے احکامِ شاہی اسی کے قلم اور خواہش سے انجام پا رہے تھے۔ شاہ عالم کی موت سے کئی دن پہلے ہی امرا اور ارکان سلطنت اپنی اپنی پسند کے شہزادوں کی خدمت میں چلے گئے تھے۔

عظیم الشان شاہی خیموں پر قابض تھا۔ جہاندار شاہ کی نظر جب اُدھر جاتی تو دل پر مایوسی غلبہ پا لیتی۔ اور ایسا معلوم دیتا جیسے بغیر جنگ و جدل اور خون خرابے کے تاج و تخت عظیم الشان کے قبضے میں چلے گئے ہیں جب وہ مایوس اور دل شکستہ ہو گیا تو اس نے یہ طے کیا کہ اسے ملتان کی صوبے داری پر ہی اکتفا کرنی چاہیئے ملتان کی صوبے داری اسے دادا اورنگ زیب سے حاصل ہوئی تھی۔ لیکن لال کنور اس کے ارادے سے متفق نہ تھی جہاندار شاہ کی بزدلی اور قناعت سے اس کا ملکۂ عالیہ بننے کا تصوّر خاک میں ملا جا رہا تھا اس لئے اس نے جہاندار شاہ کو ذوالفقار خان کا وعدہ یاد دلایا۔

خوشحال خاں کو اس ہنگامے سے کوئی دلچسپی نہ تھی وہ خود اس معرکے میں کوئی حصّہ نہ لے سکتا تھا لیکن وہ یہ ضرور چاہتا تھا کہ جہاندار شاہ ہندوستان کی قسمت کا مالک بن جائے اس کے برسرِ اقتدار آجانے سے خوشحال خاں اور اس کے خاندان کی بڑی اُمیدیں وابستہ تھیں اس نے اپنی بہن کے مشورے سے یہ بھی طے کیا تھا کہ کسی طرح جہاندار شاہ کامیاب ہو جائے تو جن لوگوں سے انتقام لینا تھا ان میں سرفہرست ذوالفقار خاں کا نام تھا اسے رہ رہ کر زینت کا خیال آتا تھا۔ زینت کے فراق میں اس کا کھانا پینا حرام ہو گیا تھا۔ محبت کو محبت سے جیتا جاتا ہے کہ بجائے محبت اور جنگ میں سب کچھ جائز ہے اس کے نزدیک یہ نقطۂ نظر زیادہ حقیقت پسندانہ تھا زینت کے خاندان کا خیمہ جس جگہ نصب تھا خوشحال خاں اس کے پھیرے کرنا تو ضرور چاہتا تھا لیکن مجبوری یہ تھی کہ وہاں تک پہنچنے

سے پہلے ذوالفقار خان اور اس کے سپاہیوں کا سامنا ہو جانا یقینی تھا۔
دل میں محبت کی آگ تو ضرور روشن تھی لیکن اس آگ میں عاقبت نا اندیشانہ قوتِ عمل اور ارادوں کی توانائی موجود نہ تھی۔ اس نے اپنے آدمیوں کو چوری چھپے یہ پتا لگانے بھیجا کہ زینت کے خیمے کے آس پاس نگرانی یا چوکسی کا کیا حال ہے تو معلوم ہوا کہ وہاں سے بچ کر نکل آنا ناممکن ہے ذوالفقار خان کے آدمی بھیڑیوں کی طرح اپنے شکار کی بو سونگھتے رہتے ہیں، لے دے کے بس ایک ہی ترکیب امید افزا تھی، وہ یہ کہ کسی طرح جہاندار شاہ کو برسر اقتدار آ جانا چاہیئے لیکن اس کے طنبورے بجانے والے ہاتھ جہاندار شاہ کی کسی عملی مدد سے قاصر تھے۔ وہ بڑی دیر تک اپنے خاندان والوں کے خیموں کے آس پاس گھومتا پھرتا رہا اس کی نظریں بار بار شاہی خیموں کی طرف اٹھ جاتیں جہاں عملاً عظیم الشان شاہ عالم کی جگہ لے چکا تھا۔ اس کے خیمے سے نکلنے اور اندر جانے والوں کا ہجوم حریفوں کے حوصلے پست کر دینے کے لئے کافی تھا دوسری طرف بہت دور مغرب میں خجستہ اختر اور رفیع القدر کے خیمے نصب تھے یہ دونوں جہاندار شاہ کے عظیم الشان سے بھی چھوٹے بھائی تھے خوشحال خاں نے دیکھا کہ وہاں بھی آدمیوں کا ہجوم ہے لیکن اس ہجوم میں عظیم الشان کے آدمیوں جیسا جوش و خروش نہ تھا۔ اس کے برعکس جب اس نے جہاندار شاہ کی حیثیت پر غور کیا تو اسے بڑی مایوسی ہوئی کیونکہ یہاں ہر سمت مایوسی اور اداسی کا قبضہ تھا۔ اس نے سوچا کہ کہاں گیا وہ ذوالفقار خان جو کہتا تھا کہ زینت کو واپس کر دو۔ میں تمہیں ہندوستان کا تاج و تخت لا دوں گا۔ ذرا سی دیر کے لئے اس نے یہ بھی سوچا کہ لال کنور جہاندار شاہ کے بجائے اگر عظیم الشان کے دل کو جیت لیتی تو کتنا اچھا تھا لیکن خوشحال خاں یہ بھول گیا تھا کہ جہاندار شاہ کی قدر و قیمت اس کے باپ شاہ عالم کی نظر سے اس خوبصورت بلا اپنی بہن لال کنور ہی کی وجہ سے تو گر گئی تھی۔ اگر لال کنور عظیم الشان کے پہلو میں ہوتی تو یقیناً آج جہاندار شاہ کی جگہ عظیم الشان ہوتا اور عظیم الشان کی جگہ جہاندار شاہ کو حاصل ہوتی اس کے خیال میں اب بھی اس کا موقع تھا کہ وہ شکست خوردہ اور ناکام جہاندار شاہ سے پیچھا چھڑا کے عظیم الشان کے دل میں رسائی حاصل کرنے کی کوشش کرے۔

وہ چوری سے اپنی بہن سے ملا اور اپنی تجویز کا بے تکلفی سے اظہار کر دیا۔ لال کنور بھی سوچ میں پڑ گئی اور تھوڑی دیر تک خیمے کے پردے پر بنی ہوئی مچھلی کی تصویر کو گھورتی رہی، خوشحال خان اس کے سکوت سے یہ سمجھا کہ شاید لال کنور رضامند ہو رہی ہے، اس نے مزید ڈھارس بندھائی۔ "تمہیں اس سلسلے میں کچھ بھی نہ کرنا پڑے گا۔ میں خود کچھ کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔"

لیکن لال کنور کو اپنے بھائی کی اس تجویز سے اختلاف تھا۔ کہنے لگی "وقت کا انتظار کرو۔ دیکھو مستقبل جہاندار شاہ کے حق میں کیا فیصلہ صادر کرتا ہے۔" لیکن وہ پری پیکر مستقبل کے اندیشوں سے خوفزدہ بھی تھی۔

ٹھنڈی سانس بھر کر بولی۔ "اگر قسمت میں یہی لکھا ہے کہ جہاندار شاہ پورے
ہندوستان کے بجائے ملتان کی صوبے داری پر اکتفا کرلے تو میں بھی اس
پر قناعت کرلوں گی میں جہاندار شاہ کی جگہ کسی اور کو نہیں دے سکتی۔
مجھے اس سے محبت بھی تو ہے۔"

خوشحال خاں کو غصہ آگیا لیکن اس غصے کا اظہار نہ کرسکا۔
افسوسناک لہجے میں بولا۔ "بہرحال میں ایک بھائی کی حیثیت سے ہمیشہ یہی
چاہوں گا کہ تم خوش و خرم رہو اور ملک کی سب سے بڑی شخصیت تمہاری
محبت کی اسیر رہے۔"

خوشحال خاں ناامید اب بھی نہ تھا اس کا خیال تھا کہ دو چار
مزید کی کوشش سے یہ کام ضرور انجام پاجائے گا۔



ہراساں اور بدحواس جہاندار شاہ دیر تک عظیم الشان کے کرّوفر کا
مشاہدہ کرتا رہا۔ عظیم الشان کے اردگرد فوجیوں کے عظیم اجتماع اور گھڑسواروں
کے گرد و غبار نے اس کے حوصلے پست کردیئے تھے۔ اسی عالم میں ذوالفقار
خان نے اس سے ملاقات کی جہاندار شاہ کی ہمت بندھی، ذوالفقار خان
کے ساتھ اس کے چند جاں نثار بھی تھے، وہ خیمے کے باہر ہی رہ گئے۔ اور
جہاندار شاہ اسے عزت و تکریم سے اس خیمے میں لے گیا جو صلاح مشوروں
کے لئے مخصوص تھا۔

ذوالفقار خان کو بس چند ہی باتیں کرنا تھیں، اس نے دریافت
کیا۔ "ان حالات میں آپ کا کیا ارادہ ہے؟"

جہاندار شاہ نے افسردگی سے کہا۔ "فی الحال ہم بالکل مجبور اور مایوس ہیں۔"

"کیوں؟" ذوالفقار خان بولا۔ "مجبوری اور مایوسی کی وجہ؟"

"ہمارے پاس زر و مال کی کمی ہے۔ ہم سپاہیوں کی تنخواہیں تک
نہیں دے سکتے۔ اور عظیم الشان کو خوش قسمتی سے سب کچھ حاصل ہے۔ ہم
چاہتے ہیں کہ ملتان چلے جائیں اور وہاں کے وسائل سے فوج اکٹھا کریں
اور اس سے عظیم الشان کا مقابلہ کریں۔"

"گستاخی معاف، یہ فضول سی ترکیب ہے!" ذوالفقار خان کی آواز
میں بلا کی خوداعتمادی تھی۔ "جو کچھ ہونا ہے ابھی ہوگا۔ آپ سارے کام مجھ پر
چھوڑ دیں۔ میں دولت سپاہی اور جنگ سے متعلق جملہ وسائل کا خود بندوبست
کروں گا۔"

جہاندار شاہ کے مردہ دل میں جان سی آگئی۔ "پھر کب؟"

[illegible]
خواہش معلوم کرنے آیا تھا!"

جہاندار شاہ نے پوچھا۔ "مال و زر کا کس طرح بندوبست کروگے؟"

"یہ میرا کام ہے۔" ذوالفقار خان نے کہا۔ "جو کچھ میرے پاس ہے
میں اس وقت آپ کی خدمت میں بھیجے دے رہا ہوں، آپ کے اقبال سے
میرے اردگرد جاں نثاروں کی بھی کمی نہیں، لیکن کسی فوجی اقدام سے پہلے
ہمیں چند تدبیریں ضرور بروئے کار لانا پڑیں گی۔"

"کون سی تدبیریں؟" جہاندار شاہ اب بھی پریشان تھا اور گفتگو
میں اگر مگر آنے سے خوفزدہ ہوجاتا تھا۔

ذوالفقار خان نے کہا۔ "آپ کے دونوں چھوٹے بھائی رفیع القدر
اور خجستہ اختر بھی عظیم الشان کی خودسری اور بدماغی سے خوش نہیں ہیں،
ہمیں ان کا اعتماد بھی حاصل کرنا چاہیئے۔"

"لیکن کیا وہ دونوں ہمارا ساتھ دینے پر رضامند ہوجائیں گے؟"
جہاندار شاہ کو کسی بات کا یقین ہی نہ تھا۔

ذوالفقار خان نے پرامید آواز میں کہا۔ "انہیں راضی کرنا میرا کام
ہے میں انہیں رضامند کرلوں گا۔"

جہاندار شاہ نے ایک ممکنہ خطرے کی نشاندہی کی۔ "لیکن یہ بھی
تو ممکن ہے کہ عظیم الشان ہمیں کسی بات کا موقع ہی نہ دے اور اچانک
حملہ کرکے ہمیں تباہ و برباد کردے!"

"اگر اس نے ایسا کیا تو غلام اس کا حل بھی ڈھونڈ نکالے گا لیکن
میں جانتا ہوں کہ شہزادہ عظیم الشان ذوالفقار خان سے خوفزدہ ہے
اور جب تک میں آپ کی پشت پر موجود ہوں، عظیم الشان آپ پر حملہ
کی جرأت نہیں کرسکتا۔"

جہاندار شاہ کو اس پر یقین تو نہ آیا لیکن ذوالفقار خان کے اس
خیال میں سو فیصد صداقت تھی۔

اِدھر سے فارغ ہوکر جہاندار شاہ ذوالفقار خان کو خیمے کے دروا
تک چھوڑنے گیا۔ دل میں یاس اور تکدر کا قبضہ تھا اور وہ غیریقینی کیفیت
کا شکار تھا اسے سکون کی ضرورت تھی، اور یہ سکون لال کنور کے سوا کہیں
اور ہرگز نہ مل سکتا تھا وہ ذوالفقار خان کو رخصت کرکے سیدھا لال کنور
کے پاس پہنچ گیا۔ لال کنور اس وقت بڑے ترنگ میں تھی، باہر کیا ہورہا
اور بدبختی کی کتنی گہری اور ہولناک گھٹائیں ان کے سروں پر چھائی ہو







نغمیں اسے کسی بات کی نہ تو پرواتھی نہ فکر، جہاندار شاہ جب اندر داخل ہوا تو وہ نہایت عمدہ اور دل نشین دُھن میں گا رہی تھی۔

"دوستو! تم مجھے یہ مشورہ مت دو کہ میں راگ رنگ اور رقص و سرود سے توبہ کرلوں یہ تو روح کی غذا ہیں، جسم جو روح کے بغیر کچھ بھی نہیں جب تم مستعدی سے اس کے لئے غذا فراہم کرتے ہو تو روح اپنی غذا سے کیوں محروم رہے۔

تم کہتے ہو، رقص و موسیقی انسان کو غافل کر دیتے ہیں اور ان کے نشے میں انسان مدہوش ہو جاتا ہے مجھے تمہارے اس خیال سے انکار نہیں لیکن یہ بھی تو سوچو کہ جو سرور مدہوشی میں ہے ہوشیاری میں کہاں؟

قسمت نے ہمیں ایک ایسے دوراہے پر کھڑا کر دیا ہے جس کے ایک طرف موت کی اتھاہ گہرائی اور گمنامی کے غار ہیں اور دوسری طرف زندگی کی جملہ بازیابیاں

مسرتیں اور خوشیاں ہیں، شہرت اور ناموری ہے اور اس دوسری راہ کے ہم اسی لئے تو امیدوار ہیں کہ ہم اپنی دوروزہ ہستیِ ناپائیدار کی لذتیں نچوڑ لیں۔

ہم مرنے سے پہلے مرنے کے قائل نہیں ہیں جب مرنا ہے مر جائیں گے لیکن مرنے کے خوف سے مرتے رہنے سے حاصل؟

ساقیا! ایسی شراب پلا جو ہمیں فکرِ امروز اور غمِ فردا سے غافل کر دے۔

کیا امروز ہے اور کیا فردا؟ یہ سب جینے جی کے جھگڑے ہیں کوئی عقلمند ان بکھیڑوں میں کیوں پڑے؟"

جہاندار شاہ چُپ چاپ ایک گوشے میں کھڑا سنتا رہا اس کے مایوس اور ہراساں دل پر لال کنور کی دلنشیں اور قیامت خیز آواز اور اشعار کے مفہوم نے یہ اثر کیا کہ رہی سہی ہمت بھی رخصت ہوگئی وہ بے ساختہ آگے بڑھا اور خیمے میں موجود خواصوں کی موجودگی کا خیال کئے بغیر لال کنور کو اپنی آغوش میں لے لیا اور بے تحاشا بوسوں کی بارش کر دی۔ خواصیں خود ہی اِدھر اُدھر چلی گئیں۔

باہر جنگ کے بادل منڈلا رہے تھے اور اندر اورنگ زیب کا پوتا لال کنور کو آغوش میں لئے فکرِ امروز اور غمِ فردا سے نجات حاصل کرنے کی کوشش میں لگا ہوا تھا۔

یکا یک ڈھول تاشوں کی آواز سے پوری فضا گونج گئی یہ نوبت تھی جو کسی شہزادے کی رسمِ تاجپوشی کے بعد بجائی جا رہی تھی، جہاندار شاہ اپنا کام ذوالفقار خان کے حوالے کر کے بے نیاز ہو گیا تھا۔ وہ بدستور لال کنور کے ساتھ دادِ عیش دیتا رہا۔ ذوالفقار خان نوبت کی آواز سن کر باہر نکلا اور عظیم الشان کے خیموں کی طرف ٹکٹکی لگائے دیکھتا رہا۔ اس نے فی الفور چند سپاہیوں کو دریافتِ حال کے لئے آگے روانہ کر دیا اور ذرا سی دیر بعد ہی تصدیق ہو گئی کہ عظیم الشان کی رسمِ تاجپوشی ادا کی جا چکی ہے اور امرا اس کی خدمت میں نذرانے پیش کر رہے ہیں۔

اب پانی سر سے اُونچا ہو چکا تھا۔ وہ اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ شہزادہ رفیع القدر اور خجستہ اختر سے ملنے چلا گیا۔ دونوں شہزادے بڑے تپاک سے ملے اور اس لائق اور بہادر آدمی سے کچھ امیدیں وابستہ

کرلیں۔ ان دونوں کو بھی عظیم الشان کی رسم تاجپوشی کی ادائیگی سے سخت اختلاف تھا۔ چنانچہ جب ذوالفقار خان نے جہاندار شاہ کے حق میں ان دونوں کا اتحاد اور تعاون چاہا تو وہ دونوں اس شرط پر آمادہ ہوگئے کہ جہاندار شاہ بڑا بھائی ہونے کی وجہ سے بادشاہ بنایا جائے گا اور سکّے اور خطبے میں اسی کا نام استعمال ہوگا۔

رفیع القدر کو کابل، کشمیر، ملتان، ٹھٹھے اور بھکر کے صوبے مل جائیں گے دریائے نربدا سے لے کر راس کماری تک خجستہ اختر کی حکومت رہے گی۔

عظیم الشان کی شکست کے بعد جو مال و دولت ہاتھ آئے گا وہ تینوں بھائی آپس میں برابر تقسیم کرلیں گے اور ذوالفقار خان ان تینوں حکمرانوں کا وزیر ہوگا۔

کیونکہ تینوں شہزادے اس لائق شخص کی خدمات سے محرومی کو اپنی بدقسمتی تصور کرتے تھے۔

ذوالفقار خان ان دونوں کو لے کر جہاندار شاہ کے پاس پہنچا اور اسے لال کنور کی آغوش سے مجلس مشورت و معاہدہ گاہ میں آنے پر مجبور کردیا گیا۔ جب تینوں شہزادے ایک جگہ جمع ہوئے تو ذوالفقار خان کے طے شدہ معاہدے کو قرآن پاک پر لکھا گیا۔ تینوں نے معاہدے کی پابندی کے لئے قرآن پاک کی قسمیں کھائیں کہ تا زیست اس پر قائم رہیں گے۔

بعد میں اس معاہدے کی ایک شرط پر خود ذوالفقار خان کو بڑی ہنسی آئی۔ اس نے اپنے دوستوں سے کہا۔ "تین بادشاہوں کا ہونا تو کوئی تعجب خیز بات نہیں ہے لیکن وزیر ایک اور بادشاہ تین؛ یہ ایک نادر بات ہے۔"

دونوں بھائیوں کی شرکت اور ذوالفقار خان کی خوش تدبیری نے پانسہ ہی پلٹ دیا۔ یہ خبر آناً فاناً چاروں طرف پھیل گئی اور سپاہیوں کا جم غفیر ذوالفقار خان کی خدمت میں جمع ہونے لگا۔ مال و دولت کی کمی دونوں شہزادوں نے پوری کردی تھی۔ عظیم الشان رسم تاجپوشی ادا کرا کے حالات کا گہری نظر سے جائزہ لے رہا تھا اور ذوالفقار خان سے خوفزدہ پس و پیش میں مبتلا تھا۔ اس کے امرا حملے کی ترغیب دے رہے تھے لیکن وہ خود ایسا کرتے ہوئے ڈر رہا تھا۔ یہاں تک کہ اس کے بے جا تساہل اور تذبذب کے بعد جب دونوں طرف کے لشکر آمنے سامنے ہوتے تو عظیم الشان کے پاس تیس ہزار سوار اور تیس ہزار پیادے تھے اور دوسری طرف ذوالفقار خان کے زیر کمان پچاس ہزار سوار اور ساٹھ ہزار پیادہ فوج تھی۔ حالات نے پلٹا کھایا تھا اور جب ان دونوں فوجوں میں تصادم ہوا تو قسمت جہاندار شاہ پر مہربان ہوگئی۔

عظیم الشان ہاتھی پر سوار اپنی فوج کے دل بڑھا رہا تھا لیکن اسی وقت طوفان گرد و باد اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کا رُخ عظیم الشان کے لشکر کی طرف تھا۔ راوی کے ساحل کی ریت فوجیوں کی آنکھوں میں گھس گئی اور وہ سب گرد و غبار کے طوفان میں روپوش ہوگئے۔ توپوں کی گھن گرج نے سماعت کو ناکارہ کردیا تھا۔ عظیم الشان کے ساتھی جنگ کے نتیجے سے مایوس اور خوفزدہ ہوگئے لیکن خود عظیم الشان کی رگوں میں تیموری خون دوڑ رہا تھا۔ اس کے ایک مخلص امیر نے اسے مشورہ دیا کہ وہ ہاتھی کو چھوڑ دے اور گھوڑے کی پشت پر آجائے لیکن اس ہنگامۂ دار و گیر میں اس کا موقع ہی نہ تھا۔ اسی عالم میں ایک گولے کی آگ سے اس کے تکیے میں آگ لگ گئی۔ عظیم الشان نے اس تکیے کو نیچے پھینک دیا۔ اس کے ایک مخلص امیر نے سسکیاں بھرنی شروع کردیں وہ بالکل مایوس ہوچکا تھا۔ عظیم الشان کے خیموں کا مال و متاع ذوالفقار خان کے سپاہی لوٹنے میں مصروف تھے۔

عظیم الشان کے ایک دوست نے مشورہ دیا۔ "حضور! اب جنگ فضول ہے آپ بنگال بھاگ چلیں وہاں اپنی قوت جمع کرکے دوبارہ پھر مقابلہ کیا جائے گا۔"

عظیم الشان نے حقارت کے ساتھ اس تجویز کو مسترد کردیا۔ "دارا شکوہ اور شجاع کا حشر ہمارے سامنے ہے شکست اور پسپائی کے بعد ہمیشہ کے لئے گمنامی میں چلا جانا یقینی ہے۔" اس کے بعد عظیم الشان نے دریافت کیا۔ "تمہارے پاس کتنے سپاہی ہیں؟"

دوست نے جواب دیا۔ "کُل بیس سوار بقیہ دشمنوں کی صفوں میں چلے گئے یا ہلاک ہوگئے!"

"بہت خوب!" عظیم الشان نے بے نیازی سے بولا۔ "اس میں سے دس مجھے دیدو اور دس تم اپنے ساتھ رکھو ہم دونوں کیوں نہ آخری داؤ لگا دیں۔ میں ان دس کی مدد سے جہاندار شاہ کو قتل کردینے کی کوشش کرتا ہوں اور تم اپنے دس سپاہیوں کی مدد سے رفیع القدر اور خجستہ اختر کو ہلاک کردینے کی کوشش کرو۔"

ابھی عظیم الشان کا آخری فقرہ ادا ہی ہوا تھا کہ ایک گولا ہاتھی کے خرطوم پر لگا۔ ہاتھی چنگھاڑتا ہوا ایک طرف بھاگ کھڑا ہوا فیلبان نیچے گر گیا اور اس کا مورچھل بردار رسیوں کے سہارے فوراً نیچے اتر گیا اور راہ فرار اختیار کی۔ ہاتھی کو روکنے کی بھرپور کوششیں ہوئیں لیکن وہ دریائے راوی میں اتر گیا جو دوست اور دشمن عظیم الشان کا پیچھا کر رہے تھے جب وہ دریا کے کنارے پہنچے تو ہاتھی عظیم الشان سمیت اس کی تہہ میں بیٹھ چکا تھا اور اوپر سطح آب پر غیر معمولی بلبلے دکھائی دے رہے تھے۔



جب جہاندار شاہ اور ذوالفقار خان میدان جنگ میں اپنی قسمتوں کے فیصلوں میں الجھے ہوئے تھے تو خوشحال خاں موقع غنیمت دیکھ کر بہن کی ایماء پر زینت کی تلاش میں نکل گیا۔ ساز وسامان کی یہ فوج دس آدمیوں پر مشتمل تھی۔ زینت کا باپ خیمے میں موجود تھا خوشحال خاں اس سے ملا اور میٹھی میٹھی باتیں کرنے لگا۔ اس نے ہر طرح یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ اس سے شادی کر کے زینت بہت عیش کرے گی۔ اس نے یہاں تک لالچ دیا کہ اگر جہاندار شاہ فاتح رہا تو وہ اس سے کسی صوبے کی صوبے داری حاصل کرے گا ان دنیاوی جاہ و ثروت کی حصولیابی کے بعد لوگ اس کی خاندانی کم تری کو بھول جائیں گے لیکن زینت کا باپ پھر بھی نہ پسیجا اس نے درشت لہجے میں کہا۔ "یہ پیوند بالکل انمیل اور بے جوڑ رہے گا۔"

خوشحال خاں نے دھمکی دی۔ "او بڈھے تاجر! تو مجھے کوئی معمولی آدمی نہ سمجھ، میری بہن عنقریب ہندوستان کی ملکہ ہونے والی ہے۔ یاد رکھ اس وقت تجھے جیسی ذلت کا سامنا کرنا پڑے گا اس کا ابھی تو تصور تک نہیں کر سکتا۔ اس وقت تیرے سارے حمایتی بھی ترک دم فرار ہو جائیں گے!"

زینت کے باپ نے تنگ آکر جواب دیا۔ "زینت اپنے ماموں کے لڑکے سے منسوب ہے!"

"جھوٹ" خوشحال خان نے ترش روئی سے کہا۔ "اچھا تم مجھے ایک بار زینت سے ملاؤ میں خود اس سے بات کروں گا اگر وہ انکار کرے گی تو میں پھر کبھی تمہیں تنگ نہ کروں گا۔"

زینت کے باپ کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ "اے نوجوان تو اپنی حد میں رہ تو حد سے تجاوز کر رہا ہے!"

خوشحال خان نے اپنے آدمیوں کو اشارہ کیا وہ ایک دم زینت کے باپ پر ٹوٹ پڑے اسے شور و غل کا بھی موقع نہ دیا گرا کر بے بس کر دیا اور منہ میں کپڑا ٹھونس دیا۔ اس کے ساتھی باہر ہی رہے اور خوشحال خان فاتحانہ شان سے زنانخانے میں چلا گیا۔ اندر زینت اور اس کی ماں اپنی شکلیں چھپانے لگیں۔

خوشحال خاں نے دھوکا دیا۔ "اب چھپنے چھپانے سے کچھ حاصل نہیں باہر جہاندار شاہ کے سپاہی تم سب کی گرفتاری کے لئے کھڑے ہیں لیکن گرفتاری سے پہلے مجھے موقع دو کہ میں زینت سے چند باتیں کر لوں اس کے بعد زینت کے فیصلے کے مطابق کوئی قدم اٹھایا جائے گا۔"

سپاہیوں کا ذکر سن کے دونوں کے ہوش اڑ گئے۔ زینت نے چیخ کر سوال کیا۔ "ہمارے باوا جان کہاں ہیں؟"

خوشحال خاں اُن کے پاس پہنچ چکا تھا۔ سپاہیوں کی جرأت نہیں! زینت کی سمجھ میں اچانک معلوم نہیں کیا بات آئی کہ وہ ایک دم سنجیدہ ہوگئی۔ اس نے اپنی ماں سے کہا۔ "اماں آپ سامنے سے ہٹ جائیے آپ کی بے پردگی ہوگی۔ میں خود اس سرکش سے فیصلہ کن باتیں کئے لیتی ہوں۔"

ماں نے حیرت اور سوالیہ نظروں سے بیٹی کو دیکھا۔ بیٹی نے مزید تشفی کر دی۔ "آپ بے فکر رہیں، میں اپنی ناموس کی حفاظت کرنا خوب جانتی ہوں۔" اس کے بعد وہ خوشحال خاں سے مخاطب ہوئی پر "پوچھا" تو بات چیت میں کتنا وقت لے گا؟"

خوشحال خاں پر فتحمندی کا نشہ چڑھ رہا تھا ناک بھوں چڑھا کر بولا۔ "یہ تمہارا اندازِ گفتگو کیا ہے؟"

زینت نے رعونت سے جواب دیا۔ "ہم ہر ایک سے اس کے شایانِ شان بات کرنے کے آداب سے واقف ہیں۔"

"تم اپنے مہمانوں سے اسی طرح بات کرتی ہو؟" خوشحال خاں نے سوال کیا۔

"تم مہمان کب ہو؟" اس نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ "چہ خوب تم اپنے تئیں مہمان تصور کرتے ہو، چور اُچکے گھس گئے۔"

خوشحال خاں گرج کر بولا۔ "دیکھو ان فضول اور ہتک آمیز باتوں میں وقت نہ ضائع کرو، میں تم سے چند باتیں کرنا چاہتا ہوں میرا آئندہ اقدام تمہاری گفتگو کی روشنی میں ہوگا۔"

زینت ایک طرف جاتی ہوئی بولی۔ "ٹھہرو۔ میں ابھی آتی ہوں پھر تجھ سے اطمینان سے گفتگو کروں گی۔"

"اور تجھ سے" پر ایک بار پھر اس کے جسم میں آگ لگ گئی اس نے یہ طے کر لیا تھا کہ کچھ بھی ہو جان رہے یا جائے اس ضدی سرکش خاندان کو نیچا دکھا کے رہے گا۔ ذرا سی دیر بعد ہی زینت واپس آگئی چمکتا ہوا خنجر اس کے ہاتھ میں تھا۔ خوشحال خاں یہ سمجھا کہ لڑکی اس پر حملہ کرنے آئی ہے گھبرا کر پوچھا۔ "اس خنجر کی کیا ضرورت تھی۔ خدانخواستہ میں کسی بری نیت سے تو یہاں آیا نہیں ہوں!"

زینت نے کہا۔ "بات کر، بکواس بند کر، یہ خنجر تو اس لئے لائی ہوں کہ اگر تو کسی قسم کی زیادتی یا دراز دستی سے کام لے تو اس سے تجھے ہلاک کر کے خود بھی جان دے دوں، یہ زہر میں بجھا ہوا ہے!"

خنجر کی نوک خوشحال خاں ہی کی طرف تھی، اس نے نوک کی طرف اشارہ کیا۔ "اسے اپنی طرف کرو۔"

زینت نے طنز کیا۔ "کیوں؟ اس سے ڈر لگتا ہے۔ کیا تمام مرد تیری ہی طرح ہوتے ہیں۔ کیا تیرے خاندان میں لڑکیوں کی کمی ہے جا اپنے ہی خاندان میں کسی لڑکی کا ہاتھ پکڑ، ہم اپنے خاندان کے لئے سر کٹانا جانتے ہیں۔"

خوشحال خاں کچھ بدحواس ہو رہا تھا۔ زینت نے خنجر کی دھار کو انگلی پھیر کر جانچا۔

خوشحال خاں کا لہجہ ایک دم بدل گیا۔ "زینت! میں تم سے محبت کرتا ہوں، میں اس وقت اپنے دور کا سب سے بڑا طنبورہ نواز ہوں اس کے علاوہ بعض دوسرے ساز بھی بجانے میں اپنا جواب نہیں رکھتا۔ میں اس دور کا بے مثل کلاونت ہوں۔" پھر کچھ دم لے کر بولا۔ "اور تم اس کو بھی چھوڑو، لال کنور میری حقیقی بہن ہے جو عنقریب ملکۂ ہند بننے والی ہے کیا تمہیں اب بھی میرے معزز ہونے میں شبہ ہے؟"

زینت کے ہونٹوں پر تلخ مسکراہٹ ابھری اور فوراً ہی غائب ہوگئی۔ "تو نہ صرف خاندانی طور پر کمتر ہے بلکہ چور اُچکا اور اٹھائی گیرا ہے تو گدھا ہے اور گدھا بادشاہ کی سواری میں رہے یا کسی اور کی رہے گا گدھا ہی، رانوں کا تصور سیاہی کے سوا ہرگز نہیں ہوگا۔ زنگی کو کتنا ہی نہلاؤ دھلاؤ وہ رہے گا زنگی کا زنگی ہی۔ تو اپنے خاندان کے لئے باعث ننگ ہے۔ تیرے اندر غیرت کی کمی ہے۔"

خوشحال خاں کا مارے غصے کے برا حال ہو رہا تھا لیکن ذہن میں خنجر کا ڈر بھی غالب تھا۔ یہ لڑکی کچھ خونخوار سی لگتی تھی جو ذرا سی چیں بہ جبیں ہو کر اپنا خنجر پیٹ میں اتار دے گی، خوشحال خاں نے سوچا کہ ایسا عشق جو جان لے کر ٹلے فضول ہے، کیا ساری دنیا میں صرف زینت ہی اتنی حسین ہے جس سے محبت کی جائے۔ دوسری بہت ساری لڑکیاں بھی تو ہیں اس نے سوچا کہ اگلا عشق کسی ایسی لڑکی سے کرنا چاہئے جو ہتھیار کے استعمال کا شوق نہ رکھتی ہو۔

"اچھا" خوشحال خاں مایوسی سے بولا۔ "تو تم مجھ سے محبت نہیں کر سکتیں؟"

"پھر وہی بکواس!" زینت گرم ہو گئی۔ "اس موضوع پر تو کوئی بات ہی نہ کرو۔"

خوشحال خاں نے ایک بار پھر خنجر پر نظر ڈالی اور دل میں سوچا کہ اگر جھپٹا مار کر اسے چھین لیا جائے تو کیا مضائقہ ہے؟ لیکن دوسرے لمحے یہ سوچ کر باز رہا کہ خنجر زہر میں بجھا ہے اگر چھین جھپٹ میں وہ اس کے ہاتھ میں کہیں چبھ گیا یا وہ زخمی ہو گیا تو اس کی موت یقینی ہو جائیگی؛ اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "جبر نہیں ہے" وہ کہنے لگا "تم مجھ سے محبت نہیں کر سکتیں تو مجبوری ہے میں تمہیں مجبور بھی نہیں کر سکتا۔"

وہ آہستہ آہستہ خیمے کے دروازے کی طرف بڑھا جب وہ بالکل دروازے پر پہنچ گیا اور اسے یقین ہو گیا کہ اب اگر زینت دوڑ کر بھی اس پر حملہ کرنا چاہے تو ناکام رہے گی ہمت کر کے کہہ ہی دیا۔ "زینت جا تو رہا ہوں' لیکن یاد رکھنا میں بھی خوشحال خاں ہوں' تمہاری گستاخیوں کا بدلہ نہ لوں تو نام بدل دینا۔"

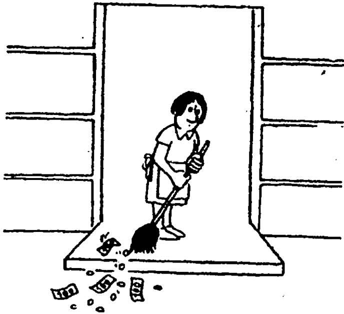
زینت تیزی سے اس کی طرف لپکی' خوشحال خاں بھاگ کر باہر نکل گیا وہاں جنگ سے فارغ ہونے والے سپاہیوں کی واپسی شروع ہو چکی تھی' خوشحال خاں نے اپنے ساتھیوں کو حکم دیا کہ بوڑھے تاجر کو چھوڑ دیا جائے جس کی فوراً تعمیل کی گئی' وہ اپنے آدمیوں سمیت وہاں سے فرار ہو گیا۔

زینت اس کے جاتے ہی پیٹ پکڑ پکڑ کے ہنستی رہی' اسے خوشحال خاں کی بزدلی پر بڑی ہنسی آ رہی تھی۔

جب لال کنور نے یہ ساری روداد سُنی تو اسے اپنے بھائی پر بڑا غصہ آیا اور اس نے چند مغلظات سنا کر بھائی کو یہ طعنہ دیا کہ "تم نے بزدلی دکھا کر اپنے خاندان کی عزت کو بٹا لگا دیا ہے۔"

جب ذوالفقار خان کو خوشحال خان کی تازہ گستاخی کا علم ہوا تو وہ نظر انداز کر گیا کیونکہ یہ وقت ایسا نہ تھا جو ان فضول باتوں میں ضائع کر دیا جائے لیکن اس نے یہ ضرور سوچا کہ جہاندار شاہ کو سختی سے تہدید کی جائے گی کہ وہ خوشحال خان کی گوشمالی کر دے۔

جہاندار شاہ کی فتحمندی نے اس کا دماغ خراب کر دیا تھا چنانچہ جب مال غنیمت اکٹھا ہوا اور اس کی تقسیم کا وقت آیا تو کیسا قرآن' کہاں کا معاہدہ اور شرائط' ساری ہی باتیں بھلا دیں' اب وہ معاہدے والے صوبوں کی حکومت بھی اپنے دونوں بھائیوں کو نہیں دینا چاہتا تھا۔ خجستہ اختر نے بھائی کے خلاف بغاوت کر دی اور کئی دن کی لڑائی کے بعد ذوالفقار خان کی حکمت عملی سے خجستہ اختر کو شکست ہو گئی اور وہ قتل کر دیا گیا۔ بعد میں دوسرا بھائی رفیع القدر بھی مقابلے پر آ گیا اور یہ بھی



موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ جب چاروں طرف سے فتح کے شادیانے بجے اور لوگ جہاندار شاہ کی خدمت میں مبارکبادیں دینے آئے تو لوگوں کا وجود اس کے لئے مصیبت بن گیا۔ وہ جلد از جلد لال کنور کے پاس پہنچ جانا چاہتا تھا۔ اور اس فتح کی اصل خوشی اس کی آغوش میں منانا چاہتا تھا۔ وہ اپنے جاں نثاروں کی پروا کئے بغیر اندر چلا گیا۔ وہاں فتح کی خوشی میں ایک ہنگامہ برپا تھا، سارے تکلفات اور شاہی آداب بالائے طاق رکھ دیئے گئے تھے ہاؤ ہو اور رقص و موسیقی کا ایک سیلاب آیا ہوا تھا لال کنور کے کنبے کے سارے افراد اچھل کود اور ہاتھا پائی میں مشغول تھے یہاں تک کہ جب جہاندار شاہ اندر پہنچا تو کسی نے اس پر توجہ ہی نہ دی' لال کنور بھی نشے میں دُھت تھرک رہی تھی۔

جہاندار شاہ آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتا لال کنور کی طرف بڑھا وہاں تک پہنچتے پہنچتے کئی متوالوں نے اسے سخت دھکے دیئے جس سے وہ لڑکھڑا گیا لیکن اس نے انہیں منع نہیں کیا۔ یہ سارے ہی اس کی لال کنور کے عزیز رشتے دار تھے اور لال کنور اسے دُنیا کی ہر شے سے زیادہ عزیز تھی۔ لال کنور نے جیسے ہی اسے دیکھا بے ساختہ اس سے لپٹ گئی اور اس پر بوسوں کی بارش کر دی' نشے میں دُھت دوسروں نے بھی دیکھا دیکھی لال کنور کی تقلید کی اور پھر اس حمام میں سبھی ننگے ہو گئے۔

جہاندار شاہ لال کنور کو لے کر دوسرے خیمے میں چلا گیا۔ آج وہ اپنے آپ کو دُنیا کی سب سے زیادہ خوش قسمت عورت سمجھ رہی تھی وہاں پہنچتے ہی وہ تلملا کر مچھلی کی طرح تڑپ کر جہاندار شاہ کی آغوش سے

نکل گئی۔ "آج میں تمہیں ترساؤں گی اور نہیں اس وقت تک اپنے پاس نہ آنے دوں گی جب تک تم مجھ سے چند وعدے نہ کر لو گے!"

جہاندار شاہ نے ہنستے ہوئے دوڑ کر اسے پکڑنا چاہا لیکن وہ قابو میں نہ آئی اور دھوکا دے کر دوسری طرف چلی گئی، جہاندار شاہ یہ کہتا ہوا اس کی طرف دوڑا "ہم تمہاری ہر خواہش پوری کر دیں گے تم فکر مت کرو۔"

"اوں ہوں!" لال کنور کو شوخی سے ستانے میں مزہ آ رہا تھا۔

"پہلے ایک ایک بات پر وعدہ کرو۔"

جہاندار شاہ نے کہا "تمہیں ہماری بات کا یقین نہیں، یہ تو خوشی کا موقع ہے، ذرا باہر جھانک کر تو دیکھو ہمارے کتنے ہی جاں نثار ہمیں مبارک باد دینے آئے ہیں لیکن ہم انہیں چھوڑ کر تمہارے پاس آ گئے ہیں اس لئے کہ تم ہمیں ان سے کہیں زیادہ عزیز ہو۔"

لال کنور اس کے قریب پہنچ گئی جہاندار شاہ نے اسے آغوش میں لے لیا۔ وہ دونوں ایک دوسرے میں شامل اپنے نرم ریشمی گدوں کی طرف بڑھے۔

لال کنور نے کہا "جس طرح تمہارے خاندان میں شاہی بیگمات اور خواتین کو نور محل اور ممتاز محل وغیرہ کے خطابات ملتے رہے ہیں اسی طرح کا کوئی اچھا سا خطاب مجھے بھی ملنا چاہئے۔"

جہاندار شاہ نے کہا "ہم تمہیں امتیاز محل کا خطاب دیتے ہیں اس خطاب کا باقاعدہ اعلان شاہجہان آباد پہنچ کر قلعے میں کر دیں گے!"

"اور یہ کہ اب میں قلعۂ معلیٰ کی سب سے زیادہ معزز خاتون ہوں گی اس لئے میری خواہش ہے کہ سلسلہ کی جملہ بیگمات اور خواتین میری خدمت میں دست بستہ حاضر ہو کر آداب بجا لائیں۔"

"اس کی بھی تعمیل کرائی جائے گی تمہیں فکر نہیں کرنی چاہئے!"

"میرے بھائی خوشحال خاں کو اکبرآباد کی صوبیداری عطا کی جائے!"

"اس کی بھی تعمیل ہو گی۔"

"شاہجہان آباد میں میری ایک منہ بولی بہن ہے وہ میری سب سے زیادہ عزیز سہیلی ہے اسے ہاتھی کی سواری اور اپنے ساتھ جلو میں چلنے والے آدمیوں کو رکھنے کی اجازت دی جائے!"

جہاندار شاہ اس کی ہر بات مان رہا تھا اسے بھی مان لیا۔

لال کنور مزید بولی "میری اس سہیلی کے لئے قلعۂ معلیٰ کے دروازے ہمیشہ کھلے رہنے چاہئیں وہ مجھ سے ملنے کسی بھی وقت اور کسی بھی دن آئے کوئی روک ٹوک نہ ہو گی۔"

"منظور!" جہاندار شاہ نے جواب دیا۔

"اور بقیہ باتیں — جب یاد آئیں گی تم سے ان کا وعدہ لیتی رہوں گی!" لال کنور نے کہا۔

"یہ بھی منظور!"

"اور ہاں دو باتیں اور" لال کنور کو جیسے کوئی اہم بات یاد آ گئی ہو "ذوالفقار خان کو برطرف کر دیا جائے اور زینت کو زبردستی بھائی خوشحال خاں کے حوالے کر دیا جائے۔"

اور ساری شرائط میں یہ شرطیں ایسی تھیں جنہیں جہاندار شاہ کسی طرح بھی پورا نہ کر سکتا تھا۔ اس نے بے بسی سے لال کنور کو دیکھا "یہ شرائط سردست پوری نہیں کی جا سکیں گی جب ان کے پورا کرنے کا وقت آئے گا تو تمہارے یاد دلائے بغیر پوری کر دی جائیں گی۔"

لال کنور نے بھی اس کے لئے ضد نہ کی کیونکہ وہ خوب اچھی طرح جانتی تھی کہ جہاندار شاہ کی شہنشاہیت ذوالفقار خان ہی کی رہین منت ہے اگر وہ نہ ہوتا تو جہاندار شاہ بادشاہ بھی نہ ہوتا۔

اور وہ پوری رات دونوں نے خوب عیش کوشی میں گزار دی۔



واپسی کی تیاریاں شروع ہو گئیں خیمے اکھڑنے لگے اب جلد از جلد شاہجہان آباد پہنچ کر قلعے کو اپنی تحویل میں لینا تھا۔ خوشحال خان کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا وہ صوبیداری کے تصور میں چوتھے آسمان پر پہنچ چکا تھا۔ اس نے قطعی فیصلہ کر لیا تھا کہ اسے جیسے ہی صوبیداری کا پروانہ ملے گا وہ زینت کو ایک بار پھر پہلے سا متاثر کر کے پھر زبردستی قابو میں لانے کی کوشش کرے گا۔

جہاندار شاہ نے اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ شاہجہان آباد مراجعت کی۔ لال کنور ہودج میں اس کے آغوش میں تھی، اس سے پہلے کسی شہزادے یا حکمران کے ساتھ ایک ہی ہودج میں کوئی شاہی خاتون ہی سفر کر سکتی تھی لیکن مغل تاریخ میں لال کنور وہ پہلی معمولی عورت تھی جس نے اس رسم کو تڑوا دیا۔ ابھی تین گھڑی دن باقی تھا کہ جہاندار شاہ باؤلی کے راستے سے شاہجہان آباد میں داخل ہو گیا۔ شاہجہان آباد کا صوبیدار محمد یار خان اس کے استقبال کو بڑھا اور تین دن بعد جہاندار شاہ قلعے میں داخل ہو گیا۔ یہاں نہایت تزک و احتشام سے رسم تاجپوشی ادا کی گئی۔ عہدے اور خطابات

تقسیم ہوتے، ذوالفقار خان کو وزیراعظم مقرر کیا گیا۔ لال کنور حسب وعدہ امتیاز محل بن گئی، اس تقریب میں شاہی بیگمات کے دوش بدوش لال کنور کے خاندان کی عورتیں بھی شریک تھیں، شاہجہان آباد کی گمنام کنجڑن جسے لال کنور نے بہن بنایا تھا اور جس کے منصب و اعزاز کی، اس نے جہاندار شاہ سے سفارش کی تھی، اب زہرہ بیگم بن چکی تھی اور اس کی سواری اس جشن میں شمولیت کے لئے اس طمطراق اور کروفر سے قلعے میں داخل ہوئی کہ وہ خود ہاتھی پر ہودج میں تھی اور اس کی پشت پر مورچھل برداری ہو رہی تھی اور جلو میں ہاتھی کے آس پاس ہٹو بچو کرنے والے ملازمین کا ایک جم غفیر ساتھ تھا۔

لال کنور نہایت شان اور تکبر کے ساتھ جہاندار شاہ کے برابر بیٹھی ہوئی تھی اور شاہی بیگمات دست بستہ حاضر ہو کر کورنش و تسلیمات بجا رہی تھیں اور نذرانے پیش کر رہی تھیں بعد میں لال کنور کے رشتے داروں نے اپنی خاندانی رسوم و روایات کے مطابق جشن منایا اور پوری محفل کو رقص گاہ بنا کے رکھ دیا۔ جہاندار شاہ کو یہ سب گوارا تھا کیونکہ یہ اس کی محبوب ترین بیوی لال کنور کی خاندانی رسوم تھیں۔

خوشحال خان جلد از جلد صوبے داری کا پروانہ حاصل کر لینا چاہتا تھا۔ اس نے اپنی بہن کو تنگ کرنا شروع کر دیا۔ زینت کے سلسلے میں خوشحال خاں کو ایک دشواری اور پیش آئی۔ اس کے آدمیوں نے شاہجہان آباد میں زینت کے مکان کا پتا چلا لیا تھا بدقسمتی سے یہاں بھی زینت کو ذوالفقار خان کا قرب حاصل تھا اور اس کوچے میں قدم رکھنا بھی خوشحال خاں کے بس کی بات نہ تھی، سر دست اسے پروانۂ صوبے داری کا انتظار تھا۔

جہاندار شاہ کے حکم پر میر بخشی نے صوبے داروں کی فہرست پیش کر دی وہ دیر تک اسے دیکھتا رہا۔ لال کنور کا یہ اصرار بھی تھا کہ خوشحال خاں کو کسی دور دراز صوبے میں نہ بھیجا جائے۔ صوبہ اکبر آباد، شاہجہان آباد سے بہت قریب تھا۔ جہاندار شاہ نے وزیراعظم کے نام فرمان لکھوایا کہ اکبر آباد کے صوبے دار کو معزول اور اس کی جگہ خوشحال خان کو صوبے دار مقرر کیا جائے صوبے داری کے علاوہ خوشحال خاں کو ہفت ہزاری کا منصب بھی عطا کیا گیا۔

خوشحال خاں خوش خوش اپنے سازندے مصاحبین کے ساتھ ذوالفقار خان کے پاس پہنچ گیا اور شاہی فرمان اس کے حوالے کر دیا۔ ذوالفقار خان اس وقت معزز امرا کے درمیان گھرا ہوا تھا۔ خوشحال خاں نے ذوالفقار خان کو اس طرح دیکھا اور مسکرایا جیسے مرتبے میں وزیراعظم کا ہمسر ہو گیا ہو اسے یقین تھا کہ اب شاہی فرمان کے پیش نظر وزیراعظم اس کی عزت و تکریم پر مجبور ہو جائے گا۔ اس نے مصافحے کے لئے ذوالفقار خان کی طرف دونوں ہاتھ بڑھا دیئے لیکن ذوالفقار خان اپنے ہاتھ سمیٹے رہا۔ اس نے ایک نگاہ غلط انداز سے خوشحال خاں کو دیکھا اور سلام کا جواب گردن کی ہلکی سی جنبش سے اس طرح دیا جس طرح امرا اپنی پرجا کے سلاموں کا جواب دیا کرتے ہیں۔

ذوالفقار خان نے خوشحال خان کو ایک طرف بیٹھ جانے کا اشارہ کیا یہ وہ جگہ تھی جہاں کاروبارِ سلطنت کے معمولی متصدی اور منشی بیٹھے ہوتے تھے۔ خوشحال خاں کو یہ رویہ بہت برا لگا۔ ذوالفقار خان اس کی برابر بے عزتی کئے جا رہا تھا لیکن خوشحال خاں کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہ تھا کہ وہ حکم حاکم مرگِ مفاجات کے مصداق ذوالفقار خان کے حکم کی تعمیل کرے، وہ کہنہ سال فرسودہ حال متصدیوں اور منشیوں کے قریب جا کر بیٹھ گیا۔

تھوڑی دیر بعد ذوالفقار خان نے شاہی فرمان پڑھا اور پیشانی پر شکنیں پڑ گئیں، اس نے ایک اچٹتی نظر خوشحال خان پر ڈالی او پروانۂ صوبے داری کے بجائے ایک فرمان جاری کیا۔ وزیراعظم کا فرمان خوشحال خاں امیدوار صوبے داری اکبر آباد کے نام۔ اس نے لکھا۔

"اکبر آباد کی صوبے داری کے امیدوار کو سندِ صوبے داری حاصل کرنے سے پہلے لازم ہے کہ حق التحریر میں پانچ ہزار ڈھول اور سات ہزار طنبورے داخلِ سرکار کرے۔"

نیچے اپنے دستخط کر دیئے اور خوشحال خاں کو اشارے سے قریب بلا کر یہ تحریر اس کے حوالے کر دی، خوشحال خاں کی امیدوں پر اوس پڑ گئی وہ چپ چاپ دل ہی دل میں کڑھتا ہوا وہاں سے واپس ہوا اور سیدھا لال کنور سے ملنے کے لئے روانہ ہو گیا لیکن لال کنور اب امتیا محل تھی اور اس سے ملاقات اتنی آسان بات نہ تھی۔

خوشحال خاں کے سارے خواب بکھر رہے تھے، وہ زینت کو بھول جانا چاہتا تھا لیکن یہ مسئلہ اب محبت کے بجائے سفلا نا کا بن گ تھا اس نے سوچا تھا کہ جب جہاندار شاہ ہندوستان کا بادشاہ ہو جائے تو اس کی ساری مشکلات دور ہو جائیں گی لیکن اب جبکہ اس کی بہن کا عاشق دہلی کے لال قلعے میں اپنی بادشاہت کے شادیانے بجوا رہا تھا تو اس

وزیر اعظم ذوالفقار خان کمال حوصلہ و جرأتمندی سے اس کے فرمان کو حقارت سے ٹھکرا رہا تھا۔ بڑی مشکلوں سے لال کنور سے ملاقات ہوئی اور اس نے رو رو کر اپنی نامرادی کی داستان دہرا دی۔ لال کنور کو خوشحال خاں سے زیادہ غصہ آیا اس کا بس چلتا تو وہ ذوالفقار خان کو قتل کر کے اس کی لاش کو ہاتھی کی دُم سے بندھوا کر سارے شہر میں گشت کروا تی لیکن ذوالفقار خان پر اس کا کوئی بس نہ تھا۔ اس کے دل میں ایک کانٹا اور کھٹک رہا تھا جب سے وہ لال قلعے میں امتیاز محل کی حیثیت سے رہ رہی تھی، اس کی خدمت میں ابھی تک جہاندار شاہ کی پھوپھی اور اورنگ زیب کی بیٹی زینت النسا حاضر نہیں ہوئی تھی وہ لال کنور کو اس لائق نہیں سمجھتی تھی کہ اورنگ زیب کی بیٹی اس کے روبرو دست بستہ حاضر ہو۔

جہاندار شاہ کو کچھ اور فکریں بھی لاحق ہو گئی تھیں، عظیم الشان کا بیٹا فرخ سیر بنگال سے عظیم آباد پہنچ چکا تھا اور مخبروں نے خبر دی تھی کہ وہ اپنے باپ کا بدلہ اور تخت شاہجہان آباد کے حصول کی خاطر وہاں کے امرا اور صوبے داروں کو راضی کر رہا ہے، عظیم الشان کا دوسرا بیٹا سلطان کریم الدین ابھی تک قابو میں نہ آیا تھا اور جب تک یہ زندہ تھے اس کا تاج و تخت غیر محفوظ تھا، ذوالفقار خان کی بے مثل شجاعت اور تدبر نے اُسے بڑی حد تک بے فکر کر دیا تھا لیکن دونوں شہزادوں کی پُر خطر شخصیت بہرحال ڈرا رہی تھی وہ دیوان عام سے اُٹھ کر رنگ محل کی طرف چلا گیا۔ رنگ محل اب امتیاز محل ہو چکا تھا۔ جہاندار شاہ کی رنگ رلیوں کا یہی مسکن تھا جب وہ اندر داخل ہوا تو مسلح تاتاری عورتیں اور خواصیں مؤدب ہو گئیں اس کی نظریں لال کنور کو تلاش کر رہی تھیں، لال کنور حوض کے کنارے عود پر ایک المیہ دھن بجا رہی تھی۔

" ہمیں خدا نے جس عزت سے نوازا ہے اس کے بعض سرکش بندے اس اعزاز کو ہم سے چھین لینا چاہتے ہیں، اے وزیر نا عاقبت اندیش ! تو اگر واقعی ہمیں ناپسند کرتا ہے اور ہمارے اعزاز و احتشام سے خوش نہیں ہے تو اس معاملے میں بادشاہ وقت سے مت جھگڑ، اس کے فرمان کو مت ٹھکرا بلکہ اس سے اُلجھ جہاں سے عزت و ذلت کے فیصلے صادر ہوتے ہیں، دیکھنا وہ وقت آ کے رہے گا جب صاحبِ عزت ذلیل اور تیری نظر میں ذلیل صاحب عزت ہوں گے، میں تیری سیاست نہیں جانتی لیکن میری سیاست سے تو بھی لاعلم ہے میں وہ ہوں جس نے یوسف کو رسوا، عیسیٰ کو مصلوب، آدم کو بے گھر اور بڑے بڑے فاتحین کو مغلوب کیا ہے بس ذرا جذبۂ انتقام کے پرورش کرنے کی دیر ہے میں ہر کام کر سکتی ہوں، ظالمو! چند روزہ زندگی کو اس کی حلاوتوں سے محروم کیوں رکھتے ہو میں نے بادشاہِ وقت کو زندگی کی بہترین لذتوں سے آشنا کیا ہے اور زندگی رہی تو اس کے بدترین ذائقے تمہیں چکھاؤں گی۔"

جہاندار شاہ اس کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔ لال کنور نے گانا بند کر دیا اور منہ موڑ کر ایک طرف چل دی، جہاندار شاہ اس کے پیچھے چلا اور لال کنور کا آنچل پکڑنا چاہا لیکن اس نے ایک جھٹکے میں آنچل چھڑا لیا۔ جہاندار شاہ دوڑ کر اس کے سامنے راستہ روک کر کھڑا ہو گیا "بات کیا ہے؟ تم ہم سے ناراض کیوں ہو؟"

لال کنور نے ہتک آمیز لہجے میں کہا "اب تک میں تمہیں بادشاہ سمجھتی تھی لیکن آج معلوم ہوا کہ بادشاہ تم نہیں ذوالفقار خان ہے۔"

" بادشاہ ہم ہیں، ذوالفقار خان ہمارا وزیر اعظم ہے" جہاندار شاہ نے تن کر جواب دیا۔

" پھر تمہارے فرمانوں کی تعمیل کیوں نہیں کی جاتی ؟"

"کیا ہوا؟"

لال کنور نے ذوالفقار خان کی تحریر جہاندار شاہ کے حوالے کر دی "اسے پڑھو عبرت پکڑو اور ہوش کی آنکھیں کھولو۔"

جہاندار شاہ نے اس تحریر کو پڑھا اور اسے ایسا لگا جیسے ذوالفقار خان نے اس کے رخسار پر طمانچہ جڑ دیا ہے، غصے میں بولا "تمہیں افسردہ نہیں ہونا چاہیے ہم ذوالفقار خان سے اس کی اس گستاخی کا جواب طلب کریں گے۔"

" جواب ہی طلب کرو گے یا سزا بھی دو گے؟" لال کنور نے طنز کیا

جہاندار شاہ کو اپنی بے بسی اور ذوالفقار خان کی طاقت کا جلد ہی احساس ہو گیا۔ "سرِ دست ہم اس سے جواب ہی طلب کر سکتے ہیں اور اس سے اکبر آباد کی صوبیداری کی سند خوشحال خان کو دلا دیں گے، رہا سزا کا مسئلہ تو اس کا ابھی وقت نہیں آیا۔"

لال کنور نے اندازِ دلنوازی اور شانِ دلربائی سے کہا۔ "مجھے پہلے یہ نہیں معلوم تھا کہ بادشاہ اپنے وزیر سے اس درجہ خوفزدہ اور مغلوب ہے۔"

لال کنور نے دوسری شکایت کی۔ "زینت النساء ابھی تک میری خدمت میں نہیں حاضر ہوتی ہے۔"

جہاندار شاہ کے لئے یہ سب ایک مسئلہ بن گئے تھے اورنگ زیب کی بیٹی کے خلاف بھی وہ کوئی قدم نہ اٹھا سکتا تھا اور یہ بھی جانتا تھا کہ زینت النساء موت کو گوارا کرے گی لیکن لال کنور کے روبرو دست بستہ ہرگز نہ حاضر ہوگی۔

"زینت النساء اگر تمہاری خدمت میں اب تک نہیں آئی ہے تو تمہیں بھی اس پر کوئی توجہ نہیں دینی چاہیئے آج سے ہم خود بھی یہ عہد کرتے ہیں کہ جیتے جی اس کی شکل نہ دیکھیں گے!"

ابھی گفتگو کا سلسلہ جاری ہی تھا کہ جہاندار شاہ کو ایک بہت بڑی خوشخبری سنائی گئی۔ اس کا بھتیجا سلطان کریم الدین گرفتار ہو چکا ہے اور باہر اپنے چچا کے ہاتھوں گردن زدنی کا منتظر ہے۔ اس نے فوراً لال کنور سے معذرت کی اور دیوان عام چل دیا۔ کیونکہ جہاندار شاہ کی نظر میں سلطان کریم الدین کو جلد از جلد ٹھکانے لگا دینا وقت اور امور سلطنت کا سب سے ضروری کام تھا۔



سلطان کریم الدین، عظیم الشان کا بیٹا اور جہاندار شاہ کا بھتیجا زنجیروں میں جکڑا ہوا اس کے سامنے کھڑا تھا۔ جہاندار شاہ نے اس سے چند باتیں کیں اور یہ محسوس کیا کہ بھتیجا اپنے چچا کے اقتدار سے ذرا بھی مرعوب نہیں ہے۔

جہاندار شاہ نے پوچھا۔ "تمہارا کیا خیال ہے ہم تمہارے ساتھ کیسا سلوک کریں گے؟"

کریم الدین نے فوراً جواب دیا۔ "آپ مجھے قتل کرا دیں گے!"

"تم نے یہ کس طرح اندازہ لگایا؟"

"میں آپ کا بھتیجا ہوں اگر آپ کے دل میں میرے لئے ذرا سی محبت ہوتی تو آپ مجھے دیکھتے ہی پہلے زنجیروں سے آزاد کرا دیتے اس کے بعد کچھ باتیں ہوتیں۔"

جہاندار شاہ نے اندازہ لگایا کہ اس کا بھتیجا غیر معمولی ذہین ہے اور اس کی ذہانت آگے چل کر اس کے تاج و تخت کے لئے مستقلاً خطرہ ثابت ہوگی، جہاندار شاہ نے غیر جذباتی لہجے میں جواب دیا۔ "تم کافی سمجھدار ہو، ہم تمہیں معاف نہیں کر سکتے، تم باغی ہو تم نے اپنے باپ کے ساتھ مغلیہ سلطنت کے اصل حقدار کے خلاف بغاوت کی تھی اور بغاوت کی سزا موت ہے، صرف موت۔"

لیکن بہادر کریم الدین پر اس ظالمانہ حکم کا کوئی اثر نہ ہوا۔ جلدیا بدیر ہم دونوں ہی مریں گے!" وہ کہنے لگا۔ "میں پہلے مر رہا ہوں آپ کچھ دنوں بعد مریں گے لیکن یہ میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ میرا بھائی فرخ سیر آپ کو معاف نہ کرے گا اور عنقریب حکومت مغلیہ اُدھر منتقل ہو جائے گی۔"

جہاندار شاہ کی طبیعت مکدر ہو گئی۔ بھتیجا خاصا گستاخ تھا۔ جلاد کو گردن کے اشارے سے حکم ملا کہ تعمیل ہوا ور تلوار کے ایک بھرپور ہاتھ نے سلطان کریم الدین کے سر کو دھڑ سے جدا کر دیا۔ جب کٹی ہوئی گردن



جنات، شیاطین اور بھوت پریت کو ایک ہی جنس میں شمار کرتے تھے لیکن اختلاف شکل، فرق اور مشاغل کی وجہ سے اُن کے نام الگ الگ رکھ چھوڑے تھے۔ جو اجنہ جنگلوں اور میدانوں میں رہتے تھے اور اپنا روپ بدل کر مسافروں کو دھوکا دیتے تھے اُن کا نام غول رکھا تھا اُن میں مذکر بھی ہوتے تھے اور مؤنث بھی۔

اُن کا اعتقاد تھا کہ یہ صحرا نشین بدوؤں کی صحبتوں میں بھی شریک ہوتے تھے۔ جاڑوں میں جب بدو آگ جلا کر بیٹھتے تو اُن کے ساتھ یہ بھی بیٹھ کر آگ تاپتے تھے لیکن جب بدو کھانا کھاتے تو یہ اس کھانے میں شریک نہ ہوتے تھے اور یہ عذر کر دیتے تھے کہ ہم آدمیوں کی غذا نہیں کھاتے۔ یہ اجنہ جہاں آباد تھے اُن کی بستیوں کے نام بدی، لقار اور عبقر تھے۔

کہتے ہیں کہ یہ اکثر بچوں اور جوانوں کو اُٹھا بھی لے جاتے تھے حضرت علیؓ کے ایک بھائی طالب کو یہ اُٹھا لے گئے تھے اور پھر اُن کا کبھی بھی پتا نہ چل سکا۔ عمر بن عدی لخمی جو وہاں کا بادشاہ تھا، اُسے بھی اُٹھا لے گئے تھے اور کئی برس بعد یہ واپس ملا تھا اسی طرح خرافہ نامی شخص کو بھی اُٹھا لے گئے تھے۔ جب مدت کے بعد خرافہ واپس آیا تو سننے والوں کے لیے اس کی باتیں عجیب و غریب تھیں

سے خون کے فوارے چھوٹے تو اس سرسراہٹ سے جیسے" فرخ سیر فرخ سیر" کی آواز آرہی تھی۔ اور عظیم آباد میں فرخ سیر واقعی اپنی قوت مجتمع کر رہا تھا۔

جہاندار شاہ ابھی چند ہی قدم چلا ہوگا کہ اسے ذوالفقار خان کا ایک پرچہ ملا۔ چند سطری مبہم اور مہمل سی تحریر۔

" سلطنت کے ہر امیر اور پرجا کی عزت و ناموس
بے حد عزیز ہے اور حضور کا وفادار خادم ذوالفقار خان
چین قلیچ خان سے متحد و متفق ہے۔"

ابھی وہ اس تحریر کا مفہوم سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ لال کنور کی منہ بولی بہن زہرہ بیگم کا ہاتھی سامنے سے آتا ہوا دکھائی دیا۔ اس سواری کے ساتھ چلنے والے پیادے زخمی تھے اور ان کے جسم لہولہان تھے سواری امتیاز محل کے صدر دروازے پر جا کر کھڑی ہوگئی اس میں سے زہرہ بیگم نمودار ہوئی اس کا لباس تار تار تھا اور ہاتھ پیروں اور چہرے پر چوٹ کے نشانات تھے۔ اس نے رو رو کر اپنی سہیلی لال کنور کو تبلایا کہ ابھی جب وہ اس سے ملنے آرہی تھی تو راستے میں چین قلیچ خان کی سواری بھی گزر رہی تھی۔ اس کے سپاہیوں نے بلاوجہ زہرہ بیگم کے آدمیوں کو مارا پیٹا اور خود زہرہ بیگم کو ہاتھی سے کھینچ کر نیچے گرا لیا اور اس کی مرمت کر دی۔

لال کنور جانتی تھی کہ چین قلیچ خان کوئی معمولی سردار نہیں ہے اس کا یہ خطاب اورنگ زیب کا عطا کردہ ہے اور اورنگ زیب کا وزیر علامی سعد اللہ خاں چین قلیچ خان کا نانا ہے لیکن اس کے باوجود جب جہاندار شاہ اندر پہنچا اور زہرہ بیگم کی بپتا سنی' اس کا ذوالفقار خان کی تحریر سے موازنہ کیا تو پتا چلا کہ ضرور کوئی بات ہے ورنہ چین قلیچ خان جیسا سنجیدہ اور گوشہ نشین سردار ایسی لغو حرکت کا مرتکب نہیں ہو سکتا۔

اس نے معاملے کی اصل نوعیت کو سمجھنے کے لئے ذوالفقار خان کو طلب کیا۔ یہ دن اس کے لئے بڑا ہی منحوس تھا۔ وہ دم بدم ایسی باتیں پیش آرہی تھیں کہ وہ لال کنور کی قربت سے محروم ہو رہا تھا۔

جب ذوالفقار خان آگیا تو جہاندار شاہ' خوشحال خاں اور چین قلیچ خان سے متعلقہ تحریریں لے کر اس سے ملا اس کا پہلا سوال خوشحال خاں سے متعلق تھا۔ جہاندار شاہ نے وہ تحریر ذوالفقار خان کی طرف بڑھا دی اور کہا۔" ہمارا خیال ہے کہ تم نے یہ سب ازراہِ مذاق لکھ دیا ہوگا اس کا سنجیدگی سے کوئی تعلق نہ ہوگا!"

ذوالفقار خان نے مردانہ لہجے میں صاف صاف کہہ دیا" نہیں قبلہ عالم کو غلام سے یہ توقع نہیں رکھنی چاہیئے کہ یہ اپنے آقا کے فرمان کے ساتھ مذاق کرے گا۔ جو کچھ لکھا ہے سنجیدگی اور ہوشمندی سے لکھا ہے۔"

جہاندار شاہ کی مسکراہٹ کافور ہوگئی۔" تب پھر تمہاری تحریر کا مطلب؟"

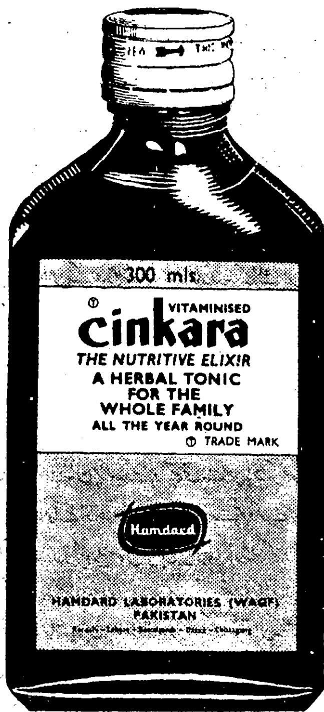
ذوالفقار خان نے جواب دیا۔" صوبے داری یا سرداری کے منصب آج تک آسانی سے نہیں ملے ہیں' ان خاندانوں نے صدیوں کی محنت اور سرفروشیوں کے بعد یہ مقام حاصل کیا ہے' اب اگر جہاں پناہ ان کی جگہ ناچنے گانے والوں اور نا اہل لوگوں کو بٹھا دیں گے۔ تو ان سرداروں کو بھی یہ حق حاصل ہونا چاہیئے کہ معزول سردار ناچنے گانے کا پیشہ اختیار کریں اور کسی طور اپنی روزی کما کھائیں' خوشحال خاں سے لئے جانے والے ڈھول اور طنبورے معزول سرداروں کے حوالے کر دیئے جائیں گے۔"

جہاندار شاہ نادم ہوگیا اور شرمندگی سے اپنی گردن جھکالی' تھوڑی دیر بعد جب سر اٹھایا تو چین قلیچ خان کا مسئلہ درپیش تھا۔ ذوالفقار خان نے کہا۔" جہاں پناہ! جب چین قلیچ خان کی سواری بازار سے گزر رہی تھی۔ اسی وقت زہرہ بیگم بھی ڈوم ڈفالیوں کے ساتھ اُدھر سے گزری چین قلیچ خان نے ازراہ احتیاط اپنی سواری کو ایک طرف کر لیا کہ اپنی عزت اپنے ہاتھ' لیکن زہرہ بیگم کے کم ظرف ہمنشینوں اور مصاحبوں نے چین قلیچ خان پر پھبتیاں کسنی شروع کر دیں' انہوں نے تالیاں پیٹ پیٹ کر سردار کی بے عزتی کی' جہاں پناہ یہ تو جانتے ہی نہیں کہ چین قلیچ خاں کے والد فیروز جنگ ایک بیماری میں اپنی بینائی کھو بیٹھے تھے' خود زہرہ بیگم نے ہاتھی کے ہودج سے باہر چہرہ نکالا اور چیخ کر تمسخرانہ لہجے میں پوچھا کہ کیا فیروز جنگ اندھے کا بیٹا چین قلیچ خان یہی ہے چین قلیچ خان اپنی یہ بے عزتی برداشت نہ کر سکے اور اپنے آدمیوں کو ان سب کی پٹائی کا حکم دیا۔"

جہاندار شاہ سب کچھ سانس روکے سنتا رہا اور شاید زندگی میں پہلی بار اسے محسوس ہوا کہ واقعی اب شرفا کی عزت محفوظ نہیں ہے اسے زہرہ بیگم پر بڑا غصہ آیا لیکن یہاں بھی یہی مجبوری تھی کہ وہ لال کنور کی عزیز ترین سہیلی اور منہ بولی بہن تھی۔



خوشحال خاں کو سند صوبے داری نہیں مل سکی۔ خوشحال خاں جب ہر طرف سے مایوس ہوگیا تو اس نے یہ طے کیا کہ وہ کسی بھی طرح زینت کا اغوا کر کے کسی دور دراز علاقے میں نکل جائے گا۔ اس نے چند جنگجوؤں کی خدمات اچھے معاوضے پر حاصل کیں اور ایک ایسے وقت جبکہ ذوالفقار خان دربار





سنکارا اب عام شکر کی بجائے گلوکوز سے تیار کیا جاتا ہے - اس کا ذائقہ بھی پہلے سے بہتر ہے -

جسمانی قوتوں کو بحال کرنے اور ان کو برقرار رکھنے کے لئے حیاتین آمیز اور جڑی بوٹیوں کے نچوڑ سے تیار شدہ سنکارا پہلے ہی سے ایک معروف اور موثر ٹانک تھا۔ اب گلوکوز کی آمیزش سے یہ اپنے توانائی بخش اثرات میں کہیں بہتر ہو گیا ہے۔
سنکارا کا باقاعدہ استعمال روزمرہ کے معمولات کو بے تکان سرانجام دینے کی صلاحیت بڑھاتا ہے۔

گلوکوز آمیز سنکارا

گھر کے ہر فرد کے لئے
ہر موسم میں یکساں مفید

ہمدرد لیبوریٹریز (وقف) پاکستان
کراچی - لاہور - راولپنڈی - ڈھاکہ - چٹاگانگ



Adens.CG-2A:71

ہیں تھا زینت کے مکان پر دھاوا بول دیا محلے والوں نے لوٹ مار کر اس کی
گوشہ نشین ناکام بنا دیں۔ جب ذوالفقار خان کو یہ خبر ملی تو اس نے فوراً خوشحال
خاں کی گرفتاری کا حکم دے دیا۔ وہ گرفتار کر لیا گیا اور پا بہ زنجیر ذوالفقار خان
کے روبرو کھڑا کر دیا گیا۔ ذوالفقار خان نے پہلے تو اسے برا بھلا کہا لیکن خوشحال
خاں نے جب اسے یہ دھمکی دی کہ اس کی بہن لال کنور اسے چھڑالے گی اور
وزیر کو اس گستاخی کی سزا ملے گی تو وہ پاگل سا ہو گیا۔ اس نے خوشحال خاں
کو بے تحاشا پٹوایا اور اس کے بعد ہمیشہ کے لئے سلیم گڑھ کے قلعے میں
قید کر دیا۔

لال کنور نے بہتیری کوشش کی کہ اسے رہا کرائے لیکن جہاندار شاہ
ذوالفقار خان سے اُلجھنا نہیں چاہتا تھا۔ دم بدم خبریں مل رہی تھیں کہ
فرخ سیر سادات بارہہ کی حمایت حاصل کر کے اس کی طرف بڑھا چلا آ رہا
ہے جہاندار شاہ ذوالفقار خان پر تکیہ کئے ہوئے تھا اسے کسی بات کی فکر نہ
تھی، فرخ سیر آتا ہے تو آئے ذوالفقار خان اس کا بندوبست خود کرے گا۔

کچھ دنوں سے لال کنور یہ محسوس کر رہی تھی کہ جہاندار شاہ کے جوش و
خروش میں کچھ کمی آگئی ہے، انہی دنوں شاہی مالی نے یہ خبر دی کہ امتیاز محل
کے درخت مرجھاتے جا رہے ہیں، جہاندار شاہ لال کنور کے ساتھ ان کے معائنے
کو پہنچ گیا اس نے دیکھا تمام درخت بے برگ و بار زرد زرد امر بیل کی گرفت
میں آ چکے ہیں، امر بیل نے ان سب کو جکڑ لیا ہے اور ان کی ساری توانائی
چوسے جا رہی ہے۔

جہاندار شاہ نے مالی سے پوچھا "یہ درخت کیوں مرجھاتے جا رہے ہیں؟"

شاہی مالی نے ڈرتے ڈرتے ایک نظر لال کنور کو دیکھا اور گردن جھکا
کے عرض کیا "جہاں پناہ! ان درختوں کی توانائی امر بیل چوسے جا رہی ہے
امر بیل جو خود غذا نہیں مہیا کرتی بلکہ دوسرے درختوں کی غذا پر زندہ رہتی
ہے یہ جب کسی جگہ داخل ہوتی ہے تو بڑی مشکل سے نکلتی ہے اور پورے
گلشن کو ویران کر کے رکھ دیتی ہے۔"

لال کنور کو ایسا محسوس ہوا کہ یہ ساری باتیں جیسے امر بیل کے
پردے میں خود اس کے لئے کہی گئی ہیں، وہ چیخنے لگی "یہ مجھے ذلیل کر رہا ہے
یہ مالی کمینہ کم ذات مجھ پر پھبتی کس رہا ہے اسے اس کی اس گستاخی کی
سزا ملنی چاہیئے میں اس وقت تک اپنے آقا بادشاہ سے ناراض رہوں
گی جب تک یہ مالی زندہ ہے۔"

جہاندار شاہ کو بھی ایسا ہی محسوس ہوا کہ یہ سب کچھ لال کنور کو
سامنے رکھ کر کہا گیا ہے، لال کنور کی خفگی اس کے لئے ناقابل برداشت تھی
ایک حقیر مالی اور لال کنور میں کیا مقابلہ چنانچہ مالی کی گستاخی اور فضول بیانی کی
سزا اس کے سوا کیا ہو سکتی تھی کہ اسے قتل کرا دیا جائے۔ جہاندار شاہ نے
اسے فوراً قتل کرا دیا۔

فرخ سیر سادات باڑہ کے ساتھ فوجیں لئے بڑھا چلا آ رہا تھا
لال کنور نے سوچا کہ معلوم نہیں جہاندار شاہ کی حکومت کتنے دن اور رہے
بہتر ہے کہ اس سے پہلے ہی جتنی خواہشیں ہیں پوری کرالی جائیں لیکن
بہت کچھ سوچنے کے بعد بھی خواہشیں سمجھ میں نہ آتی تھیں، ناز برداری اور پرستش
کرانے کی خواہش تھی کہ ہر وقت سر اُٹھائے رہتی۔ جہاندار شاہ اور لال کنور
درشنی میں کھڑے جمنا کا نظارہ کر رہے تھے اور لال کنور اسی سوچ میں تھی کہ
اب کون سی خواہش ہے جو پوری نہیں ہوئی۔ جمنا میں لوگ نہا رہے تھے اور
کشتیاں ادھر اُدھر رواں دواں تھیں، لال کنور ٹکٹکی باندھے انہیں دیکھتی رہی،
جہاندار شاہ کسی کسی لمحے اس کے حسین و جمیل چہرے کو دیکھ کر ایک نشہ سا
طاری کر لیتا۔ وہ سوچتا کہ لال کنور میں معلوم نہیں کیا چیز ہے جس نے اسے
دیوانہ بنا دیا ہے۔ لال کنور جمنا کے ساحل پر کھڑی اس کشتی کو غور سے دیکھ
رہی تھی جس میں کچھ مسافر سوار ہو چکے تھے اور بقیہ سوار ہو رہے تھے، مسافروں
میں بوڑھے، بچے، جوان عورتیں اور مرد سبھی تھے، تھوڑی دیر بعد جب کشتی نے
ساحل چھوڑا اور دریا کے درمیان کی طرف بڑھی تو لال کنور کے دل میں ایک
عجیب و غریب خواہش پیدا ہوئی جیسے کوئی اس کے دل میں بیٹھا کہہ رہا تھا۔
"آج تک تو نے کسی کشتی کو ڈوبتے ہوئے نہیں دیکھا؟"

لال کنور خوفزدہ ہو کر جہاندار شاہ سے چمٹ گئی۔ "جہاندار!"

جہاندار شاہ نے اسے بھینچ لیا۔ "جانِ جہاندار!"

"ایک خواہش۔ بس ایک خواہش تم اسے پورا کرو۔" لال کنور پر
اضطراری کیفیت طاری تھی۔

"خواہش کا اظہار کرو ہم تمہاری ہر خواہش پوری کریں گے!"
جہاندار شاہ نے محبت سے اس کی پشت تھپتھپائی۔

اس نے جلدی جلدی پلک جھپکائی اور اپنی لمبی پلکوں کے تیر
چلاتی ہوئی مسکرا کر بولی "لیکن خدا کے لئے اس خواہش پر مجھے پاگل
ہرگز نہ سمجھنا!"

"نہیں ہم تمہیں اس دور کی سب سے زیادہ فرزانہ اور ہوشمند
عورت سمجھتے ہیں۔"

اس نے ہچکچاتے ہوئے عرض کیا "جہاندار! میں نے آج تک مسافروں سے بھری ہوئی کوئی کشتی ڈوبتے نہیں دیکھی کیا تم میری یہ خواہش پوری نہ کر سکو گے!"

یہ کون سی مشکل یا ناممکن العمل خواہش تھی، جہاندار شاہ نے گویا چٹکی بجاتے ہوئے کہا "بس یہ ذرا سی خواہش، اس کی تعمیل بھی کوئی مشکل کام ہے ابھی لو ہم ابھی تمہاری اس خواہش کو پورا کیے دیتے ہیں۔"

اور جہاندار شاہ کے فرمانبردار سپاہیوں کا ایک پرا لال کنور کی اس حقیر سی خواہش کو پورا کرنے کے لئے برق رفتاری سے جمنا کی طرف روانہ ہو گیا۔ لال کنور کی نظریں دور دھبے کی طرح نظر آنے والی کشتی پر لگی ہوئی تھیں، جہاندار شاہ کے سرفروش سپاہیوں نے اس کشتی کو واپس کرا لیا اور وہ ایک بار پھر اسی ساحل سے آ لگی، جہاں سے تھوڑی دیر پہلے روانہ ہوئی تھی پھر اسے آہستہ آہستہ بیچ دریا میں لے جایا گیا اور وہاں بھاری بھاری آہنی آلات کی ضربوں سے کشتی کے پیندے میں بڑے بڑے سوراخ کر دیے گئے بچے عورتیں بوڑھے جوان سبھی بدحواس عرصۂ محشر کی طرح کشتی میں ادھر ادھر بھاگ رہے تھے ان کی چیخیں قلعے کی دیواروں سے ٹکرا رہی تھیں جہاندار شاہ کی نظریں لال کنور کے چہرے پر تھیں اور لال کنور کا چہرہ فرطِ خوشی اور جوشِ دیوانگی میں تمتما اٹھا تھا اس نے ایسا دلچسپ کھیل پوری زندگی میں کبھی بھی نہ دیکھا تھا۔ کشتی آہستہ آہستہ پانی کے اندر بیٹھتی جا رہی تھی اور اس کے مسافروں کی آوازیں بھی سطح آب کے نیچے غائب ہوتی جا رہی تھیں جب کشتی بالکل غائب ہو گئی تو لال کنور نے ایک زوردار جھرجھری لی اور جوش مسرت میں اس کے منہ سے عجیب سی آوازیں نکلنے لگیں۔



مالی کا قتل اور کشتی کی غرقابی کا ظالمانہ فعل زبان زد خلائق ہو گیا لوگ جہاندار شاہ سے بے زار ہو گئے۔ فرخ سیر اکبر آباد تک آ چکا تھا۔ اب جہاندار شاہ اس کا مقابلہ کرنے پر مجبور تھا۔ فوجوں کی کمان ذوالفقار خان کے سپرد کی گئی اور پھر دونوں فوجیں آمنے سامنے ڈٹ گئیں، جہاندار شاہ نے اب تک جو بویا تھا اس کی کٹائی کا وقت آ چکا تھا۔ لوگوں کی وفاداریاں مشکوک تھیں، چنانچہ جب زور شور سے معرکہ کارزار برپا تھا تو جہاندار شاہ اس وقت بھی لال کنور کے ساتھ ہودج میں بیٹھا

قائدِ اعظم اور سفارش

قائدِ اعظمؒ کسی کی سفارش نہیں کرتے تھے۔ شامتِ اعمال، معاش کا مارا ایک نوجوان طالب علم قائدِ اعظمؒ سے ملا اور کسی جگہ کی نشاندہی کرتے ہوئے کہا کہ اگر آپ فلاں صاحب سے میری سفارش فرما دیں تو مجھے ملازمت مل جائے گی۔ قائدِ اعظم نے انکار کر دیا کہ میں سفارش نہیں کرتا لیکن پھر کچھ سوچ کر طالب علم سے چند سوالات کیے۔

انہوں نے پوچھا۔ "کیا دورانِ طالب علمی کھیلوں میں بھی کبھی حصہ لیا تھا؟" طالب علم نے جواب دیا۔ "نہیں"

دوسرا سوال تھا۔ "کالج یا یونیورسٹی کی ادبی مصروفیات میں تمہارا کتنا حصہ ہوتا تھا؟"

طالب علم نے جواب دیا۔ "میں ادبی مصروفیات سے بھی لاتعلق رہا"

قائدِ اعظمؒ نے تیسرا سوال کیا: "کالج یا یونیورسٹی کی کوئی بھی ایسی مشغولیت تھی جس میں تم نے حصہ لیا ہو؟"

طالب علم نے پھر نفی میں گردن ہلا دی کہ "نہیں، میں دورانِ طالب علمی میں پڑھنے لکھنے کے سوا وہاں کی ہر چیز سے لاتعلق رہا۔

قائدِ اعظم نے اسے ڈانٹ دیا۔ "نکل جاؤ میرے کمرے سے۔ میں تم جیسے نکمے اور فضول آدمی کی سفارش نہیں کر سکتا۔" نوجوان طالب علم افسردگی سے پیچھے ہٹا اور الوداعی سلام کر کے یہ کہتا ہوا رخصت ہو گیا کہ "آپ سفارش کریں یا نہ کریں، مجھے اس کی کوئی پروا نہیں لیکن بندہ جھوٹ ہرگز نہ بولے گا۔" قائدِ اعظمؒ تیزی سے اس کی طرف لپکے لیکن وہ کمرے سے نکل چکا تھا۔ قائدِ اعظمؒ نے اپنے سیکرٹری کو حکم دیا کہ "اس نوجوان کو روکو اور دوبارہ میرے پاس لاؤ۔" سیکرٹری نے بڑھ کر اس نوجوان کو روک لیا اور دوبارہ قائدِ اعظمؒ کی خدمت میں پیش کر دیا۔ قائدِ اعظم کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسرت کی لہر نمودار ہوئی۔ آپ نے فرمایا۔ "میں تمہاری سفارش کروں گا اپنے اصول کے خلاف زندگی میں پہلی بار۔ میں سفارش نہیں کرتا۔ یہ میری زندگی کا ایک قیمتی اصول ہے لیکن تم بھی مجھ سے وعدہ کرو کہ تم آئندہ بھی کبھی جھوٹ نہیں بولو گے۔ بالکل اسی طرح جس طرح ابھی تم نے کہا تھا۔"

اور قائدِ اعظم نے غالباً زندگی میں پہلی بار سچ کی خاطر اپنے نہایت قیمتی اصول کو توڑ دیا تھا

داد عیش دے رہا تھا۔ فرخ سیر اور اس کی سپاہ کے حوصلے بڑھے ہوئے تھے جلدی ہی جہاندار شاہ کی سپاہ مغلوب ہونے لگی۔ اکیلا ذوالفقار خان کیا کرسکتا تھا لیکن وہ میدان میں ڈٹا ہوا تھا۔ اسی دوران جہاندار شاہ کی عیش پسندی اور ناعاقبت اندیشی نے جنگ کا نقشہ ہی بدل دیا۔ لال کنور اس خونریز معرکے سے بہت خوفزدہ تھی، اس نے جہاندار شاہ کو مجبور کردیا کہ وہ خواہ مخواہ یہاں اپنا وقت نہ ضائع کرے اس نے سوچا کہ یہی وہ موقع ہے کہ ذوالفقار خان سے بدلہ لیا جائے اور جنگ کی ساری ذمہ داری اس کو سونپ دی جائے اس نے جہاندار شاہ سے کہا "جہاندار! تم اپنی جان ہلاکت میں کیوں ڈالتے ہو، ذوالفقار خان سے کہو کہ یہی وقت ہے جس میں اس کی وفاداری اور جاں نثاری کا امتحان لے لیا جائے گا۔"

جہاندار شاہ نے لال کنور کا مشورہ مان لیا اور کسی فیصلے سے پہلے ہی لال کنور کو لے کر شاہجہان آباد روانہ ہوگیا۔ وہاں قلعے میں قیام کرنے کے بجائے ذوالفقار خان کے باپ سعد خان کے پاس چلا گیا۔

فوج نے جب یہ دیکھا کہ جہاندار شاہ کا کہیں پتا نہیں تو چاروں طرف ایک ابتری پھیل گئی۔ ذوالفقار خان انہیں روکنے کی لاکھ کوشش کرتا تھا لیکن کوئی رکنے کا نام نہ لیتا تھا، آخر کار نوبت یہاں تک پہنچی کہ ذوالفقار خان اپنے آدمیوں کے ساتھ تنہا فرخ سیر کا مدمقابل رہ گیا۔ فرخ سیر بھی اس سے خوفزدہ تھا اور جانتا تھا کہ جب تک یہ میدان جنگ میں موجود ہے جنگ ختم نہ ہوگی۔ اس نے ذوالفقار خان کے نام ایک مختصر سا پیغام بھیجا۔

"سلطنت کا دعوے دار تو راہِ فرار اختیار کرچکا کیا تم بھی حکومت کے دعوے داروں میں ہو جو اب تک میدان میں ڈٹے ہوئے ہو۔ اگر تم دعوے داروں میں سے ہو تو یہ امر جدا ہے اور اگر نہیں تو نسلِ عالمگیری میں جہاندار شاہ نہیں تو میں سہی۔ تمہیں اس پر کیا اعتراض ہوسکتا ہے۔"

ذوالفقار خان نے اسی وقت مقابلے سے ہاتھ اٹھا لیا اور شاہجہان آباد روانہ ہوگیا۔ جب وہ اپنے باپ سعد خان کے پاس پہنچا تو یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ جہاندار شاہ وہاں پہلے ہی سے موجود ہے اور اس نے بھیس بدلنے کی خاطر اپنی داڑھی مونچھ کو صاف کرادیا ہے۔ سعد خان نے اورنگزیب کے عہد میں تیس سال وزارت کی تھی۔ اس نے اپنے بیٹے ذوالفقار خان کو سمجھایا کہ اب جہاندار شاہ کے ڈرامے کو ختم ہوجانا چاہیے فرخ سیر کے دربار میں رسائی حاصل کرنے کی کوشش کرو لیکن ذوالفقا خان کو اپنے باپ کا یہ مشورہ پسند نہ آیا۔ اس نے اس مسئلے پر بڑی رد و بحث کی لیکن جہاندیدہ باپ نے بیٹے کو ہار ماننے پر مجبور کردیا۔ سعد خا خیال تھا کہ فرخ سیر اسے معاف کردے گا۔

ابھی فرخ سیر شاہجہان آباد کے قلعے میں داخل نہ ہوا تھا او اپنے شاہی خیمے میں فروکش تھا کہ سعد خان نے جہاندار شاہ اور لال کنور اس کے حوالے کردیا اور خود ذوالفقار خان کے ہاتھوں کو رومال سے بان فرخ سیر کے روبرو لے گیا اس نے ننتے بادشاہ سے سفارش کی کہ اس بیٹے کی غلطیاں معاف کردی جائیں۔

فرخ سیر احتراماً اپنی جگہ سے اٹھا اور ذوالفقار خان کے د ہاتھ کھلوا دیئے اسے بیش بہا خلعت اور قیمتی جواہرات سے نواز دیا۔ اس سعد خان سے کہا "تم واپس جاسکتے ہو، بوڑھے ہونے کی وجہ سے تم آرا کرنے کے مستحق ہو۔"

سعد خان کا ماتھا ٹھنکا "اور ذوالفقار خان؟"

فرخ سیر نے جواب دیا "یہ ابھی یہیں ٹھہرے گا۔ ہمیں ا سے کچھ مشورے لینے ہیں!"

باپ بیٹے نے ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھا گویا آپس کہہ رہے ہوں کہ اب خیر نہیں، فرخ سیر کی نیت درست نہیں۔"

سعد خان پریشان اور پراگندہ حال گھر چلا گیا۔ ذوالفقار خا خیمے ہی میں روک لیا گیا۔

تھوڑی دیر بعد فرخ سیر اس سے مخاطب ہوا "او ذلیب انسان! کیا تو ہمارے باپ اور بھائی کے قتل میں جہاندار شاہ کا معاون مشیر نہ تھا؟"۔

ذوالفقار خان فرخ سیر کے اس خطرناک لہجے سے ذرا بھی گھبرایا "مجھے اس سے کوئی انکار نہیں، ہمیں اس بازی میں جو مسلسل کھیا رہی ہے اگر حصہ لینا ہے تو کسی کا دوست اور کسی کا دشمن بننا ہی پڑ گا لیکن سلطان کریم الدین کی موت کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں۔"

"نمک حرام" فرخ سیر برس پڑا "تو زبان دراز اور گستاخ ہے موت سر پر منڈلا رہی ہے اور تو اس سے اب بھی خوفزدہ نہیں"

ذوالفقار خان نے ترکی بہ ترکی جواب دیا "نمک حرامی کی

مجھ پر نہیں تجھ پر تنگ ہو سکتی ہے تو اپنے چچا جہاندار شاہ کا بنگال میں ملازم تھا اور اب تو اسے شکست دے کر اس کا حق غصب کرنے کی فکر میں ہے۔"

فرخ سیر اس گستاخی پر ذوالفقار خان کو خود بھی سزا دے سکتا تھا لیکن ذوالفقار خان کے تیور یہ بتاتے تھے کہ اگر فرخ سیر نے اس سے کسی بھی قسم کی زیادتی کی تو یہ سب کے سامنے اسے ذلیل کر کے رکھ دے گا۔

فرخ سیر نے اپنے آدمیوں کو اشارہ کیا۔ وہ سب نہتے ذوالفقار پر ٹوٹ پڑے پہلے دھوکے سے اس کے گلے میں تسمہ ڈالا اور اس سے گلا گھونٹ دینا چاہا، ذوالفقار خان مردانہ وار الجھ گیا اور وہ مدافعت کرنے لگا لیکن فرخ سیر کے دوسرے اشارے نے ذوالفقار خان کو قتل کر دیا۔

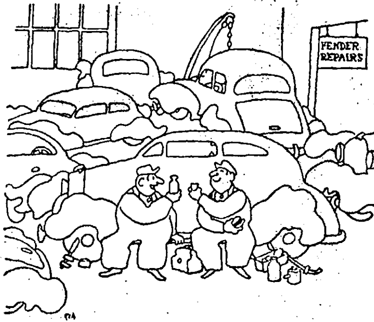
یہی الزامات بلکہ اس سے بھی سنگین جہاندار شاہ پر لگائے گئے وہ ان الزامات سے کس طرح انکار کر سکتا تھا لال کنور اس سے چھین لی گئی اسے قلعے میں بھیج دیا گیا اس لیئے کہ اب جہاندار شاہ کا اس کے بطن سے ایک لڑکا پیدا ہو چکا تھا اور فرخ سیر نے بھی جہاندار شاہ کی بیوی کی حیثیت سے اس کا مستحق سمجھا کہ شاہی اعزاز و احتشام سے لال قلعے میں رہتی رہے

اسی دن جہاندار شاہ کو بھی ہلاک کر دیا گیا۔ فرخ سیر کی دونوں کو قتل کرا دینے سے بھی سیری نہ ہوئی اس نے ایک نیا فرمان جاری کیا۔

"جہاندار شاہ کی لاش سے اس کا سر جدا کر دیا جائے! اور لاش کو ہاتھی پر رکھ کر پورے شہر میں تشہیر کرائی جائے۔" اور ذوالفقار خان کی لاش کے لئے یہ حکم صادر ہوا۔ "اسی ہاتھی کی دم سے ذوالفقار خان کی لاش باندھ دی جائے اور اس ہاتھی کو پورے شہر میں اس طرح گھمایا پھرایا جائے کہ اس کے پیچھے ضعیف و کہن سال سعد خان اپنے عام لباس میں اس ہاتھی کے پیچھے پیچھے ہو۔ نیز اس کے خاندان کی خواتین بھی اپنی اپنی نقاب میں اس جلوس میں شرکت کریں۔" لال کنور بھی جلوس میں شامل ہوگی۔

اس فرمان کے جاری کرنے کے بعد فرخ سیر نے اپنے چچازاد بھائی، جہاندار شاہ کے بیٹے کی آنکھوں میں گرم گرم سلائیں پھروا کر اندھا کر دیا۔

جب جہاندار شاہ اور ذوالفقار خان کی لاشوں کا جلوس نکلا تو بوڑھا سعد خان اپنے خاندان کی پردہ نشین خواتین کے ساتھ اپنے بیٹے کی لاش کے پیچھے پیچھے تھا۔ اس کی آنکھیں نمناک تھیں کلیجہ باہر نکلا آ رہا تھا۔ دل ڈوبا جا رہا تھا اور سینے میں غم و اندوہ کی بھٹی سلگ رہی تھی۔ خواتین چیخیں مار مار کر رونا چاہتی تھیں لیکن فرخ سیر کے خوف سے اس غم کے پہاڑ کو سینے کے اندر ہی ضبط کرنے پر مجبور تھیں یہ جلوس



'خواتین کے نام'

جدھر سے گزرتا لوگوں کی آنکھیں نم ہو جاتیں۔ ان دنوں یہ تماشا عام تھا۔ شاہجہان آباد کے لوگ ایسے تماشے تو آتے دن ہی دیکھتے رہتے تھے لیکن پھر بھی عادی نہ ہوتے تھے آنکھیں ابل ہی پڑتی تھیں اور شدتِ جذبات سے گلے رندھ ہی جاتے تھے۔

لال کنور بھی چپ تھی جمنا میں ڈوبی جانے والی کشتی اور اس کے مسافروں کی چیخ و پکار اور واویلا کی وحشتناک صدائیں اس وقت بھی کانوں میں گونج رہی تھیں۔ اس وقت سعد خان کی نظریں لال کنور پر پڑیں اور نگ زیب کے بوڑھے وزیر نے کہا "لال کنور! تو نے جمنا میں مسافروں سے بھری کشتی نہیں ڈبوئی تھی بلکہ جہاندار شاہ کی حکومت کو جمنا کی تہہ میں ڈبو دیا تھا۔"

لال کنور نے فرخ سیر کے سپاہیوں کے خوف سے اشک آلود رخسار جلدی سے پونچھ ڈالے اس وقت مظلوم مالی کی آواز کانوں میں گونجنے لگی۔

"جہاں پناہ! یہ امر بیل ہے جو تمام درختوں کی غذا چوسے جا رہی ہے امر بیل اپنی غذا خود نہیں پیدا کرتی بلکہ یہ دوسرے درختوں کی غذا پر زندہ رہتی ہے یہ ایک بار کسی درخت کو اپنی گرفت میں لے لے تو پھر مشکل ہی سے اس کی جان چھوڑتی ہے۔"

کہتے ہیں کہ باون سالہ جہاندار شاہ نے مرتے وقت افسوس کرتے ہوئے کہا تھا کہ "افسوس! میں پیدا تو ہوا تھا عقاب کے گھرانے میں لیکن زاغ و زغن کی صحبتوں نے مجھے کہیں کا نہ رکھا۔" ✱

"خیانت کی تلافی"

موپاساں سے

محمد اسلم شاہد



اپنی خوبصورت خوابگاہ میں، آرام دہ بستر پر لیٹی ہوئی تھی۔ طلاق لینے کے بعد اس کی دُنیا میں عجیب سا سکون پیدا ہو گیا تھا۔ رات وہ بڑے آرام سے سوتی تھی۔ اچانک نیچے کے کمرے سے اُس کی عزیز ترین سہیلی گریٹی کی آواز سُنائی دی۔ وُہ چونک پڑی۔ اُس کی سمجھ میں نہ آیا کہ یہ صبح سویرے گریٹی کیوں آن ٹپکی۔ اس نے اُٹھ کر خوابگاہ کا دروازہ کھولا اور وہیں سے آواز دی۔

"اُوپر آجاؤ گریٹی، میں جاگ گئی ہُوں۔"

گریٹی تیزی سے سیڑھیاں پھلانگتی ہوئی اُوپر پہنچ گئی۔

"خیریت تو ہے —— یہ صُبح سویرے کیا مصیبت آ پڑی۔" رینی نے پوچھا۔

گریٹی روہانسی نظر آرہی تھی۔ "ناقابل یقین بات ہو گئی ڈارلنگ ......" یہ کہہ کر وہ سسکیاں لینے لگی۔ رینی نے بڑ[ھ] کر اسے اپنے سینے سے لگا لیا اور پھر سہارا دے کر اسے اپنی خوا[بگاہ] میں لئے چلی گئی۔

رینی نے پیار سے اس کی پُشت تھپتھپائی۔ "میری جان اِ[س]

کیا بات ہو گئی ہے۔ مجھے تو کچھ بتاؤ شاید میں تمہاری کوئی مدد کر سکوں۔"

گریٹی کی آنکھیں نم تھیں" قسم لے لو جو رات بھر ایک پل کو بھی میری آنکھ لگی ہو۔ دیکھو میرا دل کتنے زور زور سے دھڑک رہا ہے۔" گریٹی نے رینی کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر اپنے سینے پر اس جگہ رکھا جہاں ہاتھ رکھنے کے بعد اکثر مرد یہ بھول جاتے ہیں کہ وہاں اندر کوئی دل بھی دھڑک رہا ہے۔۔۔ گریٹی کا دل واقعی بہت زوروں سے دھڑک رہا تھا۔



"یہ کل سہ پہر کی بات ہے۔" گریٹی نے اپنی کہانی بیان کرنا شروع کر دی "جیسا کہ تمہیں معلوم ہے میرا فلیٹ پہلی منزل پر واقع ہے۔ اور میں اپنے مکان کے سامنے کی طرف کھلنے والی کھڑکی میں بیٹھ کر باہر کا نظارہ کرنے کی عادی ہوں۔ چنانچہ میں کل بھی، حسبِ معمول کھڑکی کے قریب بیٹھی تازہ ہوا سے لطف اندوز ہو رہی تھی کہ اچانک میری نظر سامنے کی عمارت پر پڑی جہاں ایک کھڑکی سے لگ کر ایک عورت بیٹھی ہوئی تھی اس نے سرخ رنگ کا نہایت بھڑکیلا لباس پہن رکھا تھا۔ میں اس عورت کے بارے میں بس اتنا ہی جانتی تھی کہ وہ تقریباً ایک ماہ قبل اس فلیٹ میں رہنے آئی تھی۔ چونکہ پچھلے مہینے تک زوردار بارشیں ہوتی رہی ہیں اس لئے میں اس سے پہلے اسے نہ دیکھ سکی تھی لیکن پھر بھی اسے جب اس روز میں نے پہلی بار دیکھا تو ایک ہی نظر میں پہچان گئی کہ وہ اچھی عورت نہیں ہے۔۔۔۔ میرا مطلب ہے۔۔۔۔ شاید تم سمجھ گئیں۔۔۔۔ پہلے پہل مجھے یہ سوچ کر بہت کوفت ہوئی کہ اب وہ بھی میری طرح اپنی کھڑکی میں بیٹھا کرے گی لیکن پھر میرے دل میں ایک عجیب سا شوق پیدا ہوا بعد میں یہ شوق جذبہ تجسس بن کر مجھ پر حاوی آ گیا اور میں نے سوچا کیوں نہ اس کی حرکتوں کا بغور جائزہ لیا جائے۔

"وہ کھڑکی پر اپنی کہنیاں ٹکائے نیچے سے گزرنے والے ہر مرد کو ترغیب آمیز نظروں سے دیکھ رہی تھی، اور تقریباً ہر گزرنے والا مرد ایک نظر اوپر اسے ضرور دیکھ لیتا تھا اُن میں سے بعض کی نظریں للچائی ہوئی ہوتی تھیں اور بعض کی آنکھیں جیسے یہ کہہ رہی ہوتیں:-

"نہیں ابھی نہیں۔ پھر کبھی سہی!" یا کوئی بزرگ اُوپر کی طرف دیکھتے تو اُن کی آنکھوں میں یہ پیغام ہوتا "کیوں انسانیت کو تباہ کرنے پر تلی ہو۔ جاؤ اندر جا کر بیٹھ جاؤ۔"

"یقین جانو رینی اس کی ایک ایک ادا دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ اس مکڑی کے جال بُننے کا انداز خوب تھا۔ میں نے سوچا کہ وہ نہ جانے کس طرح اپنے گاہکوں پر اپنا مطلب واضح کرتی ہوگی۔ کیا صرف ایک نظر دیکھ لینے سے ہی کام چل جاتا تھا یا پھر اس میں اس کی اور ترکیبوں کو بھی دخل تھا مثلاً سر یا ہاتھ کا کوئی مخصوص اشارہ۔ اسی خیال سے میں اپنی چھوٹی دوربین اٹھا لائی اور بہت جلد مجھے اپنے سوال کا جواب مل گیا پہلے ایک بھرپور نظر پھر ایک دلفریب مسکراہٹ اور آخر میں سر کی ہلکی سی جنبش جیسے کسی کو اُوپر آنے کا اشارہ کیا جا رہا ہو اور یہ سب کچھ اتنے مخفی انداز میں ہوتا تھا کہ عام آدمی اسے نہیں سمجھ سکتا تھا۔

"کیا میں بھی ایسا کر سکتی ہوں؟"

میرے دل میں شرارت نے چٹکی لی اور میں نے آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر دو تین بار کوشش کی۔ یقین جانو کہ میں اس سے کہیں بہتر اور خوبصورت طریقے سے یہ کام انجام دے سکتی تھی مجھے اپنی اس کامیابی اور پوشیدہ صلاحیت پر بہت خوشی ہوئی اور اسی خیال میں دوبارہ کھڑکی کے قریب جا کھڑی ہوئی میری نظریں اس عورت پر ٹکی ہوئی تھیں لیکن جونہی میری نظر نیچے گئی میرا دل دھک سے رہ گیا۔ کیونکہ اب تمام گزرنے والے کن انکھیوں بلکہ بعض نوجوان تو بھرپور نظروں سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ پہلے پہل تو میں گھبرا گئی لیکن پھر اتنے سارے مردوں کی توجہ اپنی طرف پا کر میرا دل بلّیوں اُچھلنے لگا۔ میں بتا نہیں سکتی رینی کہ اس وقت میرے کیا جذبات تھے۔ تم تو جانتی ہی ہو کہ کبھی کبھار میرا دل کیا کچھ کرنے کو چاہتا ہے بس اُس وقت بھی دل میں یہی آئی کہ کیوں نہ کسی کو اشارہ کر کے دیکھوں۔ صرف ایک بار۔۔۔ یہ دیکھنے کے لئے کہ میرے اشارے کا بھی کیا وہی اثر ہو سکتا ہے جو اس عورت کا ہوتا تھا۔ نیچے سے گزرنے والوں میں جوان بچے اور بوڑھے سبھی شامل تھے۔ میں نے سوچا کہ مسکرا کر اشارہ کروں گی اور پھر اس کا ردِ عمل دیکھتے ہو

انجان بن جاؤں گی ۔

"میں ہر گزرنے والے کا بغور جائزہ لینے لگی۔ ایک بہت ہی وجیہہ نوجوان نے مسکرا کر میری طرف دیکھا، مجھ سے برداشت نہ ہوا۔ اور میں مسکرا دی۔ جواب میں وہ بھی مسکرا دیا۔ میں نے سر کو ہلکی سی جنبش دی۔ اشارا پانے کی دیر تھی کہ وہ بجلی کی سی سرعت سے میرے فلیٹ کی سیڑھیوں کی جانب لپکا۔ میں جیسے کسی خواب سے جاگ گئی۔ یہ سوچ کر ہی میرے ہوش اُڑ گئے کہ اُوپر آ کر وہ میرے ملازموں سے معلوم نہیں کیا کچھ کہہ دے جنہیں سُن کر میرے شوہر کا وفادار ترین ملازم جوزف کئی اور مطلب نکال کر اپنے مالک تک پہنچا دے۔

"میں ڈر کے مارے کانپنے لگی۔ کسی بھی گھڑی دروازے پر دستک ممکن تھی۔ میں نے سوچا کیوں نہ میں خود ہی جا کر دروازہ کھول دوں تاکہ کسی اور کو اس کے آنے کی خبر تک نہ ہو سکے۔ میں اُسے یہ یقین دلانے کی کوشش کروں گی کہ میں نے اشارا اُسے نہیں بلکہ اپنے ایک عزیز کو کیا تھا جو پیچھے سے گزر رہا تھا۔ یقیناً وہ مجھے ایک عورت جان کر مجھ پر ترس کھائے گا اور واپس لوٹ جائے گا۔ ... مگر دروازہ کھلتے ہی وہ بلا جھجک اندر داخل ہو گیا۔

"آپ کو غلط فہمی ہو گئی ہے..... میں نے دراصل..." میری زبان ہکلانے لگی۔

"کوئی بات نہیں میری جان اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں..... ضرورت کسے نہیں ہوتی..." یہ کہہ کر وہ آگے بڑھا اور اس سے پہلے کہ میں اپنا بچاؤ کرتی اس نے مجھے اپنے سینے سے چمٹا لیا اور نہایت گرمجوشی سے مجھے پیار کرنے لگا۔ میں غصے سے کسمسا رہی تھی اور اس نے تسلی دینے کے انداز میں میرے گال تھپتھپائے اور میری کمر میں اپنے بازو حمائل کر کے مجھے اپنی خوابگاہ میں چلنے پر مجبور کر دیا۔ ڈرائنگ روم سے گزرتے ہوئے وہ ایک ایک فرنیچر کا تاجرانہ نگاہ سے جائزہ لے رہا تھا۔

"اتنے ٹھاٹ باٹ سے رہنے کے لیے تمہیں یقیناً بہت سے پیسوں کی ضرورت محسوس ہوتی ہو گی" اُس نے کہا۔

"نہیں تم غلط سمجھتے ہو..... مہربانی کر کے تم اسی وقت نکل جاؤ۔ میرا شوہر کسی بھی وقت گھر لوٹ سکتا ہے۔ اس کے آنے کا وقت بھی ہو گیا ہے۔ میں قسم کھاتی ہوں کہ تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے"۔

"بس اب زیادہ نخرے دکھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر تمہا شوہر آ بھی گیا تو میں اسے بھی چند نوٹ دے دوں گا تاکہ وہ کسی قریبی ریستورا میں جا کر گرم گرم کافی سے لطف اندوز ہو سکے"۔

اس کے چہرے پر جتنا اطمینان تھا میری حالت اتنی ہی غیر ... رینی! میز پر رکھی ہوئی تمہاری تصویر دیکھ کر وہ تم پر بھی فریفتہ ہو گیا تھ اور مجھ سے کہا تھا کہ کبھی اس حسینہ سے بھی ضرور ملاؤ۔ اس وقت گھڑی نے پانچ بجائے تھے۔ راول ہمیشہ ساڑھے پانچ بجے تک لوٹ آ تا تھا۔ میں نے سوچا کہ اگر اس کی آمد سے پہلے یہ مصیبت دفعان نہ ہوئی ضرور لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ تم تو جانتی ہو کہ یہ مرد کتنے شکی ہو ہیں..... اور پھر راول؟"

میری سوچ نے جواب دے دیا۔ پھر اچانک جیسے میرے ذہن میں ایک عمدہ ترکیب آ گئی... میرے دل نے سرگوشی کی کہ قدر جلد اس مصیبت سے چھٹکارا حاصل کر لو تمہارے حق میں بہتر ہے اور چھٹکارا حاصل کرنے کی ترکیب ایک ہی تھی.... وہ یہ کہ میں اسے جلد از جلد فارغ کر دوں۔ یہ فیصلہ کر کے میں نے آگے بڑھ کر خوابگا کے دروازے کی چٹخنی چڑھا لی۔

کہانی مکمل کرتے ہی گریٹی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ مگر اس آواز رینی کے دیوانہ وار قہقہوں میں ڈوب کر رہ گئی۔ رینی کے اس جنون پر گریٹی بھی اسے پھٹی پھٹی نظروں سے تکنے لگی۔ رینی نے خو قابو پاتے ہوئے پوچھا:

"تم نے کہا تھا کہ وہ بہت وجیہہ نوجوان تھا؟"

"ہاں۔ بے حد!"

"پھر تمہیں کس بات کی شکایت ہے؟" رینی نے اٹھلاتے ہوئے کہا

"میری جان تم نے اصل تڑپا دینے والی بات تو ابھی سُنی ہی اُس نے چلتے چلتے کہا تھا۔ کل پھر آؤں گا۔ وہ آج پھر آئے گا... ٹھ اسی وقت.... تم نہیں جانتیں وہ کتنا بے باک اور ضدی ہے۔ اُ میرے خدا میں کیا کروں؟" اس نے اپنا سر پکڑ لیا۔

رینی کچھ دیر کے لئے گہری سوچ میں کھو گئی۔ پھر سنجیدگی

بولی: "تم اُسے گرفتار کرا دو!"

"گرفتار کرا دُوں ــــ مگر کس الزام میں؟"

"یہ تو بہت آسان ہے۔ تم پولیس کو مطلع کر دو کہ گزشتہ تین ماہ سے وُہ تمہارا پیچھا کر رہا ہے اور کل تمہارے فلیٹ میں بھی گھس آیا تھا۔ ....اور دوبارہ آنے کی دھمکی دے گیا ہے۔ پولیس سے تم اپنے تحفظ کا مطالبہ کرو وہ تمہارے ساتھ دو کانسٹیبل روانہ کر دیں گے جو تمہارے اس البیلے عاشق کو گرفتار کر لیں گے۔"

"مگر ڈارلنگ، اگر اس نے....؟"

"بیوقوف مت بنو۔ پولیس تمہارے بیان کے بعد اس کے ایک لفظ کا بھی یقین نہ کرے گی۔ عورت ہونے کی وجہ سے وہ تم پر زیادہ بھروسا کریں گے۔"

"میری ہمت جواب دے گئی ہے" گریٹی نے بے چارگی سے کہا۔ وہ اب بھی اپنے آپ کو بے بس محسوس کر رہی تھی۔

"بہر حال تمہیں تو یہ کرنا ہی پڑے گا، ورنہ پھر اس کے بُرے نتائج بھگتنے کے لیے تیار رہو۔"

"مگر رینی سوچو تو سہی اگر اس نے گرفتاری کے بعد کوئی ایسی ویسی بات کہہ دی تو.....!"

"بھئی تم اپنی طرف سے گواہ پیش کر دینا اس کے ساتھ ہی ہتک عزت کا مقدمہ بھی دائر کر دینا۔ اس سے اس کی سزا میں یقیناً اضافہ ہو جائے گا۔"

حضرت سلمان فارسیؓ کو خلفائے راشدینؓ کی جانب سے پانچ ہزار درہم وظیفہ ملتا تھا۔ وہ تقریباً تیس ہزار مسلمانوں کے سردار تھے۔ جب وظیفہ آتا تھا تو اس کو وہ کھڑے کھڑے خیرات کر دیتے تھے اور خود محنت کر کے گزر بسر کرتے تھے۔

"اُسے سزا کیا ملے گی؟" گریٹی دیوار کو ٹکٹکی لگائے دیکھ رہی تھی۔

"اُسے تمہاری ہتک عزت کا معاوضہ ادا کرنا پڑے گا..... بس تمہیں ذرا ہمت دکھانی پڑے گی۔"

"ارے ہاں تم نے معاوضہ کا ذکر کیا تو مجھے یاد آیا۔ اُس نے جاتے ہوئے مجھے ایک فرانک دیا تھا۔"

"صرف ایک فرانک؟" رینی نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں"

"بھئی اگر میں تمہاری جگہ ہوتی تو اسے اپنی بے عزتی تصور کرتی ..... خیر!"

"بھلا میں اس ایک فرانک کا کیا کر سکتی ہوں؟"

رینی کچھ ہچکچائی پھر نہایت سنجیدگی سے فیصلہ کُن انداز میں بولی:

"میرے خیال میں میری جان تم اس ایک فرانک سے اپنے شوہر کے لیے کوئی تحفہ خرید لو...... اس سے زیادہ بھلا تم بھی کیا کر سکتی ہو؟"

بیوہ کا فرنیچر

تفسیر فاروقی

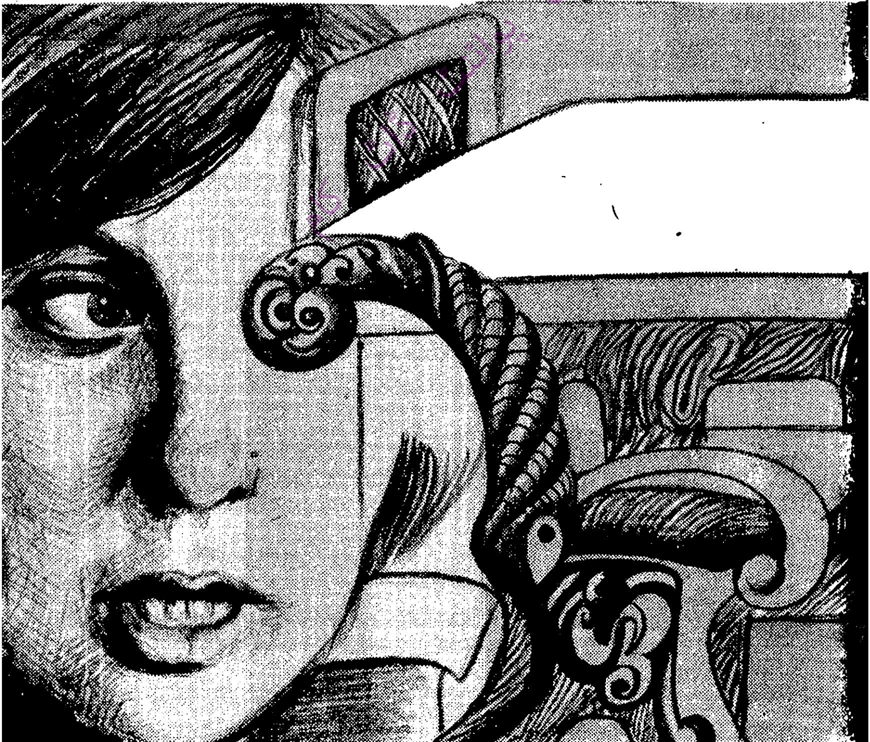
"بڑی خوشی کی بات ہے کہ تم اپنے فائنل امتحان میں کامیاب ہو گئے۔" میرے اُستاد پروفیسر حبیب نے مشفقانہ انداز میں مجھے مشورہ دیتے ہوئے کہا۔ "اب تم نہ صرف ایک ڈاکٹر بلکہ خوش قسمتی سے پُر وقار اور سنجیدہ شخصیت کے مالک بھی ہو۔ تم سخنی اور غور و فکر کے اعلیٰ اوصاف بھی تم میں موجود ہیں، مجھے یقین ہے کہ تم اپنے پیشے میں نہایت کامیاب ثابت ہو گے۔ اب تمہیں سب سے پہلے اپنی پریکٹس شروع کرنے کے لئے کسی ایسی جگہ کا انتخاب کرنا چاہئیے جہاں کوئی دوسرا ڈاکٹر نہ ہو اور اپنے قیام کے لئے دو تین کمروں کا کوئی چھوٹا سا مکان لے لو۔ اگرچہ مکان کا ملنا ان دنوں خاصا دشوار ہے لیکن تلاش کرنے پر مِل ضرور سکتا ہے۔"

"مکان مِل جانے پر اس کا اعلیٰ فرنیچر سے آراستہ ہونا بھی ضروری ہے!" میں نے سوالیہ انداز میں کہا۔

"یقیناً! کیا تمہارے چچا نے تمہارے لئے کچھ دولت نہیں چھوڑی؟"

"چھوڑی کیوں نہیں!" میں نے جواب دیا۔

"وہ کتنی ہے؟"



"صرف دس ہزار فرانک!"

"اوہ یہ تو بہت کم ہے لیکن خیر ابھی اسی سے کام چلاؤ۔ میرا خیال ہے کہ ابھی فی الحال تمہارے لئے تین کمروں کا مکان مناسب رہے گا۔ ایک ڈرائنگ ایک ڈائننگ اور ایک بیڈ روم رہا فرنیچر کا مسئلہ تو اس کے لئے تم پرانا فرنیچر خرید سکتے ہو اخباروں میں پرانے فرنیچر کی فروخت کے اشتہارات تو آتے ہی رہتے ہیں بس اُن پر نظر رکھو۔"

میں نے پروفیسر کے مخلصانہ مشورے پر عمل کرنے کا ارادہ کرلیا مشورے کا پہلا مرحلہ کسی مناسب جگہ کا بندوبست کرنا تھا جو اتفاق سے فوراً ہی طے ہوگیا اب مکان کے لئے پرانے فرنیچر کے حصول کا مسئلہ باقی رہ گیا تھا۔

خوش قسمتی سے چند روز بعد ایک روزنامے میں ایک اشتہار میری نظر سے گزرا جس کا مضمون یہ تھا:۔

برائے فروخت

"ایک بیوہ خاتون میڈم ڈی۔ ایف عنقریب ملک سے باہر جارہی ہیں اُن کے مکان کا جملہ فرنیچر جو بالکل صحیح و سالم اور نئی حالت میں ہے برائے فروخت ہے۔ ضرورت مند حضرات مندرجہ ذیل پتے پر بالمشافہ رجوع کریں۔"

بنگلہ نمبر ۲۲۴ سینٹ روڈ پیرس

یہ اشتہار دیکھتے ہی میں میڈم ڈی۔ ایف کے بنگلے پر پہنچا۔ ایک ادھیڑ عمر شخص جو سیاہ رنگ کا لباس پہنے ہوتے تھا باہر نکل کر آیا۔ میں نے اس سے اپنی آمد کا مقصد بیان کیا تو وہ مجھے ڈرائنگ روم میں بٹھا کر اندر چلا گیا۔ میں اس کی عدم موجودگی میں کمرے کے فرنیچر اور ساز و سامان کا جائزہ لینے لگا۔ کچھ دیر بعد ایک نازک اندام خاتون سیاہ ماتمی لباس پہنے کمرے میں داخل ہوئی لیکن اس کے چہرے پر غم کے اثرات بالکل موجود نہ تھے۔ اس نے مجھے بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔ میں نے ڈرائنگ روم کے فرنیچر کے متعلق جب اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا تو وہ بولی:۔

"دیکھئے آپ یہ سارا فرنیچر بہت سستے داموں خرید سکتے ہیں، میں اپنے والدین کے پاس انیٹورپ جارہی ہوں، شوہر کی وفات کے بعد پیرس میں اب میرا کوئی نہیں۔ فی الحال میں یہاں بالکل تنہا ہوں۔ صرف میرا پرانا ملازم میرے ساتھ ہے میری عدم موجودگی میں اس نے میرے شوہر کی مرتے دم تک خدمت اور تیمارداری کی ہے۔" یہ کہتے کہتے اُس کی آنکھیں نم ہوگئیں۔ میں نے اس سے معذرت کی کہ میری وجہ سے اس کے مرحوم شوہر کا غم تازہ ہوگیا۔

"نہیں، اس میں معذرت کی کوئی بات نہیں" میڈم نے رومال سے اپنے آنسو خشک کئے۔ "بات دراصل یہ ہے کہ میں ابھی تک اپنے شوہر کا غم بھلا نہیں سکی ہوں، مجھ بدنصیب کو شادی کے بعد اپنے شوہر کے ساتھ کل چھ مہینے گزارنا نصیب ہوسکے!"

"کل چھ مہینے۔؟" میں نے حیرت اور افسوس سے کہا۔

"جی ہاں! صرف چھ مہینے!" میڈم ایک سرد آہ بھرتے ہوئے بولی۔ "میری قسمت میں راحت اور خوشی کی مدت بس اتنی ہی تھی۔ میرے گھر کا سارا اثاثہ اس بات کا ثبوت ہے یہ تمام فرنیچر ہم نے شادی سے چار ماہ قبل مشہور لسرونگ کمپنی سے خریدا تھا۔ شادی کے بعد کوئی تین ماہ میں نے اپنی ماں کے ساتھ انیٹورپ میں گزارے۔ آہ! وہ زمانہ بھی کس قدر پُرلطف اور خوشگوار تھا۔ پھر میں اپنے شوہر کے پاس واپس آئی اور اپنی آنکھوں کے سامنے اُسے دم توڑتے دیکھا!"

"کیا وہ کچھ بیمار تھے؟" میں نے دریافت کیا

"ہاں وہ بیمار تو ضرور تھے لیکن اُن کی بیماری اس قدر تشویشناک نہیں تھی بلکہ معمولی شکایت تھی۔" میڈم نے افسردہ لہجے میں جواب دیا اور کچھ دیر کے لئے خاموش ہوگئی۔ میں یہ سمجھا کہ اب وہ اپنے اس قصۂ غم کو ختم کرنا چاہتی ہے لیکن اس نے دوبارہ پھر اپنے شوہر کے فضائل بیان کرنا شروع کردیئے جنہیں میں پوری توجہ سے سنتا رہا۔

اُس کی ان باتوں سے میں اس حد تک متاثر ہوا کہ مجھے اس باوفا اور شوہر پرست عورت سے ایک قلبی لگاؤ محسوس ہونے لگا۔ اب مجھے اُس کے مرحوم شوہر پر رشک آنے لگا تھا جس کے غم میں یہ سراپا اُلفت نازنین گھل رہی تھی۔

کچھ دیر تک ہم دونوں خاموش رہے۔ آخرکار اس نے خود ہی مہر سکوت توڑدی، بولی:۔

"میں شرمندہ ہوں کہ میں نے ناحق ایسی باتوں میں آپ کا

وقت ضائع کیا جو صرف میری ذات سے متعلق ہیں، میں یہ تو بھول ہی
گئی تھی کہ آپ کو فرنیچر دکھانا ہے۔ اس کمرے کا فرنیچر تو آپ دیکھ ہی
چکے ہیں، اب آئیے میں دوسرے کمروں کا فرنیچر بھی دکھا دوں۔"
یہ کہہ کر وہ اٹھی اور مجھے ڈائننگ روم میں لے گئی۔ اس کمرے
کا فرنیچر بھی اعلیٰ کوالٹی کا تھا اور مجھے بیحد پسند آیا۔ پھر وہ مجھے بیڈروم
میں لائی۔ اس میں دو مسہریاں قریب قریب بچھی ہوئی دیکھیں تو میں
نے اس سے کہا:۔

"میڈم! ابھی میں نے شادی نہیں کی ہے، میرے لئے تو
ایک ہی بیڈ کافی ہوگا۔"

میڈم نے یہ سُنکر کچھ حیرت سے میری طرف دیکھا اور پھر اپنی
نظریں جھکا کر بولی:۔

"آپ کو بہت جلد شادی کر لینی چاہیئے۔ کیا کوئی انسان تنہا
زندگی بسر کر سکتا ہے؟"

اُس کی اِس بات کا میں نے کوئی جواب نہیں دیا اور فرنیچر
دیکھ کر اُس کے ساتھ ڈرائنگ روم میں واپس آگیا۔

میں نے کل فرنیچر کی مجموعی قیمت دریافت کی تو اس نے قدرے
جھجکتے ہوئے جواب دیا۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کو کیا قیمت بتاؤں۔ فرنیچر آپ
نے دیکھا۔ بالکل نیا ہے اور اچھی حالت میں ہے۔ یہ کل فرنیچر ہم نے
۲۵ ہزار فرانک میں خریدا تھا۔"

"یہ قیمت تو بہت ہے!" میں نے پریشان ہو کر کہا

"نہیں، میرا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ آپ بھی اتنی ہی قیمت
ادا کریں جتنی ہم نے ادا کی تھی۔ اس میں کمی ہو سکتی ہے۔
آپ بیس ہزار دیدیجئے گا" میڈم نے کاروباری انداز میں
جواب دیا۔

میرے پاس جتنی رقم تھی یہ قیمت اُس سے کم و بیش دوگنی تھی
اس لئے میں اُلجھن میں پڑ گیا۔ وہ میرے تردّد کو تاڑ گئی اور فوراً بولی۔

"اچھا۔ آپ پندرہ ہزار فرانک پر راضی ہیں؟ اس کے ساتھ
میں آپ کو یہ رعایت بھی دے سکتی ہوں کہ نصف قیمت آپ اب
ادا کر دیں اور بقیہ چھ ماہ بعد لیجئے یہ قبول ہے؟"

یہ قیمت اور طریقۂ ادائیگی میرے لئے کسی حد تک قابلِ قبول
تھا چنانچہ میں اس پیشکش پر راضی ہو گیا۔

میڈم کے حسن و جمال اور حسنِ اخلاق سے میں بہت متاثر ہوا
اور میں نے اپنا دل اس کی جانب کھنچتا ہوا محسوس کیا۔

میں نے اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے رقم کی ادائیگی کے لئے
دو روز کی مہلت چاہی۔

"بہتر ہے" اس نے کہا "لیکن براہ کرم اس کا خیال رکھئے گا کہ
میں اس ہفتے کے آخر میں اینٹورپ کے لئے روانہ ہو جاؤں گی۔"

"اتنی جلدی؟"

"جی ہاں! میں تو بہت پہلے ہی چلی گئی ہوتی لیکن گھر کے ساز و
سامان کی وجہ سے اب تک نہ جا سکی۔ دراصل میں سب کچھ فروخت کر دینا
چاہتی ہوں۔ میں اپنے ماضی کی ایک یادگار بھی باقی نہیں رکھنا چاہتی" وہ
یہ کہہ کر کچھ دیر چپ رہی پھر مسکراتی ہوئی بولی:۔

"اچھا تو میں جمعرات کو آپ کا انتظار کروں گی۔"

اور میں نے دو روز بعد آنے کا حتمی وعدہ کیا اور اس سے رخصت ہوا۔

وہاں سے واپسی پر میں سیدھا اپنے اُستاد جیکب کے پاس
پہنچا اور انہیں فرنیچر کی خریداری کے بارے میں تفصیل سے بتایا وہ میری
بات سُن کر کہنے لگے۔

"میں سمجھتا ہوں کہ اُس بیوہ عورت کے حسن و جمال نے تمہیں مسحور
کر لیا ہے اور تم اس کی چکنی چپڑی باتوں میں آگئے ہو۔ پندرہ ہزار
فرانک نقد! کیا تم اس کو سستا سودا سمجھتے ہو؟"

میں نے دل میں سوچا واقعی یہ تو سچ ہے کہ اس عورت نے
میرے ہوش و حواس چھین لئے ہیں لیکن پھر بھی وہ ایک غمزدہ بیوہ ہے
جس کی ہر ممکن طریقے سے مدد کرنا میرا فرض ہے۔ میں اس سے دوبارہ
ملنے کی تمنا میں اس درجہ بیتاب تھا کہ بدھ کی تمام رات میں نے
آنکھوں میں کاٹ دی۔ ایسا کیوں تھا یہ میں سمجھنے سے قاصر تھا۔ آخرکار
جمعرات کو سویرے ہی میں نے نہایت اہتمام سے کپڑے تبدیل کئے اور
میڈم وی۔ الف کے بنگلے پر پہنچ گیا۔

اس کے ملازم نوئیل نے جو باہر لان میں کھڑا ہوا پودوں کو پانی
دے رہا تھا مجھے دیکھتے ہی میڈم کو آواز دی۔

"پرسوں جو صاحب تشریف لائے تھے وہ آگئے ہیں۔"

میڈم اطلاع پاتے ہی فوراً باہر آئی اور مجھے ڈرائنگ روم

میں لے گئی۔

اس بار میں نے اس کے حسن میں کچھ زیادہ دلکشی اور جاذبیت محسوس کی۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

" میں بڑی بے چینی سے آپ کا انتظار کر رہی تھی۔ کل فرنیچر کے دو خریدار آئے تھے۔ انہوں نے فرنیچر کے بہت زیادہ دام لگائے لیکن آپ سے تعلق کی بنا پر میں نے اُن لوگوں سے معاملہ طے کرنا مناسب نہیں سمجھا۔" پھر کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولی۔

" ہاں! کل ایک اور صاحب بھی تشریف لائے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ میں گھر کے جملہ سامان اور فرنیچر کے ساتھ شاید خود کو بھی فروخت کر رہی ہوں۔۔!"

" کاش! اس وقت میں یہاں موجود ہوتا تو اس شخص کو اس کی بدتمیزی کا مزا چکھا دیتا۔" میں نے غصے سے تلملاتے ہوئے کہا

"آپ تو ایک معزز اور شریف آدمی ہیں۔ میرا ملازم زوتیل بھی اس بدتمیزی کو برداشت نہ کر سکا اور اُسے دھکے دے کر باہر نکال دیا۔"

میں اُس شخص کی بدتمیزی اور گستاخی پر پیچ و تاب کھا رہا تھا! شاید اب میں میڈم کے لئے اپنائیت کا جذبہ محسوس کرنے لگا تھا۔ وہ مجھ سے اس قدر قریب بیٹھی ہوئی تھی کہ میں اس کے جوان جسم کی آنچ بڑی بے چینی اور شدت سے محسوس کر رہا تھا۔ اس عالم میں دفعتہً غیر ارادی طور پر ایک انجانے جذبے کے تحت میں نے ہاتھ بڑھا کر اسے اپنی آغوش میں کھینچ لیا اور اظہار تمنا کر بیٹھا۔

" میں شادی کروں گا... لیکن تم سے..... صرف تم سے! کیا تم نے اس روز مجھ سے یہ نہیں کہا تھا کہ کوئی انسان تنہا نہیں رہ سکتا۔؟"

مجھے یقین تھا کہ میری محبت اس کے دل سے مرحوم شوہر کی یادوں کو مٹا دے گی اور وہ اپنے ماضی کو بھول کر میری بیوی بننا اپنی خوش قسمتی تصور کرے گی۔

اُس نے کچھ گھبرا کر کچھ شرما کر رومال سے اپنا چہرہ چھپا لیا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ رو رہی ہو۔ میں سمجھا کہ شاید میری محبت پا کر اس کے دل میں شوہر کا غم پھر تازہ ہو گیا ہے۔ میں اُسے تسلی دینے لگا۔ لیکن وہ رو کہاں رہی تھی وہ تو ہنس رہی تھی! پھر یکایک وہ قہقہہ لگاتے ہوئے بولی۔

" کیسا دلچسپ تماشا ہوا!"

میں یہ سمجھا کہ وہ میری توہین کر رہی ہے۔ میری محبت کا اُڑا رہی ہے، پھر وہ طنزیہ انداز میں مسکراتی ہوئی بولی۔

" دیکھئے میں آپ کی بیوی نہیں بن سکتی۔"

" کیوں؟ کیا تم بیوہ نہیں ہو؟"

" بیشک میں بیوہ ہوں۔" اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "لیـ شوہر والی بیوہ! میرا شوہر زندہ ہے۔ یہ ملازم زوتیل جو سر دنگ کمپـ مالک ہے میرا شوہر ہے! بات دراصل یہ ہے کہ جب ہماری فـ کی بزنس ٹھپ ہو گئی تو ہمیں اپنا مال فروخت کرنے کے لئے مجـ یہ طریقہ اختیار کرنا پڑا۔ ہم اب تک اس طرح تین مرتبہ اپنا ـ نکال چکے ہیں۔ اگر یہ سلسلہ ایک سال تک جاری رہ سکا تو ہم بہـ جلد اپنا خسارہ پورا کر لیں گے۔ کہیئے میں ایک بیوہ عورت کا پاـ کس خوش اسلوبی سے ادا کر رہی ہوں! میرا شوہر زوتیل جب اپنے کی باتیں سنتا ہے تو بہت رنجیدہ ہوتا ہے! لیکن مجبوری ہے بجـ کے اور کوئی صورت بھی تو نہیں۔ آپ خفا نہ ہوں میں جانتی ہـ کہ آپ ایک شریف اور معزز شخص ہیں اسی لئے میں نے اپنا یہ راـ آپ پر منکشف کر دیا۔

اب آپ یہ سارا فرنیچر بارہ ہزار فرانک میں خرید سکتے ہـ اور جب آپ یہ خرید لیں گے تو آپ کے مکان میں اس کو آراسـ کرنے کا کام میں خود بلا معاوضہ انجام دوں گی!"

یہ سُن کر مجھے چند لمحوں کے لئے ایسا محسوس ہوا جیسے کـ نے مجھے سجے سجائے شیش محل سے اُٹھا کر کسی ویران کھنڈر میں پہنچ دـ

الو الٹے

ایم۔ اے۔ ذہین جعفری

ڈائریکٹر کے کمرے کے باہر اُمیدواروں کی ایک لمبی قطار لگی ہوئی تھی۔ یہ تمام افراد آج کے اخبار میں شائع ہونے والا ایک اشتہار دیکھ کر آئے تھے۔ جو ایک کمپنی کی طرف سے اسٹینو ٹائپسٹ کی ایک آسامی پُر کرنے کے لیے شائع ہُوا تھا۔

کمپنی کا "سینیر اسٹینو ٹائپسٹ" جو اُمیدواروں کا ٹیسٹ لے رہا تھا۔ بڑی دیر سے اُس فیشن ایبل لڑکی پر تاؤ کھا رہا تھا جو نہ ٹائپ جانتی تھی نہ شارٹ ہینڈ۔ لیکن پھر بھی نجانے کیوں آ گئی تھی.... جب وہ نتائج کی فہرست لے کر ڈائریکٹر کے پاس گیا تو اُس نے اُس فیشن ایبل لڑکی پر خاص طور سے تنقید کی۔

"جناب.... یہ لڑکی بالکل ناکارہ ہے دیکھئے.... پانچ منٹ میں صرف یہ ایک لائن ٹائپ کی ہے۔"

"اچھا.... اسے میرے پاس بھیج دو۔"

لڑکی ایک شانِ بے نیازی سے ڈائریکٹر کے کمرے میں داخل ہُوئی.... ڈائریکٹر نے سر اُٹھا کر اس کی طرف دیکھا بڑی پُرکشش لڑکی تھی حُسن و دلکشی کا مرقع اور پھر اس پر چُست لباس اور سر پر بالوں کا کوہان۔

"تشریف رکھئے۔"

"شکریہ باس۔"

"بظاہر تو آپ بہت اچھی اسٹینو نظر آتی ہیں لیکن جس نے آپ کا ٹیسٹ لیا ہے وُہ کہتا ہے کہ آپ پانچ منٹ میں صرف ایک سطر ٹائپ کر سکی ہیں۔"

"نو سر۔ اُس نے ابھی میرا ٹیسٹ ہی کہاں لیا ہے.... وہ میرا ٹیسٹ کیسے لے سکتا ہے۔ وہ تو بالکل گاؤدی ہے.... آپ میرا ٹیسٹ لے کر دیکھیں۔"

"لیکن.... وُہ کہتا ہے کہ آپ پانچ منٹ میں صرف ایک سطر...."

"جناب اُس کے کہنے سے کیا ہوتا ہے.... وُہ ٹائپ رائٹر بھی تو کام کا نہیں ہے۔ کی بورڈ (KEY BOARD) کتنا ہیوی ہے اس کا.... میں تو ایک منٹ کے لئے بھی ایسے واہیات ٹائپ رائٹر پر کام نہیں کر سکتی۔ مجھے افسوس ہے کہ....."

"ارے.... سُنیئے تو سہی.... ہم آپ کے لیے نئے ٹائپ رائٹر کا انتظام کر دیں گے۔"

"ہاں.... تب تو ٹھیک ہے۔ دیکھئے نا باس.... میری تو انگلیاں بھی دُکھنے لگی ہیں اس ایک سطر کو ٹائپ کرتے کرتے" یہ کہہ کر اُس نے اپنے دونوں ہاتھ ڈائریکٹر کے آگے کر دیے...... ڈائریکٹر نے اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیے.... اُلٹ پلٹ کر دیکھا.... سہلایا.... مسلا.... دبایا اور پھر اس طرح تشویش بھری نظروں سے دیکھنے لگا جیسے سچ مچ اُسے لڑکی کی نرم و نازک انگلیوں پر ترس آ گیا ہو اور اب وہ اس کے درد کا مداوا اور اپنی زیادتی کی تلافی کرنا چاہتا ہو۔

"آپ بالکل فکر نہ کیجئے۔ میں کل ہی آپ کے لیے کمپنی سے ایک نیا ٹائپ رائٹر منگوا دوں گا۔"

"لیکن سر.... میں آپ کے اسٹینو کی ماتحتی میں کام نہیں کروں گی۔"

"یہ تم سے کون کہتا ہے.... تم اس کی صورت بھی نہ دیکھنا۔"

"تھینک یو باس.... آپ کتنے اچھے ہیں۔"

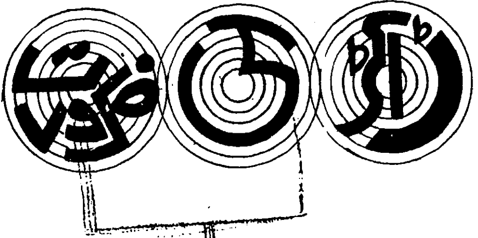
"بس تو پھر۔ کل سے تم ڈیوٹی پر آ جاؤ۔ ہاں.... تھوڑا بہت تو شارٹ ہینڈ آتا ہی ہو گا۔" ——— "ہاں ہاں۔ کیوں نہیں.... پہلے میں جس فرم میں ملازم تھی اُس کے مالک نے مجھے شارٹ ہینڈ سکھایا تھا.... ویسے میں لانگ ہینڈ (LONGHAND) میں بھی کافی تیز لکھ لیتی ہُوں۔ اس کے علاوہ شارٹ ہینڈ کی ایک کتاب میں ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتی ہُوں۔ جو لفظ سمجھ میں نہیں آتا کتاب میں دیکھ کر لکھ لیتی ہُوں۔ وہاں مجھے آٹھ سو روپے ماہانہ ملتے تھے..... یہ رقم میرے لئے ناکافی تھی اس لئے میں نے وُہ ملازمت چھوڑ دی۔"

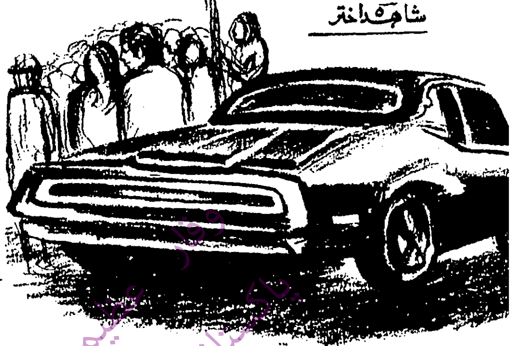
"وُہ تو سب ٹھیک ہے.... لیکن.... آٹھ سو روپے۔!"

"یس باس۔ وہ مجھے آٹھ سو روپے دیتے تھے۔ بلکہ وُہ تو اب بھی آفر کر رہے ہیں لیکن باس.... میں اب اتنی معمولی تنخواہ پر نوکری نہیں کروں گی۔"

"اچھا تو ٹھیک ہے۔ ہم تمہیں ایک ہزار روپے ماہانہ دیں گے۔ تم ہماری کمپنی میں کام کرو۔ کل تمہیں اپائنٹمنٹ لیٹر مل جائے گا۔"

اُس فیشن ایبل خاتون کو ملازمت تو مِل گئی لیکن وہاں اسٹینو کی جگہ اب بھی خالی تھی۔





شاہدہ اختر

ڈاکٹر اپنے نجی کمرے میں مریضوں کی فائلوں کا بغور معائنہ کر رہا تھا اور کبھی کبھار ایک آدھ پر کچھ جملے لکھتا جاتا تھا۔ اسی محویت کے عالم میں اچانک اس کی بیوی کمرے میں داخل ہوئی۔ عموماً وہ کام کے وقت ڈاکٹر کے کمرے میں نہیں جاتی تھی۔

"تمہارا ٹیلی گرام آیا ہے۔" ہیلڈا نے معذرت کے لہجے میں کہا۔

"ابھی ابھی ملا ہے۔"

ڈاکٹر جارج نے اثبات میں سر ہلایا اور ہیلڈا سے وہ لفافہ لے لیا اور پھر تار پڑھنے لگا، اس کے چہرے پر پریشانی کے آثار تھے اس نے تار لوٹاتے ہوئے کہا۔ "خود ہی پڑھ لو۔"

ہیلڈا نے جلدی جلدی تحریر پڑھی۔

"مشکل میں ہوں۔ ۲۰۰ مارک کی اشد ضرورت ہے ٹیلی گرام کے ذریعے منی آرڈر کر دیں۔ خط میں تفصیلات بھیج رہا ہوں۔"

رچرڈ

"اس لڑکے نے سمجھ کیا رکھا ہے۔" ڈاکٹر جارج نے غصے سے کہا "کس قدر آسانی سے تار بھیج کر ۲۰۰ مارک مانگ لئے جیسے یہ رقم کوئی حیثیت ہی نہیں رکھتی۔ ہر ماہ اسے جو رقم بھیجی جاتی ہے کیا وہ اس کے لئے کافی نہیں؟ اس رقم سے کوئی بھی شخص ٹھاٹ سے زندگی گزار سکتا ہے۔"

ہیلڈا خاموش کھڑی رہی اسے اپنے بیٹے کی طرف سے فکر لاحق ہو گئی جو میونخ کالج میں زیر تعلیم تھا۔ اس نے سوچا، نہ جانے میرا بچہ کس مشکل میں پھنس گیا۔

"آخر کیا وجہ ہو سکتی ہے اس کی؟" جارج نے جذبات زدہ آواز میں پوچھا۔ اسے معلوم تھا کہ اس کی بیوی کے پاس بھی اس سوال کا کوئی معقول جواب نہیں ہے۔ وہ بے چینی سے کمرے میں ادھر ادھر ٹہلنے لگا۔ "اس نے پہلے بھیجی ہوئی رقم کیسے ختم کر دی؟ پھر ۲۰۰ مارک کی اتنی اشد ضرورت کیسے آن پڑی.... ہیلڈا مجھے اس کی یہ حرکتیں سخت ناپسند ہیں!" وہ ٹہلتے ہوئے زیر لب کہہ رہا تھا۔

"اس نے یقیناً کوئی برا کام نہیں کیا ہو گا۔" ہیلڈا نے بیٹے کی وکالت کرنا چاہی۔ "ممکن ہے اس سے کوئی غلطی سرزد ہو گئی ہو جو وہ ابھی ہمیں بتانا نہیں چاہتا۔ جارج تم یقین کرو ہمارا بیٹا کوئی برا لڑکا قطعی نہیں ہے۔" جارج نے غصے اور پریشانی کے عالم میں اثبات میں سر ہلا دیا۔

"بھئی مجھے معلوم ہے لیکن میں رقم بھیجنے سے پہلے یہ جاننا ضرور چاہوں گا کہ اسے کس قسم کی مشکل پیش آئی ہے۔ ۲۰۰ مارک کوئی معمولی رقم تو نہیں ہوتی۔"

"لیکن تم اس مشکل میں اسے.... ہمیں اس کی مدد تو کرنا چاہیئے جارج" ہیلڈا کے چہرے سے رنگ اڑا ہوا تھا۔

"ہیلڈا! میں خود میونخ جا کر حالات معلوم کروں گا۔ آج ویسے بھی لنچ کے بعد آف ہے۔ میں اپنی ہی گاڑی میں چلا جاؤں گا اور رات تک لوٹ آؤں گا۔"

"سچ مچ جارج!" ہیلڈا نے بے اطمینانی سے پوچھا۔ جیسے اسے جارج کی بات کا یقین نہ آ رہا ہو۔ "میں تمہارے لئے کچھ تیاری کر لوں۔ لیکن جارج تم بہرحال اسے رقم دے دینا۔"

"مجھے جانے تو دو!" یہ کہہ کر جارج پھر اپنی میز پر جا بیٹھا اور مریضوں کی فائلیں دیکھنے لگا۔

تقریباً تین بجے ڈاکٹر جارج کو اپنے مریضوں سے فرصت ملی، اسی وقت وہ اپنی گاڑی میں میونخ کے لئے روانہ ہو گیا۔ آج معمول سے کچھ زیادہ ہی مریض آ گئے تھے اور ڈاکٹر کو خلافِ توقع زیادہ دیر تک رکنا پڑ گیا تھا۔

ہائی وے پر جارج نے اپنی گاڑی کی رفتار کچھ تیز کر دی۔ وہ رچرڈ

کے متعلق سوچ رہا تھا جو نہ جانے کس مشکل میں گرفتار تھا، نہ جانے اسے اتنی بڑی رقم کی ضرورت کیوں پیش آ گئی؟ کیا یہ بہتر نہ ہوتا کہ وہ یہ رقم ٹیلی گرام کے ذریعے بھجوا دیتا؟ کیا وہ اپنے بیٹے کے لئے ایک بار بھی فراخدلی کا مظاہرہ نہیں کر سکتا تھا؟ کیا وہ خود اپنا زمانہ طالب علمی اتنی جلدی بھول گیا؟ خود اسے کتنی بار یہ خیال آیا تھا کہ اس کا باپ خرچ کے لئے رقم بھیجتے ہوئے ایک آدھ بار فراخدلی کا ثبوت دے!!!

"اب یہ سب سوچنے سے کیا فائدہ۔" جارج نے زیر لب بڑبڑاتے ہوئے گاڑی کی رفتار کچھ اور بڑھا دی۔ "اب واپس جانے کا سوال تو پیدا ہی نہیں ہوتا.... دو گھنٹے سے بھی کم وقت میں وہ میونخ پہنچ جائے گا اور سارے حالات اسے بخوبی معلوم ہو جائیں گے۔"

گاڑی کی تیز رفتار اسے ایک طرح کا سکون پہنچا رہی تھی۔ اس نے سوچا کہ اس نے رچرڈ تک جلد از جلد پہنچنے کی اپنے تئیں بھرپور کوشش کی ہے۔ ایک بار پھر اس پر گھبراہٹ اور پریشانی کا غلبہ ہو گیا۔ آخر رچرڈ کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا ہو گا؟ —— کہیں وہ جوا تو نہیں کھیلنے لگا تھا؟ لیکن آج کل کے طالب علموں میں یہ عادت عام نہیں تھی۔" اس نے اپنے سوال کا خود ہی جواب دیا۔ "یقیناً آج کل کے نوجوان کلبوں میں جا کر بھاری رقم خرچ کرنے کے متحمل نہیں ہو سکتے —— لیکن رچرڈ؟ ممکن ہے کہ رچرڈ میں یہ عادت پیدا ہو گئی ہو۔"

"رچرڈ برا لڑکا نہیں تھا۔ یقیناً نہیں۔ لیکن نوجوانی خود بری چیز ہے اس زمانے میں کوئی بھی خطا سرزد ہو سکتی ہے ممکن ہے نشے کی حالت میں اس سے کوئی غلطی ہو گئی ہو اور اگر ایسا ہوا تو یقیناً ہوش میں آنے کے بعد اسے افسوس ہوا ہو گا۔" جارج کا خیال ایک بار پھر جوئے کی طرف گیا اور اس نے رچرڈ کو اس بری عادت سے دور رکھنے کی تدبیروں پر غور کرنا شروع کر دیا۔ "کیا رچرڈ کو کالج سے نکال لیا جائے؟ لیکن اس کا یہ مطلب ہو گا کہ اس کی پیشہ ورانہ تعلیم کا خاتمہ ہو جائے.... رچرڈ کو بڑا آدمی بنانے کا خواب جو اس نے اور ہیلڈا نے رچرڈ کے بچپن سے دیکھنا شروع کر دیا تھا۔ اسی روز سے جب جارج کو ڈسپنسری جاتا دیکھ کر رچرڈ نے زور زور سے رونا شروع کر دیا تھا۔

ان خیالات نے جارج کو پریشان کر کے رکھ دیا۔ اسٹیرنگ وہیل پر اسے اپنے ہاتھوں میں پسینہ آتا ہوا محسوس ہوا —— رچرڈ ان کا اکلوتا بیٹا تھا اور اس کے بارے میں وہ جتنا سوچتا اس کی پریشانی بڑھتی جاتی "میرے بیٹے میں آرہا ہوں۔ رچرڈ میری جان میں آرہا ہوں۔" گاڑی کی رفتار بڑھتی جا رہی تھی اور شاید جارج کو اس کا احساس نہ تھا۔ وہ جلد از جلد رچرڈ کے پاس پہنچنا چاہتا تھا۔ "سب ٹھیک ہو جائے گا، بس مجھے وقت پر پہنچ جانا چاہیئے۔"

دور راستے سڑک کے کنارے ایک کار کھڑی دکھائی دی۔ کار کے قریب بہت سے لوگ جمع تھے۔ ایک نوجوان اپنے ہاتھ میں گتے کا ایک بورڈ لئے کھڑا تھا جس پر جلی خط میں لکھا تھا۔

"ڈاکٹر کی ضرورت ہے"

جارج سمجھ گیا کہ ضرور کوئی سنگین حادثہ ہوا ہے۔ "ڈاکٹر کی ضرورت ہے!! ہر کار والا کچھ دیر کے لئے گاڑی کی رفتار کم کرتا۔ گتے کے بورڈ کی طرف بے اعتنائی سے دیکھتا اور پھر تیز رفتاری سے گاڑی نکال لے جاتا۔ بورڈ پر سرخ صلیبی نشان کے نیچے لکھے ہوئے حروف کسی درخواست سے زیادہ حکم کا درجہ رکھتے تھے خصوصاً کسی ڈاکٹر کے لئے —— "تمہارا رکنا بیکار ہے" اس کے دل نے سرگوشی کی۔ "رچرڈ تمہارا انتظار کر رہا ہے اسے تمہاری مدد کی ضرورت ہے" مگر اسے معلوم تھا کہ اس حادثے کے زخمی یا زخمیوں کو بھی اس کی اتنی ہی شدید ضرورت ہے۔ ممکن ہے کوئی زخمی موت کے بہت قریب ہو اور اس کا خون سڑک پر پھیل رہا ہو۔ ہو سکتا ہے کہ کسی اور ڈاکٹر کے پہنچنے تک وہ زخمی اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ اس کی گاڑی کی رفتار میں معمولی کمی واقع ہوئی کیونکہ آگے جانے والی گاڑیوں کی رفتار بھی مدھم پڑ گئی تھی۔ "اتنی بڑی شاہراہ ہے، یقیناً کچھ ہی دیر میں کوئی دوسرا ڈاکٹر یہاں سے گزرے گا۔ ممکن ہے اس کی چوٹ زیادہ شدید نہ ہو۔ اب تک ایمبولینس گاڑی کو کسی طور اطلاع تو دے دی ہو گی۔"

اس کی گاڑی کا پہیہ گھوم رہا تھا اور وہ ہر لحظہ اس بورڈ سے قریب ہوتا جا رہا تھا جس پر جلی حروف میں ایک درخواست، ایک اپیل ایک حکم درج تھا ——

"ڈاکٹر کی ضرورت ہے"

جارج کے ذہن میں وہ الفاظ گھومنے لگے جب اس نے ڈاکٹری کی تعلیم مکمل ہونے پر اپنے ساتھیوں کے ساتھ ڈگری وصول کرتے ہوئے عہد کیا تھا کہ "اس کے لیے فرض کی بجا آوری سب سے مقدم ہو گی، وہ اپنے فرض کی پکار پر ہر وقت مستعد رہے گا۔" اسے اپنی پیشانی پر پسینے کے ہلکے ہلکے قطرے نمودار ہوتے محسوس ہوئے۔

"پتا نہیں اس زخمی کو دیکھنے میں کتنا وقت لگ جائے ——؟" اس نے آخری بار اپنے ضمیر کو تھپکی دینے کی کوشش کی۔ "رچرڈ میرا انتظار کر رہا ہے۔ مجھے اس کے پاس جلد پہنچنا ہے۔ مجھے اس کے پاس جلد پہنچنا ہے! ممکن ہے وہ کسی بڑی مصیبت میں ہو؟ مجھے جانا ہے۔ ضرور جانا ہے۔"

اب وہ اس بورڈ کے قریب پہنچ چکا تھا۔

"ڈاکٹر کی ضرورت ہے۔"

ہجوم کے قریب سے گزرتے ہوئے اس کی نظر دو راہگیروں پر پڑی جو زخمی کی تکلیف کا ازالہ کرنے کے لئے اپنی سی کوشش کر رہے تھے، سڑک خون سے رنگی ہوئی تھی۔ اچانک اُس نے گاڑی روک دی۔ "ایک انسانی جان خطرے میں ہے مجھے اس کی مدد ضرور کرنی چاہئیے"۔ وہ گاڑی سے اُترا، اُسے خوشی تھی کہ وہ ایک فرض شناس ڈاکٹر کا کردار انجام دینے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ اُس نے پچھلی سیٹ سے اپنا ہینڈ بیگ اُٹھایا اور ہجوم کو چیرتا ہوا آگے بڑھا۔

"کیا تم ڈاکٹر ہو"؟ کسی نے پوچھا۔

ڈاکٹر نے اثبات میں سر ہلایا اور لوگوں نے راستہ چھوڑ دیا۔ اُس نے جھک کر زخمی کی طرف دیکھا جو بے ہوش تھا، اس کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی وہاں اس کا بیٹا رچرڈ خون میں لت پت موت و زیست کی کشمکش میں مبتلا تھا۔ ڈاکٹر جارج کو اپنے حواس مجتمع کرنے میں کچھ وقت لگا لیکن پھر وہ تندہی سے ایک ڈاکٹر کے فرائض انجام دینے لگا۔ اس نے دو تین انجکشن دیے جس سے خون بہنا کم ہوگیا۔ سرسری معائنے سے ظاہر ہوا کہ رچرڈ خطرے سے باہر ہے۔

"میں بس یہاں سے گزر رہا تھا..." ڈاکٹر زیر لب بڑبڑایا۔ کچھ دیر میں ایمبولینس پہنچ گئی۔ اور وہ اپنے بیٹے کو لے ہسپتال روانہ ہوگیا۔ اس کے سامنے رچرڈ بے ہوش پڑا ہوا تھا — اور وہ سوچ رہا تھا۔

"زندگی کتنی کٹھن ہے اور اس زندگی میں کتنے صبر آزما مرحلے آتے ہیں جب انسان کی قوتِ فیصلہ جواب دے جاتی ہے اور جب وہ ہمت کر کے کوئی مثبت قدم اُٹھا لیتا ہے تو کتنی مسرت اور طمانیت اسے محسوس ہوتی ہے"۔

رچرڈ کے ہوش میں آنے پر معلوم ہوا کہ اس کی موٹر سائیکل کا میونخ میں کسی گاڑی سے حادثہ ہوگیا تھا جس پر پولیس نے اس کا چالان کر دیا تھا اور اسے ۲۰۰ مارک کا جرمانہ ادا کرنے کے لیے صرف دو دن کا وقت دیا گیا تھا۔ رچرڈ نے تفصیلات ایک خط میں لکھ کر روانہ کر دیں لیکن جب شام تک اُسے تار کا جواب نہ ملا تو وہ خود ہی رقم لینے کے لئے آ رہا تھا، کیونکہ اسے ڈر تھا کہ شاید اس کے والدین اس کی فوری ضرورت کی وجہ جانے بغیر اسے رقم نہ بھیجیں اور پھر اس موٹر پر اس کی موٹر سائیکل کو حادثہ پیش آ گیا۔

ڈاکٹر جارج نے جرمانے کی رقم ادا کی۔ اس نے اپنے بیٹے سے ایک لفظ بھی نہ کہا کیونکہ اسے معلوم تھا کہ کسی تنبیہہ کے بغیر رچرڈ آئندہ احتیاط سے گاڑی چلائے گا — اور پھر اس واقعے سے خود ڈاکٹر جارج کی شخصیت میں موجود انسان اور ڈاکٹر نے اپنی زندگی کا بہترین سبق حاصل کیا تھا۔ ✿ ✿ ✿

فتح!

ایمائیل زولا
شعیب علی عامر



یہ کہانی فرانس کے مشہور ادیب ایمائیل زولا نے لکھی ہے۔ زولا ۱۸۴۰ء میں پیدا ہوئے تھے۔ انہوں نے عالمی ادب کو شاہکار تحریریں دی ہیں۔ دُنیا کی تقریباً ہر بڑی زبان میں اُن کی بلند پایہ تخلیقات کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ زولا کے موضوعات "آفاقی ہیں"۔ جذبات نگاری میں انہیں کمال حاصل ہے۔ انسانی ذہنی کشمکشوں کو جس خوبصورتی اور شدت سے اُنہوں نے رقم کیا ہے وہ اُنہی کا حصّہ ہے۔ زولا نے ۲۰ سال کی عمر سے لکھنا شروع کیا تھا۔ اُردو میں ان کے ایک ناول "تھریسا" کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ جن حضرات نے تھریسا پڑھی ہے، زولا کی "فنی عظمت" سے کچھ نہ کچھ واقف ہوں گے۔ زیرِ نظر کہانی اصل میں کوئی کہانی نہیں، ایک "تاثر" ہے دیکھیے اپنے قاری کو کس طرح سے محسوس کراتے ہیں — ادارہ

جبرِ وقت

جرمن فوجی افسر نے اپنے آدمیوں کے ساتھ پل پر قبضہ کیا اس کے لئے سب سے زیادہ تشویشناک یہ بات تھی کہ وہ یہاں کے راستوں سے نا واقف تھا سامنے جنگلات کا ایک طویل سلسلہ تھا اور جرمن فوجی افسر کو کچھ پتا نہ تھا کہ وہ اسے کس طرح اور کہاں سے پار کر کے آگے بڑھ سکتا ہے اسے ایک راہنما کی ضرورت تھی۔ پل پر قبضے کے بعد خوش قسمتی سے اسے تین آدمی مل گئے تھے فرانسوا کا شوہر دومنیک اور فرانسوا کا بوڑھا باپ ٹرلیسر۔ ان میں دومنیک سب سے زیادہ مناسب تھا۔ جوان، صحت مند، چست، مستعد اور سمجھ دار۔ جرمن فوجی افسر نے اسے اپنی حراست میں لے لیا۔

اس وقت دن کے تین بجے کا وقت رہا ہو گا۔ آسمان سیاہ بادلوں کے پیچھے چھپا ہوا تھا۔ طوفان کا زور ٹوٹ چکا تھا لیکن اس کے اثرات کہیں قریب ہی اپنا زور اب بھی دکھا رہے تھے۔ کچھ دیر پہلے دھوپ میں چمکنے والی وادی رد گرد سی کالے کالے بپھرے ہوئے سرکش بادلوں کی وجہ سے تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اس تاریکی کے ساتھ ہی فرانسوا پر بھی منحوس پرچھائیاں منڈلانے لگیں۔ جرمن فوجی افسر نے اس کے شوہر دومنیک کو حراست میں لے کر اسے اپنی راہنمائی کرنے پر مجبور کرنا شروع کر دیا۔ فرانسوا دوپہر سے اس ناقابلِ برداشت اذیت میں مبتلا تھی۔ اس کا شوہر جرمنوں کی قید میں تھا اور ابھی تک یہ نہ معلوم ہو سکا تھا کہ اس کا کیا انجام ہو گا اور جرمن فوجیوں نے دومنیک کے لئے کیا سوچا یا فیصلہ کیا ہے؟

اس کا باپ ٹرلیسر فرانسوا سے التجائیں کرتا رہا کہ وہ چپ چاپ پل کا صحن چھوڑ کر کہیں دُور ہو جائے لیکن اس نے اپنے باپ کی التجاؤں کو نظر انداز کر دیا اور اپنے شوہر کی واپسی کا انتظار کرتی رہی۔ اس کے علاوہ اسے یہ بھی یقین تھا کہ فرانسیسی فوجی دستے ضرور آئیں گے۔

جرمن فوجی افسر نے کمرے کو بند کر لیا اور دومنیک سے گفت و شنید ہونے لگی۔ رات ختم ہو گئی، دُوسری صبح طلوع ہوئی لیکن جرمن فوجی افسر اور دومنیک کمرے سے باہر نہ نکلے۔ فرانسوا کا دل ڈوبا جا رہا تھا کیونکہ اسے معلوم تھا کہ کمرے کی چار دیواری کے اندر اس کے شوہر دومنیک کی زندگی کا فیصلہ ہو رہا ہے۔ فرانسوا نے نہایت عاجزی سے جذبۂ عبُودیت کے زیرِ اثر دُعا کے لئے اپنے دونوں ہاتھ بلند کئے۔ "او خُدا تو کہاں ہے؟ وہ دومنیک کو مار دیں گے!"

قریب ہی ٹرلیسر بھی بیٹھا تھا۔ اس کا چہرہ سپاٹ تھا۔ وہ بالکل سادے دِل دیہاتی کی طرح تھا۔ اس نے فرانسوا کی مناجات میں کوئی دخل نہ دیا، جو کچھ ہو رہا تھا یا ہونے والا تھا ٹرلیسر اس کی شدت سے خوفزدہ تھا نہ ہراساں۔ جو کچھ ہونا ہے وہ تو ہو گا ہی، ٹرلیسر اس کے لئے پریشان ہونے کو تیار نہ تھا۔

فرانسوا کی سسکیاں اُبھریں، وہ کراہ کراہ کر کہہ رہی تھی۔ "خدایا! وہ اسے مارنے جا رہے ہیں، میں کیا کروں؟" ٹرلیسر نے اسے کھینچ کر اپنے رانوں پر گرا لیا، اس کے لئے فرانسوا اب بھی ننھی سی بچی تھی۔ اسی لمحے جرمن فوجی افسر اپنے دو سپاہیوں کے ساتھ دومنیک کو کمرے کی چار دیواری سے باہر لے آیا۔

"نہیں۔ بالکل نہیں!" دومنیک پُر وقار لہجے میں کہہ رہا تھا۔ "میں راہنمائی نہیں کر سکتا، میں مرنے کے لئے تیار ہوں۔"

جرمن فوجی کی آواز گونجی۔ "خوب اچھی طرح سوچ لو میرے لئے یہ چنداں دشوار کام نہیں کہ میں تمہارے انکار پر کسی دُوسرے راہنما کا انتظام کر لوں۔ میں تمہیں تمہاری زندگی کی پیشکش کر رہا ہوں، میں تم سے تمہاری آزادی کی قیمت وصُول کرنا چاہتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ تم ہمیں جنگل کے راستے سے مانٹرڈی تک پہنچا دو۔"

دومنیک نے حقارت سے جرمن فوجی کو دیکھا اور لاپروائی سے منہ دُوسری طرف پھیر لیا۔

جرمن فوجی افسر پھر چیخا۔ "تو تم ابھی تک اپنی ضد پر قائم ہو؟"

دومنیک نے سادہ سا جواب دیا۔ "گولی چلا کر معاملہ ختم کر دو۔"

دومنیک نے تھوڑی دُور پر کھڑی ہوئی فرانسوا کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں

التجا تھی، خاموش التجا۔ گویا وہ کہہ رہی تھی "جرمن فوجی کی بات مان لو۔ غداری میں کوئی حرج نہیں، تم اپنی جان بچالو۔" لیکن ٹرلیسر آگے بڑھا اور دومینک اور فرانسوا کے درمیان حائل ہوگیا، اُس نے خدا کا شکر ادا کیا کہ جرمن فوجی ایک بے بس مجبور اور ہوش و حواس سے عاری عورت کے مضطربانہ اشارے نہیں سمجھ سکے تھے۔

بوڑھا ٹرلیسر بڑبڑایا۔ "فرانسوا! اس نے اپنے لیے صحیح راہ کا انتخاب کیا ہے۔ اس کے لیے مرجانا زیادہ بہتر ہے۔"

رائفل بردار فوجی تیار کھڑے تھے۔ ان کا افسر ابھی تک اس زعم میں تھا کہ وہ دومینک کو خوفزدہ کرکے اس کے ارادے کو بدل دے گا۔ وہ اس کے چہرے پر اس کے ارادے کی کمزوری کے آثار تلاش کر رہا تھا لیکن وہاں کچھ بھی نہ تھا۔

ہر چیز خاموش تھی، دُور کہیں گرج سُنائی دے رہی تھی۔ اس سنّاٹے کو ایک چیخ نے ختم کردیا۔ "فرانسیسی آگئے، فرانسیسی آگئے۔" سُرخ پتلونوں کی ایک قطار دلدل پر جنگل کے کنارے کنارے آگے بڑھتی ہوئی نظر آرہی تھی۔ جرمن فوجیوں میں ابتری پھیل گئی وہ مغلظات بکتے اور حلق سے ناقابلِ فہم آوازیں نکالتے ہوئے اِدھر اُدھر دوڑنے لگے۔ ابھی تک ایک گولی بھی نہ چلائی گئی تھی۔ فرانسوا چیخی۔ "فرانسیسی! فرانسیسی۔" اس کے دونوں ہاتھ فضا میں بلند ہوگئے۔ اس وقت وہ پاگل لگ رہی تھی۔ اُس نے اپنے باپ ٹرلیسر کی گرفت سے رہائی حاصل کی اور دونوں بازوؤں کو اُوپر اُٹھاتے ہوئے ہسٹریائی انداز میں ہنستی ہوئی فرانسیسیوں کی طرف دوڑی۔ "آخر کار تم لوٹ آگئے، اور ٹھیک وقت پر آئے۔ دومینک ابھی تک زندہ ہے اب وہ زندہ رہے گا۔"

دفعتہً گولی چلنے کی آواز نے اسے چونکا دیا، ایکبارگی اُس نے مُڑ کر پیچھے دیکھا جرمن فوجی افسر بڑبڑا رہا تھا۔ "اُن کے آنے سے پہلے ہی ہم اس کا قصہ پاک کردیں گے۔"

اور وہ دومینک کو اپنے دونوں ہاتھوں سے دھکیلتا ہُوا پتھر والی دیوار کے پاس لے گیا اور فوجی دستے کو گولی چلانے کا حکم دیا، جب فرانسوا مُڑی تھی اس نے دیکھا کہ دومینک زمین پر گر چکا ہے اور ایک درجن گولیاں اس کے جسم کو چھلنی کرچکی ہیں۔ یہ سب کچھ اتنا اچانک، غیر متوقع اور دومینک کی زندگی سے پُرامید ہوجانے کے بعد ہُوا تھا کہ اس کی آنکھوں سے ایک آنسو بھی نہ نکلا، بس وہ جہاں کھڑی تھی وہیں کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ اس کی ذہنی قوت سلب ہوچکی تھی، اس کی آنکھیں دومینک کے مُردہ جسم پر جم کر رہ گئیں۔ پھر اس نے حرکت کی اور آہستہ آہستہ چل کر دومینک کی لاش سے چند قدم کے فاصلے پر جاکر کھڑی ہوگئی۔ اس نے بڑی حسرت سے اپنے شوہر کی لاش کو دیکھا اور پھر ایک بچّے کی طرح اپنے ہاتھوں سے بے مقصد اور مبہم اشارے کیے جرمن فوجیوں نے اب اس کے باپ ٹرلیسر کو بطور یرغمال اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔

جرمن فوجی افسر خوب اچھی طرح یہ سمجھ چکا تھا کہ اب وہ یہاں سے بچ کر نکل اس نے پھرتی سے اپنے آدمیوں کی صف بندی کی! وہ اپنی قیمتی جانوں کو داؤ دینے کا تہیہ کرچکے تھے اور اب صُورتِ حال یہ تھی کہ جرمن فوجی بل کے محافظ تھے اور فرا پھر بڑی تیزی کے ساتھ مقابلہ شروع ہوگیا۔ دونوں طرف سے گولیاں چلنے اور آدھ گھنٹے کے دوران ایک لمحے کے لیے بھی گولیوں کا یہ طوفان نہ تھا اسی لمحے کا ایک بڑا ٹہنا شیل لگنے سے بھاری گونج کے ساتھ نیچے آرہا۔ فرانسیسیوں کا توپخانہ بڑھا اور وادی رود کراس کو جانے والی اہم ترین شاہراہ پر قابض ہوگیا۔ لڑائی زیادہ تک جاری نہ رہ سکی توپ کے گولوں سے پُرانا پل مکمل طور پر تباہ ہوچکا تھا۔ اس کی آدھ اُڑ چکی تھی وہ دیواریں اندر کی طرف گر گئی تھیں ٹوٹی پھوٹی دیواروں کے اُوپر چڑھی آلوچی کی خوبصورت بیل اب چیتھڑوں کی مانند نظر آرہی تھی۔ مختلف قسم کا ملبہ نالے کے پر تیر رہا تھا۔ دیوار کے ایک بڑے شگاف سے فرانسوا کے کمرے کا چھوٹا پلنگ دکھائی رہا تھا۔ اس کی کھڑکیوں پر لگے ہوئے برف جیسے سفید پردے اب بھی اپنی جگہ مو انہیں شاید بہت احتیاط سے لگایا گیا تھا۔

فرانسیسی فوجی طوفان کی طرح آگے بڑھے اور جلد ہی دست بدست سنگینوں کی لڑائی کا آغاز ہوگیا۔ ابر آلود فضا میں یہ خوبصورت وادی مذبح معلوم دے رہی تھی وسیع مرغزار خوف اور دہشت سے اس منظر کو دیکھ رہا تھا ایک طرف سرو کے درختوں کی طویل قطار تھی تو دُوسری طرف جنگل جھکی ہوئی چھت ندارد دیواروں کی طرح لڑنے کو اپنے گھیرے میں لیے ہوئے تھے۔ فطرت کی آغوش میں ڈوبے ہوئے دہشت انگیز ماحول میں چشموں اور نالوں کے بہنے کی ہلکی ہلکی نرم نرم آوازیں سسکیوں اور کراہوں کے مشابہ

فرانسوا ابھی تک اپنی جگہ سے نہ ہلی تھی۔ وہ دومینک کے مُردہ جسم کے پاس دُبک بیٹھ گئی تھی۔ ٹرلیسر کو ایک بھٹکی ہوئی گولی موت کی نیند سُلا گئی۔ جرمن فوجیوں کا صفایا کیا جاچکا تھا اور پل کو آگ لگا دی گئی تھی۔ اس عالم میں فرانسیسی کیپٹن اپنے فوجیوں کے ساتھ میں داخل ہوگیا۔ یہ اُس کی پہلی فتح تھی۔ جوش سے اس کا چہرہ سُرخ ہوگیا تھا، فتح کی خوشی سے اس کا جسم اکڑ گیا۔ وہ خوش دلی سے مُسکرایا پھر اچانک اس کی نگاہ دیوانی فرانسوا پر پڑی جو اپنے باپ اور شوہر کی لاشوں کے درمیان دبکی ہوئی تھی۔ ان کے اِردگرد پل کے کھنڈرات میں سے ابھی تک دُھواں اُٹھ رہا تھا۔ کیپٹن کی آنکھوں میں ان کے لیے جذبۂ احترام سمٹ آیا۔ اس نے بہادری سے انہیں تلوار کی سلامی دی اور فتح مندی کے احساس سے چلّایا۔

"نصرت!
کامرانی!!
فتح!!!"

غلام روحیں

سب رنگ ڈائجسٹ کا ایک نیا اور پُراسرار سلسلہ

شاہد علی کا ایک چھوٹا سا خاندان تھا، ماں باپ اور ایک معصوم بہن۔ مکان ان کا اپنا تھا۔ وہ بڑی عُسرت مگر عزت کی زندگی بسر کرتے تھے۔ شاہد علی نے اپنی تعلیم جاری رکھنے کے لئے دو ایک ٹیوشنیں کر رکھی تھیں۔ وہ خود ایف اے کے دوسرے سال میں پڑھتا تھا۔ خوش قسمتی سے اسے ایک مال دار بیرسٹر راشد حسین نے دو سو روپے ماہوار پر اپنی نوجوان لڑکی کو پڑھانے کے لئے ملازم رکھ لیا۔ رشیدہ بڑی آزاد خیال اور ماڈرن لڑکی تھی۔ اس نے پڑھا پڑھایا تو خاک

شاہد علی درّانی

تحریر:۔ اکبر حسین افندی

پانچویں قسط

گذشتہ قسطوں کے مکمل خلاصے کے بغیر





نہیں البتہ شاہد علی سے اظہارِ اُلفت شروع کر دیا، اس نے شاہد علی سے بہت آگے کی باتیں کیں اور شادی کے لئے اصرار کیا۔ اصل میں وہ اپنا ایک سنگین اور حیا سوز جُرم شاہد علی سے شادی کر کے چھپانا چاہتی تھی۔ مگر شاہد علی نے اسے سختی سے مسترد کر دیا اور نتیجتہً اس کی ملازمت جاتی رہی۔ رشیدہ نے اپنی اس توہین کا بڑا ہولناک انتقام لیا۔ اس نے اپنے زیورات شاہد علی کے گھر رکھوا کر اُسے سات سال کی قید کرا دی۔ شاہد علی اور اس کے غریب والدین کی ایک نہ سُنی گئی، اس کی ماں اس صدمۂ جانکاہ کی تاب نہ لاسکی، مر گئی۔ اس کی نوجوان بہن پر مجرمانہ حملے کئے گئے اور اس نے خودکشی کر لی۔ باپ بھی چل بسا۔ سات سال بعد جب وہ رہا ہوا تو اس کے دوست اکبر کے سوا کوئی اسے خوش آمدید کہنے والا نہ تھا، کوئی گھر نہ تھا۔ وہ اکبر کے ہاں رہا اور اب اسے کہیں ملازمت نہ مل سکی، یہ دنیا اس کے لئے تنگ ہو گئی۔ رشیدہ اس عرصے میں شادی کر کے لندن چلی گئی تھی اور رشیدہ کے باپ کے تموّل اور تکبّر میں کوئی فرق نہ آیا۔ شاہد علی کے سینے میں انتقام کی آگ بھڑک رہی تھی۔ مگر وہ ایک بے بس شخص تھا پھر اسکے دوست اکبر حسین نے اسے مشورہ دیا کہ وہ میاں صاحب کے پاس جائے۔ سُنا ہے جن کے پاس روحیں آتی ہیں۔ ان کی دعا میں بڑی تاثیر ہے۔ اکبر حسین نے میاں صاحب کا تذکرہ کچھ اس عقیدت سے کیا کہ شاہد رات کو اسے اطلاع دیئے بغیر اس پہاڑی کی جانب چل پڑا جہاں میاں صاحب مقیم تھے۔ حالانکہ اکبر نے اسے سختی سے منع کیا تھا کہ چراغ جلنے کے بعد پہاڑی کا رُخ نہ کرنا۔

شاہد علی کسی نہ کسی طرح رات گئے پہاڑی پر پہنچ گیا جہاں ایک سفید ریش بزرگ نے اچانک نمودار ہو کر اسے حیرت زدہ کر دیا۔ بزرگ نے اسے واپس جانے کی ہدایت کی مگر شاہد علی نہ مانا آخر اسے میاں صاحب کا دیدار کرنے کی اجازت اس شرط پر مل گئی کہ وہ میاں صاحب کے حجرے میں جو کچھ دیکھے اس کا تذکرہ کسی اور سے نہ کرے۔ شاہد علی نے وعدہ کیا اور بزرگ سفید دھوئیں میں تبدیل ہو کر اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔ حجرے کے قریب پہنچ کر اس نے دروازے کی جھری سے آنکھیں لگا دیں اور اندر جو کچھ دیکھا وہ اس کے اوسان خطا کر دینے کے لئے کافی تھا۔ اندر دو چراغ جل رہے تھے میاں صاحب مراقبے میں بیٹھے تھے ان کے سامنے دری پر ایک حسین و جمیل لڑکی باندیوں کی طرح سر جھکائے کھڑی تھی، ایک طرف ایک پنجرہ لٹک رہا تھا جس میں ایک طوطا مردانہ آواز میں عجیب و غریب آوازیں نکال رہا تھا، سارا ماحول اسرار سے پُر تھا۔ اس نے دیکھا کہ میاں صاحب نے لڑکی سے کچھ سوالات کئے جس کے جوابات اس نے اس طرح دیئے جیسے اسے ہر بات کا علم ہو۔ جب سوال و جواب کا یہ سلسلہ ختم ہوا تو وہ لڑکی دھوئیں میں تبدیل ہو کر آناً فاناً وہاں سے غائب ہو گئی، وہ ایک روح تھی جسے میاں صاحب نے طلب کیا تھا۔ اپنی آنکھوں سے میاں صاحب کا یہ کرشمہ دیکھ کر شاہد علی پر کپکپی طاری ہو گئی، وہ وہاں سے گرتا پڑتا بھاگا اور بے ہوش ہو گیا۔ صبح جب وہ اُٹھا تو اکبر کے گھر میں تھا۔ اسے تیز بخار آ گیا اور اس کے لئے اٹھنا بیٹھنا مشکل ہو گیا۔ جب اس کی حالت زیادہ بگڑ گئی تو اس نے اپنے دوست اکبر سے اصرار کیا کہ "وہ اسے میاں صاحب کے پاس لے چلے"۔ اکبر اسے پہاڑی پر اپنی گود میں اُٹھا کر لے گیا۔ جہاں شاہد علی نے میاں صاحب سے اس رات اپنی نادانی کی معافی مانگی، میاں صاحب نے اُسے تنبیہہ کی اور دعائیں دیں۔ شاہد علی کی طبیعت ٹھیک ہوتی گئی اور اسے ایک چھوٹی سی ملازمت بھی مل گئی۔ مگر دُکان دار کو جب یہ علم ہوا کہ وہ سزا یافتہ ہے اور اس نے راشد حسین کے ہاں چوری کی تھی تو اسے فوراً نکال دیا گیا۔ شاہد علی اس بات سے بہت دل برداشتہ ہوا۔ اس کا دل اس دنیا سے اُچاٹ ہو گیا۔ اسے خود سے اور سارے انسانوں سے نفرت ہو گئی۔ اس کے دل میں انتقام کی آگ بھڑک اٹھی۔ اس کا بس چلتا تو خون کی ندیاں بہا دیتا۔ آخر زندگی سے بیزار ہو کر وہ میاں صاحب کے پاس آ گیا اور ان سے التجا کی کہ وہ اسے اپنے قدموں میں رہنے کی اجازت دے دیں۔ میاں صاحب اس دل شکستہ اور منتشر مزاج نوجوان کی درخواست پر شش و پنج میں پڑ گئے اور پھر انھوں نے اجازت دے دی۔ اور یہ ایک بہت بڑی بات تھی۔ شاہد علی کا اس سعادت پر خوشی کے مارے بُرا حال تھا۔

پھر وہ میاں صاحب کے ساتھ رہنے لگا۔ اب اس پہاڑی پر ایک اور انسان کا اضافہ ہو گیا تھا۔ مغرب کے بعد یہاں جنوں کا قبضہ ہو جاتا۔ رفتہ رفتہ شاہد علی کی تمام جنوں سے دوستی ہو گئی۔ ابوالحسن بھی ایک جن تھے ان کی ایک لڑکی دُرِ شہوار تھی جو شاہد علی کا خاص خیال رکھتی تھی۔ یہ سارا ماحول پُر اسرار تھا، یہاں شاہد علی کو عجیب و غریب، محیّر العقول تجربے ہوئے۔ میاں صاحب کو اُس نے بہت بڑا بزرگ پایا، وہ یقیناً روشن ضمیر بزرگ تھے۔ ہر ماہ کے آخری بدھ کو میاں صاحب کے ہاں عالم و فاضل لوگوں کی ایک نشست جما کرتی جس میں ایک پنڈت اونکار ناتھ بھی شریک ہوتا تھا، وہ بڑا کینہ پرور شخص تھا مگر میاں صاحب نے نہ جانے کیوں اسے ڈھیل دے رکھی تھی۔ وہ گستاخی کرتا تھا اور میاں صاحب اسے معاف کر دیتے تھے۔ شاہد علی کو سات سال اس پہاڑی پر علومِ روحانی کے حصول میں لگ گئے اس عرصے میں میاں صاحب نے اسے سب کچھ سکھایا مگر روحوں کو طلب کرنے کا علم نہیں سکھایا۔ آخر ایک دن انھوں نے شاہد علی کو پند و نصائح کے بعد وہ آخری وظیفہ بھی بتا دیا جس سے روحیں طلب کی جا سکتی

تھیں۔ شاہد علی نے اپنا وظیفہ مکمل کیا۔ اس عمل کے فوراً بعد اسے اپنے دوست اکبر کی بہن کی شادی کے سلسلے میں شہر جانا پڑا۔ وہ سات سال بعد پہاڑی سے نیچے اُترا۔ شہر میں اس کا بے پناہ استقبال ہوا۔ ہجوم عقیدت سے اس کے تانگے کے پیچھے دوڑنے لگا۔ اس نے بازار سے گزرتے ہوئے بیرسٹر راشد حسین کی کوٹھی دیکھی جہاں اُس کی نوجوان لڑکی ثمینہ اس کے جلوس کو دیکھ رہی تھی۔ راشد حسین کا خیال آتے ہی شاہد علی مشتعل ہوگیا اسکے دل میں انتقام کی آگ بھڑکنے لگی۔ جب دوپہر کو وہ واپس پہاڑی پر پہنچا تو میاں صاحب نے ہجوم کے سامنے شاہد علی کو اپنا جانشین مقرر کیا۔ اسکے بعد وہ نڈھال ہوکر گر پڑے۔ شاہد علی نے انھیں اندر حجرے میں چارپائی پر ڈال دیا اور خود باہر لوگوں کو صبر کی تلقین کرنے آگیا جب وہ واپس اندر گیا تو چارپائی خالی پڑی تھی اور میاں صاحب غائب ہوگئے تھے۔

میاں صاحب کہاں چلے گئے یہ وہ نہ جان سکا۔ ان کے وصال کے بعد اس نے میاں صاحب کے رشد و ہدایت کا سلسلہ جاری رکھا۔ اب وہ ایک باوقار اور صاحب کرامت بزرگ تھا۔ اس کی زبان میں تاثیر تھی۔ وہ ایک بے نیاز فرد تھا، اس نے خود کو عبادت و ریاضت کے لئے وقف کردیا دنیا سے اسے کوئی رغبت نہ تھی۔ شام کو جب سب لوگ چلے جاتے تو وہ ابوالحسن جن اور اس کی لڑکی دُرِ شہوار کے پاس چلا جاتا۔ وہ دونوں اسے اپنے خاندان کا فرد سمجھتے تھے۔ شاہد علی نے بیرسٹر راشد حسین کو بھی بُھلا دیا تھا۔ اکبر اس کے پاس آتا رہتا اس کی دعاؤں سے وہ بہت آسودہ حال ہوگیا تھا۔ ہر مہینے کے آخری بدھ کو حسب معمول نشست جمتی تھی جس میں اودنکار ناتھ بھی آتا تھا اس کا انداز وہی گستاخی اور بے ادبی کا تھا۔ ایک دن اس نے ایک شخص کو شاہد علی کا امتحان لینے کے لئے بھیجا شاہد علی اسے فوراً پہچان گیا، اس نے اسے مفلوج کرکے پہاڑی کے نیچے پھنکوا دیا تاکہ اودنکار ناتھ کو عبرت ہوجائے۔ مگر اودنکار ناتھ نہیں مانا۔ وہ جب بدھ کو نشست میں آیا تو اس نے اشتعال انگیز گفتگو کی اور شاہد علی کو خوفزدہ کرنے کیلئے اپنے بیروں کا وحشیانہ اور خوفناک رقص دکھایا۔ شاہد علی اس کی ماورائی قوت کے اس مظاہرے کو مسکرا کر دیکھتا رہا اس نے تحمل کا ثبوت دیا لیکن وہ بے چین رہا۔ رات کو اس نے پہلی بار روحوں کی طلبی کا وظیفہ شروع کیا، بہت مشکل مرحلوں کے بعد دوشیزہ الماس کی روح اس کے سامنے آئی اس نے عالم ارواح کے متعلق بڑی دلچسپ باتیں کیں۔ شاہد علی نے بعد کو اپنے والدین اور بہن کی ارواح سے ملاقات کی انھیں دیکھ کر اس کے پُرانے زخم تازہ ہوگئے۔ سب نے اسے سمجھایا مگر وہ باز نہ آیا۔ اس نے الماس کی روح کو طلب کرکے راشد حسین کے خاندان کو اپنے عتاب کا نشانہ بنوایا۔ ثمینہ پاگل ہوگئی اور اس نے شارع عام پر اپنی دیوانگی کا شرمناک مظاہرہ کیا۔ شاہد علی خوش تھا کہ راشد حسین رُسوا ہو رہا ہے لیکن اس کی یہ خوشی عارضی ثابت ہوئی اسے معلوم ہوا کہ اودنکار ناتھ نے ثمینہ کو ٹھیک کردیا ہے۔ اس پر پھر غیظ و غضب کا شدید دورہ پڑا۔ اس نے ایک جلالی وظیفہ پڑھ کر ثمینہ کو پھر اسی عذاب سے دوچار کردیا اسے یقین تھا کہ شام تک یا کل صبح ناکام ہونے کی صورت میں اودنکار ناتھ ضرور آئے گا۔ —— اب آپ آگے پڑھیئے۔

پہاڑی پیر

حسبِ معمول لوگوں کا ہجوم تھا۔ میں جب حجرے سے باہر آیا تو روزانہ آنے والے دو عقیدت مند رحیم خان اور شمشیر علی نے بے تابانہ سب سے پہلے اُٹھ کر میرے ہاتھوں کو بوسہ دیا۔ تھوڑی دیر پہلے جس مجمع میں ہلکی ہلکی سرگوشیوں کی آوازیں اُبھر رہی تھیں اب وہاں میری آمد کے بعد مکمل خاموشی تھی۔ میں نے ایک طائرانہ نظر مجمع پر ڈالی۔ جتنی نگاہیں جو میری سمت اٹھی ہوئی تھیں جُھک گئیں۔ میں نے اپنے لئے یہ عقیدتیں دیکھ کر دل میں خدا کا شکر ادا کیا اور دُعا مانگی: "اے کائنات کے خالق! اے خدا۔ کوئی شُبہ نہیں جسے تُو چاہے عزت دے جسے چاہے ذلت دے۔ اے میرے پروردگار، میرے قلب کو اپنے نُور سے معمور رکھ۔ مجھے راستی کی توفیق دے اور ان مُصیبت زدہ لوگوں کے دُکھ درد دُور کر۔ یہ لوگ میرے پاس بڑی اُمیدیں لے کر آئے ہیں۔" اپنے دل میں دُعا مانگ کر جب میں ایک مونڈھے پر بیٹھ گیا تو رحیم خان اور شمشیر علی نے روزانہ کے مطابق حاضرین کو صبر و تحمل کی تلقین کی —— میاں صاحب کے زمانے سے ان دونوں نے از خود یہ کام سنبھال لیا تھا مجمعے میں خاموشی سکون اور نظم برقرار رکھنے کا کام انہی کا تھا۔ بہت کم ایسا ہوا تھا کہ اُنہوں نے ناغہ کیا ہو۔ اُن کی عدم موجودگی میں اُبوالحسن یہ کام کرتے تھے۔ ویسے اُبوالحسن عام طور پر ان لوگوں کے سامنے ہی رہتے۔ کسی کو معلوم نہیں تھا کہ اُبوالحسن ایک بزرگ جن ہیں اور صرف اُبوالحسن ہی نہیں اس پہاڑ پر بسنے والے بہت سے جن مجمع میں شامل ہوجاتے۔ رحیم خان اور شمشیر علی کے رویے سے آج تک کسی کو شکایت نہیں ہوئی تھی۔ شام کو یہ دونوں عام لوگوں کے ساتھ واپس چلے جاتے۔ آنے والوں میں اکثریت اُن

لوگوں کی تھی جو صرف عبادت کرنے یہاں جمع ہو جاتے۔ یہ سب میرے اشارے کے منتظر رہتے اور ہزار بہانے میری خدمت کے ڈھونڈتے۔ میاں صاحب کے منع کرنے کے بعد کہیں یہ لوگ باز آئے تھے ورنہ ان میں کوئی پھول لے کر آتا۔ کوئی نذرانے، کوئی چڑھاوے، کوئی اُن کی ضرورت کی کوئی چیز۔ میاں صاحب کے وصال کے بعد ان لوگوں نے یہ سلسلہ میرے ساتھ بھی شروع کیا مگر میں نے سختی کے ساتھ تاکید کر دی تھی کہ یہ پہاڑی نذرانے، پھول اور تحفے تحائف کی جگہ نہیں ہے۔ صرف محبتیں کافی ہیں، صرف عقیدتیں بہت ہیں، سو میں نے وہ آنکھیں دیکھی ہیں جن میں میرے لئے فنا ہونے کی آمادگی موجود ہوتی اور میں نے وہ چہرے دیکھے ہیں جو میرے چہرے کے تاثرات سے چمک پاتے یا مُرجھا جاتے۔

میرے یہ لوگ میرے لیے جیتے مرتے تھے۔ کون اس دُنیا میں کسی سے اتنا ربط رکھتا ہے اور میں سمجھتا کہ میری تخلیق ان لوگوں کے لیے ہوئی ہے جب میں ان ستم رسیدہ لوگوں کے ساتھ بیٹھتا تو اُن کا ہو جاتا اور مجھے محسُوس ہوتا کہ میں ایک عظیم مقصد کی خاطر زندگی گزار رہا ہوں میرے ہاتھ آسمان کی طرف اٹھتے تو روتی ہُوئی بوڑھی عورتوں کو قرار آجاتا غمزدہ اور مظلوم چہروں پر مسرت کی لہر دوڑ جاتی۔

میں اُس دن صبح سے شام تک ان لوگوں کی رُوداد غم سُنتا رہا۔ اُس دن مجھے شدت سے کسی کا انتظار تھا۔ اتنی مصرُوفیت کے بعد بھی میں اونکار ناتھ کو بھلانے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ مجھے یقین تھا کہ اونکار ناتھ کو جب سمیتا کا ذہنی توازن بگڑ جانے کی خبر ملے گی اور جب وہ اپنے جنتر منتر میں ناکام ہو جائے گا تو میرے پاس مدد لینے ضرُور آئے گا۔ مگر عصر گزر گئی، شام ہو گئی اور پہاڑی انسانوں سے خالی ہو گئی! اونکار ناتھ نہیں آیا۔ اس بات نے مجھے تشویش میں ڈال دیا۔ مغرب کے وقت میں ابوالحسن کی طرف نکل گیا۔ نمازِ مغرب میں نے پہاڑی کے مجمع کے ساتھ پڑھی۔ وُہ حسبِ معمُول میرے قریب جمع ہو گئے لیکن اُس دن میں نے اُن سے کوئی بات نہیں کی۔ میں سیدھا ابوالحسن کے گھر آگیا اور ایک پلنگ پر دراز ہو گیا۔ دُرِ شہوار میری یہ حالت دیکھ کر دوڑی دوڑی میرے پاس آئی۔

"آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟" اس نے محبتوں کے ساتھ پُوچھا ــــ

"ہاں دُرّی۔ طبیعت ٹھیک ہے لیکن بس ذرا جی نہیں لگ رہا۔" میں نے نیم دِلی سے جواب دیا۔

"کیا بات ہے؟ آپ نے دوپہر کا کھانا بھی نہیں کھایا۔" وُہ میرے سَر کے قریب کھڑی ہو گئی۔ "آپ مجھے بھی نہیں بتائیں گے؟" اس کا یہ جُملہ نہ جانے کیوں مجھے اچھا لگا۔ ایسے جُملے یقیناً میرے لئے فرحت کا باعث ہوتے تھے۔ میں نے اسے معنی خیز نظروں سے دیکھا۔ میرے اِس انہماک پر اس کی پلکیں جُھک گئیں۔ میں نے اس کا نرم و نازک ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

"دُرّی! بعض اوقات جی چاہتا ہے کہ اپنے نفس کی تمام تر سازشوں سے تمہیں آگاہ کر دُوں۔ میں سوچتا ہوں کہ کاش میں ایک عام آدمی ہی ہوتا۔ غالباً میں اس فضیلت کا متحمل نہیں ہو پا رہا ہوں میاں صاحب نے جس سے مجھے نواز دیا ہے ــــ میرے اندر کوئی کھوٹ ضرُور ہے۔"

"نہیں نہیں ــــ آپ ان دنوں اُلجھنوں میں گرفتار ہیں۔ ایسے آزمائشی لمحے ضرُور آتے ہیں۔ آپ مجھے سب کچھ بتا دیا کیجیے۔ کسی کو بتانا ضرُوری ہوتا ہے۔ آپ ایک جلیل القدر بزرگ ہیں۔ آپ کے اندر کوئی کھوٹ نہیں۔ کھوٹ تو باہر کی دُنیا میں ہے۔ وہی شیطانی قوتیں نیک لوگوں کو پریشان کرتی رہتی ہیں۔" دُرِ شہوار نے میرے ہاتھوں کو بوسہ دیتے ہوئے کہا۔

"دُرّی۔ تمہاری قربت میں گداز اور تمہاری گفتگو میں شیرینی ہے۔ مجھے ایک ایسے شخص کی ضرُورت شدت سے محسُوس ہوتی ہے جو میرے اندر کے فشار پر مجھے ٹوک سکے۔ یہ سبھی لوگ میری عزت کرتے ہیں۔ مجھے ان لوگوں میں اپنے قد کی طوالت سے اکثر بڑی اُلجھن ہوتی ہے۔ میں تنہائی محسُوس کرنے لگتا ہوں۔ تم دُرّی۔ مجھے چھوٹے میاں صاحب نہ سمجھا کرو۔ اکبر میرا دوست تھا، مگر وہ بھی عملاً مجھ سے بچھڑ گیا۔ اس کے انداز میں بھی میرے لیے قدر و منزلت آگئی۔ تم بھی وہی کرتی ہو ــــ اِس عزّت و تکریم، آداب اور حفظِ مراتب سے میرا دَم گھُٹنے لگتا ہے ــــ" میں نے دُرِ شہوار سے جذباتی لہجے میں کہا۔ "دُرّی ــــ کم از کم میں تم سے اِس برتاؤ کا طالب نہیں ہُوں۔"

میں نے محسُوس کیا کہ دُرِ شہوار کا چہرہ میری اس جذباتی گفتگو سے سُرخ ہو گیا ہے۔ اس کے ہاتھ میں ایک جنبش ہُوئی اور میں نے تشنگیوں کی تمام حسرتوں کے ساتھ اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ وہاں مجھے ایک سمندر

نظر آیا۔ میں نے اس کی جھلملاتی آنکھوں میں صرف اپنا چہرہ دیکھا۔ میرے لیے یہ لذت بالکل نئی تھی۔ مجھ پر ایک عجیب سا کیف طاری تھا۔ جذب کی اس کیفیت میں بات ہی کچھ اور تھی۔ پھر اچانک مجھے نہ جانے کیا خیال آیا۔ میں نے دُرِشہوار کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ اور اس طلسمی فضا کے سحر کو ختم کرنے کے لئے میں نے دُرِشہوار سے قہوہ طلب کیا۔ وہ مسکراتی ہوئی رخصت ہوگئی اور میں سوچنے لگا ___ "کہیں میں کسی لغزش کا مرتکب تو نہیں ہو رہا۔"

مجھے زیادہ سوچنے کا موقع نہیں ملا۔ ابوالحسن آگئے۔ آتے ہی انہوں نے میری مزاج پُرسی کی اور میری بدلی ہوئی حالت پر تشویش کا اظہار کیا۔ ابوالحسن نے بہت دبے دبے لہجے میں میری گزشتہ روز کی گوشہ نشینی کی شکایت کی۔ میں بہت سکون سے ابوالحسن کی باتیں سُنتا رہا۔ اس لئے کہ وہ میرے اتالیق بھی تھے۔ علم و فضل میں میرا مرتبہ بلند ہو جانے کے بعد بھی ہم دونوں کے درمیان ماضی کے تعلق کی وضعداری موجود تھی۔ جب ابوالحسن اپنے تجربوں کی روشنی میں مجھے اپنے پند و نصائح سے نواز چکے، تو میں نے بڑی سنجیدگی سے کہا:

" یہ سچ ہے کہ خدا نے میرے ساتھ فیاضی سے کام لیا ہے۔ لیکن میں ابھی تک اپنے ذہن کے اس شر کو دبا نہیں سکا جس کا تذکرہ میں نے پہلے بھی آپ سے کیا ہے۔ جب سے میں نے اپنے مرحوم والدین اور بہن کی روحوں سے ملاقات کی ہے۔ میں بہت مضطرب رہا ہوں۔ میں نے انہیں آزردہ خاطر دیکھا ہے ابوالحسن۔ میں نے اپنی بہن کے آنسوؤں کو دیکھا ہے۔ میں ان ظالموں کو بھلانے کی طاقت اپنے اندر نہیں پاتا جنہوں نے میرا گھر برباد کیا تھا۔ ابوالحسن میں بہت مجبور ہوں۔"

" لیکن معاف کر دینے میں جو سکون اور سربلندی ہے وہ سزا دینے میں نہیں۔ آپ درگزر کر دیجیے۔ یہ آپ کے منصب کے مطابق نہیں۔" ابوالحسن نے کہا۔

" مجھے معلوم ہے۔ مجھے معلوم ہے۔ لیکن میری یکسوئی ختم ہو گئی ہے۔ میں پُرسکون رہ کر عبادت و ریاضت میں خود کو مصروف کرنا چاہتا ہوں۔ مگر میں کیا کروں کہ میری بہن کی صورت مجھے چاروں طرف گھورتی نظر آتی ہے۔ اس پہاڑی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جہاں وہ موجود نہ ہو۔"

میری باتوں سے ابوالحسن کے چہرے پر تشویش کے تاثرات ہر لمحے گہرے ہوتے جا رہے تھے۔ انہوں نے ایک بار میرے ارادے سے

قبل از اسلام عرب بہت سے اوہام میں مبتلا تھے۔ وہ سانپ کو نہیں مارتے تھے۔ اونٹنی جب دس بچے پیدا کر لیتی تو اسے آزاد چھوڑ دیا جاتا۔ کسی شخص کے پاس اگر اونٹوں کی تعداد ایک ہزار تک پہنچ جاتی تو اُن میں سے ایک اونٹ کی آنکھیں پھوڑ دی جاتی تھیں تاکہ اُن کی کثرت دوسروں کی نظرِ بد سے محفوظ رہے۔ جب قحط پڑتا تو بیل یا گائے کی دُم میں گھاس پھونس باندھ کر اس کو آگ لگا دیتے اور یہ آس رکھتے کہ اب پانی ضرور برسے گا۔ جب سفر میں جاتے تو کسی درخت میں ڈورا باندھ کر اس میں گرہ لگا دیتے۔ واپس آکر اس گرہ کو دیکھتے۔ اگر وہ کھلی ملتی تو وہ یقین کر لیتے کہ اُن کی بیوی اُن کی عدم موجودگی میں پاکدامن نہیں رہی ہے۔ اگر دورانِ سفر راستہ بھول جاتے تو کپڑے اُلٹے پہن لیتے اور سمجھتے کہ اس سے راستہ پھر مل جائے گا۔

مجھے باز رکھنے کی کوشش کی مگر جب میں نے اپنی دلی کیفیت، ذہنی انتشار کو کرب اور اضطراب سے بیان کیا تو ابوالحسن متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ دُرِشہوار قہوہ لے کر آگئی تھی۔ ابوالحسن نے اس کے سامنے بات جاری رکھنے میں کچھ تامل کیا مگر میں نے دُرِشہوار کے سامنے انہیں گفتگو کرنے کی اجازت دے دی۔

" آپ بزرگ ہیں، آپ کا مرتبہ اور بلند ہو۔" ابوالحسن نے نیازمندی سے کہا۔ " میری ایک درخواست ہے۔ ظالموں کو کیفرِ کردار تک پہنچانے کی خدمت میرے سپرد کیجیے میں وہی کروں گا جو آپ چاہتے ہیں۔"

" نہیں ابوالحسن" میں نے بہ عجلتِ تمام کہا۔ " میں اس معاملے میں کسی کو درمیان میں نہیں ڈالنا چاہتا ___ خود نمٹنا چاہتا ہوں۔"

عشاء کا وقت ہو چلا تھا۔ میں نماز کے بعد وہاں سے چلا آیا۔ دُرِشہوار مجھے دروازے تک چھوڑنے آئی۔ چلتے وقت اس سے میری کوئی بات نہیں ہوئی۔ حجرے میں آکر میں نے طوطوں کے پنجرے میں پانی ڈالا اور ایک وظیفے میں مصروف ہو گیا۔ عبادت سے مجھے سکون ملا لیکن پھر مجھے خیال آیا کہ الماس کو طلب کرنا چاہیے۔ میں نے کچھ دہکتے اور خوشبو سے تمام حجرے کو معطر کر دیا۔ الماس کی روح جلد ہی میری طلبی پر حاضر ہو گئی اور میں نے اس سے ثمینہ کی حالت کے متعلق دریافت کیا:

" اے نیک بزرگ۔ ثمینہ کی حالت آپ کے صبح کے عمل کے بعد

حضرت شیخ جنید بغدادیؒ کی خدمت میں

ایک مولوی صاحب اس مقصد سے حاضری دینے لگے کہ وہ اُن کی کرامات کا مشاہدہ کریں۔ عرصے تک خدمت کرتے رہے لیکن کوئی ایسی بات نہ دیکھی جو کرامت کہی جاسکتی۔ وہی علما کے طور طریق وہی شریعت کا اتباع اور سنّت کی پابندی۔ مایُوس ہو کر رخصت کی اجازت چاہی تو حضرت جنیدؒ نے دریافت کیا "تم میرے پاس کس لیے آئے تھے؟"

مولوی صاحب نے جواب دیا: "کوئی خاص مقصد نہ تھا۔" حالانکہ یہ جھُوٹ تھا۔

حضرت جنید بغدادیؒ نے کہا "پھر ٹھہرو۔ واپس کیوں جاتے ہو؟"

اب بات مولوی صاحب کی برداشت سے باہر تھی سب کچھ صاف صاف عرض کر دیا۔

حضرت جنیدؒ نے کہا "تم نے میرے شب و روز دیکھے ہیں، کبھی میں نے کوئی ایسی حرکت کی جو رسُولِ مقبولؐ کی سنّت کے خلاف ہو؟"

مولوی صاحب نے نفی میں گردن ہلادی۔

حضرت جنیدؒ نے مزید کہا "میری کوئی ایسی بات پکڑی جس میں جھوٹ بھی شامل ہو؟"

مولوی صاحب نے پھر نفی میں گردن ہلادی۔

حضرت جنیدؒ نے پھر تحمّل سے پوچھا "کوئی ایسی بات دیکھی جس میں ریاکاری اور زمانہ سازی شامل ہو؟" اب مولوی صاحب کا بُرا حال تھا۔ انکار میں ایک بار پھر گردن ہل گئی۔ حضرت جنیدؒ نے مولوی صاحب کو یہ نہیں یاد دلایا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے مولوی صاحب خود جھوٹ بولنے کے مرتکب ہو چکے تھے۔

حضرت جنیدؒ نے انکسار سے عرض کیا "میرے پاس کوئی کرامت نہیں۔ ہاں زندگی بھر حضرت رسُولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی سنّت پر قائم رہنا، اپنے تئیں زمانہ سازی اور ریاکاری سے محفوظ رکھنا اور جیتے جی جھُوٹ سے بچنا اگر کرامات میں داخل ہے تو تم نے ان کرامتوں کا یہاں ضرور مشاہدہ کیا ہوگا۔"

بہت ناگفتہ بہ ہے۔ آپ کے مؤکلوں نے شیبنہ کی ذہنی حالت کو دوبارہ ابتر کر دیا ہے۔ وہ اپنا توازن کھو بیٹھی ہے لیکن ——"

"لیکن کیا؟" میں نے الماس کو خاموش ہوتے دیکھا، تو متعجب ہو کر پُوچھا۔ "الماس۔ تم نے اپنا جُملہ نامکمل کیوں چھوڑ دیا؟"

"میں آپ کو یہ بتانا چاہتی تھی کہ اونکار ناتھ پھر شیبنہ کو درست کرنے میں مصرُوف ہے۔ شیبنہ کو ہوش میں لانے کے لئے اس وقت بھی وُہ اپنے جنتر منتر آزما رہا ہے۔ کوئی عجب نہیں کہ وہ پھر کامیاب ہو جائے۔"

"کیا مطلب؟" میں نے خفگی سے کہا: "الماس۔ یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔ کیا تم یہ باور کرانا چاہتی ہو کہ اونکار ناتھ اس علاقے میں میری رُسوائیوں کے درپے ہے۔ کیا اسے میری توہین کی جرأت ہوگئی ہے؟ کیا اس کا انداز میرے ضمن میں بہت ہی جارحانہ ہے؟"

"اے عالی مقام بزرگ۔" الماس نے سر جھکا کر جواب دیا۔ "وہ اپنے دل میں آپ کے لئے کینہ رکھتا ہے اور اس علاقے میں اپنی برتری کا خواہاں ہے۔ اس کے اندر نفرتیں بیٹھ گئی ہیں اور وُہ آپ کے غیر معمولی واقعات سُن کر اپنے حواس کھو بیٹھا ہے۔"

"میں اس کے حواس ٹھکانے لگا دُوں گا۔ بخدا میں اسے جہنم واصل کر دُوں گا۔ الماس اسے سمجھا دو کہ وہ میرے آڑے نہ آئے۔" میں جذبات کی رَو میں بہہ چلا تھا لیکن فوراً ہی میں نے خود پر قابو پالیا اور الماس سے بولا:

"اے رُوحِ الماس! اے نیک سیرت دوشیزہ۔ تمہیں جانے کی اجازت ہے مگر مجھے ان دنوں شاید تمہاری ضرورت زیادہ پڑے۔"

"میں آپ کے حُکم کی تابع ہوں۔" رُوحِ الماس نے عجز سے جواب دیا۔ وہ ایک لمحے میں دُھوئیں میں تحلیل ہوگئی اور طوطوں نے شور کرنا شروع کر دیا۔ میں اس وقت بہت مشتعل تھا۔ طوطوں کی یہ چیخ پکار مجھے بہت بُری لگی۔ میں نے انہیں جھڑک دیا: "نامُرادو! خاموش ہو جاؤ۔"

ان میں سے ایک طوطے نے مجھ سے کہا "کشف میاں صاحب، کشف میاں صاحب۔" اور ٹوٹے پھوٹے لہجے میں وہ ایک وظیفے کی رَٹ لگانے لگا۔

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔" میں نے اسے مخاطب کر کے کہا: "تم بخت صحیح ہے مجھے یاد آگیا۔ میں ابھی دیکھتا ہوں کہ اونکار ناتھ کیسی جرأتیں کر رہا ہے۔"

طوطے نے اس وقت مجھے ایک ایسا عمل یاد دلایا تھا جو میاں صاحب

نے بطورِ خاص مجھے ودیعت کیا تھا۔ میں نے طوطے کی طرف تحسین آمیز
نظروں سے دیکھا اور جلد ہی اپنا عمل شروع کر دیا۔ میں کوئی گھنٹے دو گھنٹے
گرد و پیش سے بے خبر اسی وظیفے کا وِرد کرتا رہا۔ پھر مجھے محسوس ہُوا کہ
میری بصارت وسیع ہوتی جا رہی ہے۔ اندھیرا چھٹ رہا ہے اور میں
حجرے کے اندر بیٹھا ہُوا حجرے کے باہر دیکھ رہا ہوں۔ میں پہاڑی میں
اِدھر اُدھر گھوم رہا ہوں۔ دُرِ شہوار کی طرف نکل جاتا ہوں۔ میں نے
دیکھا کہ وُہ اسی پلنگ پر دراز ہے جس پر میں شام کو بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے
پر ملکوتی حسن ہے۔ اُس کی زلفیں رُخساروں پر جھُول گئی ہیں۔ میں دُرِ شہوار
کو دیکھتا ہُوا پہاڑی سے نیچے اُتر گیا اور جب میں نے یہ ارادہ کیا کہ میں
بیرسٹر راشد حسین کے مکان میں داخل ہو کر ثمینہ کی حالت دیکھوں
تو لمحوں میں وُہ منظر میرے سامنے آ گیا۔ جسے دیکھنے کے لیے میں نے یہ
مشکل ترین وظیفہ پڑھا تھا۔ میری آنکھیں اس کمرے میں پہنچ گئیں جہاں
ثمینہ ایک آرام کرسی پر رسیوں سے جکڑی بیٹھی اپنے سر کو دیوانگی کی حالت
میں اِدھر اُدھر جھٹک رہی تھی۔ ثمینہ کے قریب ہی بیرسٹر راشد حسین حیران
و پریشان کھڑا ہُوا تھا۔ اس کی آنکھیں سُوجی ہُوئی تھیں۔ چہرے پر ہوائیاں
اُڑ رہی تھیں اور رنگت زرد ہو رہی تھی۔ ثمینہ کے عین سامنے پنڈت
اونکار ناتھ ننگے فرش پر آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا اور سیدھا ہاتھ،
صندلی دانوں کی مالا پر تیز تیز چل رہا تھا۔ اونکار ناتھ اور ثمینہ کے درمیان
مٹی کے ایک کونڈے نما برتن میں لوبان سُلگ رہا تھا۔ میں بڑی توجہ
سے اس منظر کو دیکھتا رہا۔

اونکار ناتھ کے چہرے کی رنگت سیاہ پڑتی جا رہی تھی۔ وُہ
کسی خطرناک منتر کے جاپ میں منہمک تھا۔ مجھے یہ سب بہت دلچسپ
لگا۔ میں نے اپنی بصارت کو وہیں ٹھہرے رہنے دیا۔ منتر کا جاپ پُورا کر
کے اونکار ناتھ نے مالا کو گردن میں ڈالا۔ اُٹھ کر لوبان کے ایک ٹکڑے
کو مٹی کے برتن میں پھینکا اور پھر دُھوئیں کو چیرتا ہُوا آگے بڑھا اور ثمینہ
کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔ جس نے اپنا سر جھٹکنا بند کر دیا تھا اور حیرت
بھری نگاہوں سے اونکار ناتھ کو تک رہی تھی جیسے اس پر سکتہ
طاری ہو گیا ہو۔

"لڑکی ۔۔۔ اونکار ناتھ کی لرزہ پیدا کر دینے والی آواز کمرے
کے سکوت کو چیرتی ہُوئی اُبھری۔

"میں تجھے حکم دیتا ہوں کہ اپنے مَن کو گندی باتوں سے پاک کر۔
ہوش میں آ۔" ثمینہ بدستور بُت بنی بیٹھی آنکھیں پھاڑے اونکار نا
دیکھتی رہی تو وُہ دوبارہ گرج کر بولا:

"لڑکی ۔۔۔ اپنے من کی کالک دُور کر۔ دُور کر۔ دُور کر
آ گیا کا پالن کر۔"

اونکار ناتھ اپنے الفاظ کو بار بار دُہرا رہا تھا۔ اُس کے چہ
کی خباثت بڑھتی جا رہی تھی۔ بیرسٹر راشد حسین گنگ سا کھڑا
دیکھ رہا تھا کہ اچانک کمرے میں ایسا شور بلند ہُوا جیسے کوئی کر
حالت میں چیخ رہا ہو۔ چیخوں کی یہ آوازیں تیزی سے اُبھرتی تھیں
پھر مدھم ہو جاتی تھیں۔ لوبان، آگ، اونکار ناتھ کے منتر کی آو
چیخوں نے اس منظر کو بہت پُرہیبت بنا دیا تھا۔ ثمینہ نے دوبارہ پا
کی طرح سر کو زور زور سے جھٹکنا شروع کر دیا تھا۔ اب اونکار نا
حالت غیر ہو گئی۔ بیرسٹر راشد حسین جو اب تک ششدر کھڑا یہ منظ
رہا تھا۔ مُردہ آواز میں بولا:

"پنڈت جی! یہ کیسی آوازیں تھیں۔"

"میرے منتر کے بیر جادو کا توڑ کر رہے تھے۔" پنڈت اونکا
نے غصّے کی حالت میں جواب دیا۔

"تو کیا ہُوا؟" بیرسٹر نے بڑی اُمیدوں کے ساتھ پوچھا۔
"خاموش رہو اور دیکھتے جاؤ۔" پنڈت نے بیرسٹر کو جھڑک دیا۔
بیرسٹر راشد حسین کو جیسے سانپ سُونگھ گیا۔ وُہ ایک طرف بالکل خاموش کھڑا رہا۔

"جب تک میں موجود ہوں۔ راشد حسین تمہیں چنتا کرنے کی ضرورت نہیں۔ کوئی چھوٹا موٹا منتر ہوتا تو میں کب کا ٹھیک کر دیتا۔ مگر اب کی اس پاپی نے کچھ محنت سے کام کیا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ وہ کون ہے لیکن بیرسٹر میں نے ہار ماننا نہیں سیکھا۔ لڑکی کو ہوش میں لانے کے لئے کوئی اور اپائے کرنا ہوگا۔" اونکار ناتھ نے پورے عزم کے ساتھ کہا۔

اونکار ناتھ کی مایُوسی دیکھ کر میرے ہونٹوں پر بے اختیار ایک تلخ مُسکراہٹ اُبھری۔ میں نے لاپروائی سے اُسے دیکھا اور اپنی بصارت کو وہاں سے واپس لے آیا۔ وُہ سارا منظر چشم زدن میں میری آنکھوں سے اوجھل ہوگیا۔

میں نے اس وحشت انگیز دید کے بعد اطمینان کی سانس لی اور حجرے کی چھت کی طرف دیکھا۔ اس کے بعد بھی میں دیر تک جاگتا رہا اور سوچتا رہا۔ پتا نہیں میری آنکھ کب لگی۔ دُوسری صبح میں کسی قدر دیر سے اُٹھا لیکن اتنی دیر سے بھی نہیں کہ نماز قضا ہو جاتی۔ دُرِ شہوار ناشتہ لے آئی۔ وہ عمُوماً صبح مجھ سے کم باتیں کیا کرتی تھی تاہم آج اس کے انداز سے عیاں تھا کہ وہ حجرے میں کچھ دیر ٹھہرنا چاہتی ہے۔ میں نے مُسکرا کر اس سے کہا۔ "بیٹھ جاؤ۔ کہو کیسی ہو؟" میرا دل اس سے بہت سی باتیں کرنے کو چاہتا تھا مگر الفاظ میری زبان پر آتے آتے رُک جاتے تھے۔ یہ اِمتناع میری رُوحانی تربیت کے سبب تھا۔ مجھے اپنے ناآسُودہ جذبوں کو مارنے کی تبلیغ کی گئی تھی اور سچ تو یہ ہے کہ مجھے ان جذبوں کو محسُوس کرنے کی فرصت ہی نہیں ملی۔ میں نے شادابی و شگفتگی کے کچھ دن جیل میں گزارے۔ کچھ فاقہ کشی اور بے بسی میں، کچھ عبادت اور ریاضت میں۔ زندگی کا بڑا حصّہ اِسی طرح گزر گیا۔

دُرِ شہوار میرے سامنے بیٹھ گئی۔ "اچھی ہوں۔ آپ کے مزاج کیسے ہیں؟"

"میں بھی ٹھیک ہوں۔ دُرّی۔ رات میں نے ایک منفرد قسم کا عمل کیا تھا۔" میں نے کہا۔ "میں نے اپنی بصارت کو وسیع کرنے کا ایک وظیفہ پڑھا۔ جانتی ہو، پھر میں کہاں کہاں گیا۔"

"کہاں کہاں؟" دُرِ شہوار نے حیرت سے پوچھا۔

"میری بصارت نے پہاڑی کا احاطہ کیا۔ پھر نہ جانے کیسے میری آنکھیں تمہارے گھر پہنچ گئیں اور میں نے دیکھا کہ تم میرے پلنگ پر دراز تمہاری سیاہ زُلفیں تمہارے رُخساروں پر محوِ خواب ہیں۔ لیکن ....."

دُرِ شہوار کا چہرہ سُرخ ہوگیا اور مجھے اچانک محسُوس ہُوا کہ میں وہ الفاظ ادا کر رہا ہوں جو اس حجرے کے شایانِ شان نہیں۔ مجھے اپنے ہی لفظ بے وقعت معلوم ہوئے۔ میں نے بات بدل دی۔

"لیکن پھر فوراً ہی میری آنکھیں اِس جگہ کے تعاقب میں روانہ ہوگئیں جو اصل میں مجھے مطلوب تھی۔"

"آپ رات والی بات بھُول گئے۔" دُرِ شہوار نے تیکھے لہجے میں کہا۔

"کون سی بات؟" مجھے واقعی کچھ یاد نہ تھا۔

"کہ آپ مجھے اپنا 'ہم قد' بنانے کی عزّت دینا چاہتے ہیں۔" دُرِ شہوار نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

"ارے دُرّی۔ یہ سچ ہے کہ میں نے یہی کہا تھا جو تُم نے سمجھا۔ میں یقیناً تمہیں بتاؤں گا۔ میں رات بیرسٹر راشد حسین کے اس کمرے میں گیا جہاں ملیحہ کو اونکار ناتھ میرے عتاب سے بچانے کی فکر میں مُبتلا تھا۔" میں نے اُسے صاف صاف بتا دیا۔

"آپ مجھے کوئی کام کیوں نہیں سونپتے؟"

"تم میرے لیے بہت کام کرتی ہو۔" میں نے مُسکراتے ہوئے کہا۔

"نہیں کچھ اور کام میرے ذمّے ڈال کر دیکھئے۔"

"مجھے معلوم ہے کہ تم ابُوالحسن جیسے عالم کی بیٹی ہو۔"

"اور اِس فضیلت گاہ۔ اس پہاڑی کی پروردہ ہوں۔"

بڑی مشکل سے میں دُرِ شہوار کو سمجھا سکا۔ پہاڑی پر صرف وہی ایک ذات تھی جو مجھ سے اُلجھنے کی حد تک گفتگو کرسکتی تھی۔ سُورج کی روشنی پھیلی تو میں نے اسے رُخصت کر دیا اور میں طوطوں کو ان کی غذا فراہم کر کے باہر آگیا۔ جہاں پر عقیدت مندوں کا ایک غول موجُود تھا۔ روزانہ کی طرح میں نے ان پر ڈھائے جانے والے ظلم و ستم کی کہانیاں سُنیں اور انہیں سکُون و اطمینان میں تقسیم کرتا رہا۔



ظہر کی نماز کے بعد میں حجرے میں داخل ہُوا۔ دُرِ شہوار میرا کھانا

کسی نے رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا: "یا رسول اللہ! روزہ کس چیز سے ٹوٹ جاتا ہے؟" حضورؐ نے جواب دیا: "جھوٹ اور غیبت سے۔"

جو صرف دال اور دو چپاتیوں پر مشتمل ہوتا تھا لے کر آئی۔ میں نے کھانے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو وہ بڑے اشتیاق سے کہنے لگی:

" آج صبح آپ سے رخصت ہونے کے بعد میرا جی چاہا کہ میں اس لڑکی مشینہ کو دیکھوں جو بیرسٹر راشد تحسین کی لڑکی ہے مگر وہ تو مجھے بالکل تندرست نظر آئی۔"

"کیا مطلب؟" ___ لقمہ میرے ہاتھ میں رہ گیا۔ "تم کس وقت گئی تھیں اور تم نے وہاں کیا دیکھا؟"

"میں صبح خاصا دن نکل آنے کے بعد گئی تھی۔" دُرِ شہوار نے بدحواسی سے جواب دیا۔ "مگر آپ کھانا تو کھائیے۔ میں نے بُرے وقت ذکر چھیڑ دیا۔"

"نہیں نہیں ___" میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا اور دانستہ اس ذکر کو طول نہیں دیا۔ دُرِ شہوار کے سامنے مجھے کسی قدر شرمندگی کا احساس ہو رہا تھا اور وہ اس ندامت میں گرفتار نظر آتی تھی کہ اُس نے یہ تذکرہ کیوں شروع کیا۔ میں نے اِس مرحلے سے بچنے کے لیے دُرِ شہوار کے سامنے باقاعدہ کھانا کھایا۔ حالانکہ میرا جی کھانے میں بالکل نہیں لگ رہا تھا۔ کسی نہ کسی طرح میں نے دُرِ شہوار کو رخصت کیا۔ کھانا ختم کیا۔ اور شمشیر علی کو بلا کر مجمع میں اعلان کرا دیا کہ آج دوپہر بعد میں باہر نہ آ سکوں گا۔ مجھے معلوم تھا کہ اس اعلان کے بعد کیسی کیسی سرگوشیاں نہ ہوں گی۔ عقیدت مندوں سے وقتی طور پر چھٹکارا پانے کے بعد میں اجنہ کے ایک گروہ میں گھر گیا جو پہلی بار میرے اس اچانک اعلان کے بعد آیا تھا۔ ابوالحسن پریشان پریشان نظر آتے تھے۔ میں نے انہیں اشارہ کیا کہ وہ اس گروہ کو یہاں سے لے جائیں۔ انہیں رخصت کرنے کے بعد جب کہیں مجھے تنہائی نصیب ہوئی تو میں نے اونکار ناتھ کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔ اسی پنڈت کے سلسلے میں ___ جو میاں صاحب کے رُشد و ہدایت کے اس پُورے سلسلے کو چیلنج کر رہا تھا۔ میں اس وقت، غیظ و غضب کے عالم میں تھا اور کوئی دلیل سُننے کے لیے تیار نہ تھا۔ اپنے غصّے کو کم کرنے کے لیے میں نے خود کو عبادت میں مصرُوف کرنا چاہا لیکن عبادت میں خلل پیدا ہو رہا تھا۔ میں نے وظائف کا وِرد کیا لیکن میری زبان میں لکنت ہو رہی تھی۔ پھر میں نے ایک ایسے وظیفے میں خود کو غرق کر دیا جس میں مجھے اپنے ہونے نہ ہونے کا احساس بھی نہ رہا۔ عصر کے وقت کہیں مجھے ہوش آیا ___ اور میں نے شمال کی طرف انگلی اُٹھا کر اشارہ کیا پھر میں سجدے میں گر گیا۔ مجھ پر ایسی کیفیت طاری ہوئی کہ میرا بدن کانپنے لگا۔ میں نے زمین سے اتنی بار اپنے سر کو مارا کہ وہ لہولہان ہو گیا ___



جب میں نے دُرِ شہوار کا لمس اپنے سر پر محسوس کیا تو مجھے ہوش آیا۔ وہ میرے قریب بیٹھی میرا سر سہلا رہی تھی۔ میں جائے نماز کے بجائے بستر پر پڑا تھا۔ میں نے حیرت کے عالم میں دُرِ شہوار کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر پریشانی کے تاثرات نمایاں تھے۔ مجھے ہوش میں آتا دیکھ کر وہ ایک سرد آہ بھر کر بولی: "اے خدا تیرا شکر ہے۔"

"دُرّی۔ تم اس وقت یہاں کیسے؟" میں نے اسے حلاوت سے مخاطب کیا تو وہ آبدیدہ ہو کر بولی:

" میں والد سے آپ کی طبیعت کی ناسازی کا سُن کر آئی تھی جب میں حجرے میں داخل ہوئی تو آپ جائے نماز پر بے ہوش پڑے تھے۔ آپ کا سر لہولہان تھا۔ میں نے اس کی اطلاع فوراً والد کو دی۔ انہوں نے آ کر آپ کو بستر پر لٹایا۔ پٹیاں باندھیں اور مجھے یہاں ٹھہرنے کی ہدایت دے کر کوئی دوا لینے چلے گئے۔"

" ہاں دُرّی۔ پڑھتے پڑھتے مجھ پر رقت طاری ہوئی۔ مجھے اپنا ہوش نہ رہا۔ تم لوگوں کو بڑی زحمت ہوئی۔"

" زحمت ___؟" دُرِ شہوار نے خفگی سے کہا۔

" نہیں نہیں ___ میری مُراد یہ نہیں تھی جو تم سمجھیں" میں نے اُس کا ہاتھ تھپکتے ہوئے کہا۔

تھوڑی دیر میں ابوالحسن آ گئے اور دُرِ شہوار اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اُن کے ہاتھ میں ایک کوزہ تھا۔ مجھے ہوش میں دیکھ کر انہوں نے خدا کا شکر ادا کیا اور کوزہ میرے قریب لا کر بولے: "میں یہ مشروب آپ کے لیے لایا ہوں، اسے پی لیں خُدا نے چاہا تو آپ کی طبیعت بحال ہو جائے گی۔"

میں نے وہ مشروب حلق میں انڈیل لیا۔ جب تک دُرِ شہوار حجرے میں موجود رہی ابوالحسن اِدھر اُدھر کی گفتگو کرتے رہے مجھے کچھ دنوں تک مکمل آرام کا مشورہ دیا۔ لیکن جب دُرِ شہوار چلی گئی، تو

اُنھوں نے باتوں کا رُخ بدل کر سنجیدگی سے کہا:

"میاں صاحب! خدا آپ کی عظمتوں کو دوچند کرے۔ آپ کو علم کی برتری سے سرفراز کرے، لیکن میری بھی تمنا پوری ہو جاتی۔ اگر آپ نے مجھے کسی خدمت کے قابل سمجھا ہوتا۔ میں یہ دَوا لے کر شہر سے آ رہا ہوں۔ سارے شہر میں بیرسٹر راشد حسین کی کوٹھی کے جلتے ہُوئے شعلے نظر آ رہے ہیں۔ دیکھنے والوں کا کہنا ہے کہ اِتنی خطرناک آگ اُنھوں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی۔"

"ابُوالحسن — میں ایسا کرنے پر مجبُور ہو گیا تھا۔ صُورتِ حال معلُوم ہو جانے پر میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ بیرسٹر راشد حسین اپنی دولت کے بل بوتے پر ظلم کا کاروبار جاری رکھے ہُوئے تھا۔ میرے قلب کو سکُون مِل چکا ہے۔ اب میں مکمل تندہی اور انہماک سے حصُولِ علم کر سکوں گا۔ میں ایک طالب علم کی زندگی گزارنا چاہتا ہوں۔ شاید علم کے سمندر میں میری تشنگیاں کسی قدر دُور ہو سکیں۔"

"خدا آپ کو اس کی توفیق عطا فرمائے۔ آپ اپنے ارادوں میں کامیاب ہوں۔" ابوالحسن نے دُعا دی۔

جب سب لوگ چلے گئے تو میں نے عصر اور مغرب کی نماز ایک ساتھ ادا کی۔ راشد حسین کی کوٹھی جل کر خاکستر ہو جانے کی اطلاع سُن کر مجھے ایسا محسُوس ہُوا جیسے میرے دل کا بوجھ اُتر گیا ہو۔ رہا اونکار ناتھ تو میرا خیال تھا کہ اس ہولناک آتش زنی کے بعد وہ پہاڑی والے، میاں صاحب کے معاملوں میں ٹانگ اَڑانے سے باز آ جائے گا۔

یہ واقعہ سُن کر میرا جی حجرے میں نہیں لگا۔ نمازِ مغرب کے بعد میں ابُوالحسن کی طرف روانہ ہو گیا۔ جب جنوں کی بستی میں میری آمد کی اطلاع ہُوئی تو ایک پورا غول ابُوالحسن کے مکان پر جمع ہو گیا۔ آج مجھے یہ ہجُوم بہت اچھا لگا۔ میں نے سبھی کی مزاج پُرسی کی۔ میری خوش دلی سے اجنّہ کے چہرے کھِلے جاتے تھے۔ دُرِ شہوار بھی بہت شاداں نظر آتی تھی۔ عشاء کے بعد ابُوالحسن کے مکان پر ضیافت کا اہتمام ہُوا۔ جنوں کے لئے اچانک ضیافت کا انتظام کرنا کوئی بڑی بات نہیں۔

رات گئے تک اجنّہ میرے اردگرد بیٹھے رہے۔ میں اُن سے ان کے نجی حالات پوچھتا رہا — اور میرا جی چاہا کہ کوئی میرے بھی میری ذات کے احوال پوچھے۔ اسی لمحے میرے سامنے دُرِ شہوار آئی۔ شاید اسے میرے دل کی بات کی خبر ہو گئی تھی یا اُس نے اپنی

کسی نے رسُولِ مقبولؐ سے دریافت کیا: "یارسُول اللہؐ! غیبت کسے کہتے ہیں؟"

آپؐ نے ارشاد فرمایا: "کسی کی عدم موجُودگی میں اس کی بُرائی کرنا۔"

سوال کرنے والے نے دُوسرا سوال کیا: "اور اگر وُہ برائیاں جو کسی کی، عدم موجودگی میں بیان کی جا رہی ہوں شخصِ مذکور میں موجود بھی ہوں تب؟"

رسول اللہؐ نے جواب دیا: "اسی لئے تو اسے غیبت کہیں گے لیکن اگر یہ بُرائیاں اس غائب شخص میں نہ ہوں اور اُس سے منسُوب کی جائیں تو پھر یہ غیبت نہیں، بہتان ہوگی، تہمت"

ذہانت سے میری اس وقت کی کیفیت کا اندازہ لگا لیا تھا۔ بہرحال وہ ایک ذہین دوشیزہ تھی۔ ہر اعتبار سے وہ بے شمار صلاحیتوں کی حامل تھی۔ حُسن میں یکتا، بڑی پُروقار، سادہ و دِلنشیں۔ اُس کا لہجہ خسروانہ، اس کا انداز، کیا خُوب وہ دوشیزہ تھی۔ کیسا رنگ رنگ اُس کا حسن و جمال تھا۔

بہت دیر بعد میں وہاں سے آیا۔ اس روز میں نے الماس کو طلب نہیں کیا — رُوح کو مادّی صُورت میں ظاہر ہونے کے لئے بے حد اذیت ناک مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ راشد حسین کے مکان میں آگ لگ جانے کے بعد یوں بھی مجھے الماس کو طلب کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ ہاں مجھے دُنیا کی دُوسری رُوحوں کو بُلانے کا اشتیاق تھا۔ میں مصر کی ملکہ قلوپطرہ کو بلانا چاہتا تھا۔ میں یونان کی شاعرہ سیفو سے ملاقات کرنا چاہتا تھا۔ ان مشہُور رُوحوں کو طلب کرنے کا کام بڑا دشوار گزار تھا۔ تاہم مجھے یقین تھا کہ میں کسی نہ کسی طور انہیں زحمت دُوں گا۔ بہرحال اس رات تو مجھے اطمینان تھا۔ بستر پر دراز ہو کر میں نے میاں صاحب کی ہدایت کے مطابق پانچ مرتبہ آیۃ الکرسی پڑھی اور اپنے گرد اشارے سے حصار کھینچا۔ پھر تین بار تالی پیٹی اور سونے کے ارادے سے آنکھیں موند لیں۔ میاں صاحب نے مجھے بتایا تھا کہ آیۃ الکرسی کی برکتیں کیا ہیں۔ اُن کا کہنا تھا کہ اگر کوئی شخص رات کو سونے سے پہلے پانچ مرتبہ آیۃ الکرسی سے پہلے تین مرتبہ دُرود شریف پڑھے اور تین بار تالی پیٹے تو جہاں تک تالی کی آواز جائے گی اس حصے میں کوئی بلا یا آفت نہیں آسکتی۔

ایک صحابی رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ! مجھے آپؐ سے بے حد محبت ہے !!"

رسولِ مقبولؐ نے فرمایا: "غور کر، تو کیا کہتا ہے ؟"

صحابی نے دوبارہ عرض کیا: "مجھے آپؐ سے بے حد محبت ہے۔"

رسول اللہؐ نے پھر فرمایا: "ایک بار پھر غور کرکہ تو کیا کہتا ہے ؟"

صحابی نے پھر عرض کیا: "یا رسول اللہؐ میں آپؐ سے بے حد محبت کرتا ہوں"

رسول اللہؐ نے اسی طرح تین مرتبہ اپنی بات دُہرائی اور صحابی کی طرف سے یہی جواب ملا تو آپؐ نے ارشاد فرمایا: "مجھ سے محبت کرنے میں اگر تم صدق گوئی سے کام لے رہے ہو تو پھر تم فقر کی طرف آجاؤ۔ مجھ سے جو محبت کرتا ہے اس کی طرف فقر اس طرح دوڑتا ہے جیسے بلندی سے نشیب کی طرف پانی۔"

دُور دُور تک میں اپنے عقیدت مندوں میں معمول کے مطابق گھرا رہا۔ میں اب سکون کے ساتھ وظائف میں مشغول رہتا لیکن پھر ایک روز ایک ایسا چونکا دینے والا واقعہ پیش آیا کہ میں پھر منتشر ہوگیا۔

اس روز میں اپنے عقید تمندوں سے ملاقات میں مصروف تھا۔ میں نے دیکھا کہ ہجوم سے پیچھے شمشیر علی سے ایک باوردی پولیس انسپکٹر اُلجھ رہا ہے۔ انسپکٹر کا انداز جارحانہ ہے اور وہ بدکلامی سے شمشیر علی سے پیش آرہا ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ ان دونوں میں کیا تُو تُو میں میں ہوئی۔ تھوڑی دیر میں رحیم خان بھی وہاں پہنچ گیا اور وہ بھی انسپکٹر سے اُلجھ گیا۔ اس عرصے میں میرے سامنے بیٹھے ہوئے لوگ بھی انسپکٹر کی طرف مصروف ہوگئے۔

میں نے ابوالحسن کو اشارہ کیا۔ ابوالحسن جب وہاں پہنچے تو گولی چلنے کی آواز آئی۔ چنانچہ میں بھی دوڑا ہوا وہاں پہنچا۔ میں نے دیکھا کہ شمشیر علی خون میں لت پت پڑا ہے۔ انسپکٹر کو ہجوم بے دریغ مار رہا ہے اس کے ساتھ کے دو پولیس والے پہاڑی سے بھاگ رہے ہیں۔ میں نے باآوازِ بلند اس سرشور ہجوم کو روکا۔ "ٹھہرو۔" میں نے کہا۔

میرے حکم دیتے ہی سب خاموش ہوگئے۔ میں نے ایک نظر انسپکٹر پر ڈالی۔ وہ کھڑا ہوا کانپ رہا تھا۔ لمحوں میں ہجوم نے اس کی حالت شکستہ کردی تھی۔ اس نے مجھے اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا تو وہ بھاگا۔ ہجوم نے اس کا پیچھا کرنا چاہا مگر میں نے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔ "وہ اپنی سزا کو پہنچ جائے گا۔" میں نے کہا اور ساری توجہ جاں بلب شمشیر علی کی طرف مبذول کردی۔ میں نے اس کا سر اپنی گود میں لے لیا۔ اس کی نظروں میں ایک اعتماد تھا فخر کا ایک جذبہ۔ میں نے اس سے پوچھا۔ "تم شمشیر علی۔ اس سے کیوں جھگڑ پڑے؟"

شمشیر علی میں بولنے کی سکت نہ رہی تھی۔ مگر وہ اپنے زوال پذیر حواس کو بجا کرتے ہوئے، رُک رُک کر بولا "حضرت اس نے آپ کی شان میں گستاخی کی تھی۔" شمشیر علی زیادہ نہ بول سکا مرگیا۔ ہاشم نے مجھے بتایا کہ جب وہ انسپکٹر کے پاس پہنچا تو وہ کہہ رہا تھا۔ "یہ کیا شعبدے بازی لگا رکھی ہے۔

شروع شروع میں شمشیر علی نے اُسے اس گستاخی سے باز رکھا مگر انسپکٹر آپ کی ذات پر رکیک حملے کرتا رہا۔ میں انہیں بیان کرنے کی جسارت نہیں کرسکتا۔ بس یہ سمجھ لیجئے کہ جب انسپکٹر اپنی اوقات سے بڑھ گیا۔ تو شمشیر علی نے اس کی گردن دبوچ لی۔ اور گستاخ انسپکٹر نے مشتعل ہوکر گولی چلادی۔"

یہ بہت بڑا واقعہ تھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ اس خونیں حادثے کے بعد کیسے کیسے افسانے تراشے جائیں گے۔ ایک قتل ہوچکا تھا مگر یہ انسپکٹر کیوں آیا تھا۔ اور اس نے یہ نازیبا کلمات کیسے ادا کئے تھے۔ مجھے یہ جاننے میں ذرا بھی دیر نہ لگی۔ ایک لمحے میں ساری بات مجھ پر عیاں ہوگئی اور میں شدتِ غضب سے لرزنے لگا۔ میں نے ابوالحسن کو اشارہ کیا کہ وہ شمشیر علی کی میّت کا انتظام کریں۔ میں ہجوم کو چھوڑ کر سیدھا حجرے میں داخل ہوا اور میں نے صحیح صورتحال کا جائزہ لینے کے لئے تھوڑی دیر تک اپنے ذہن کو ان واقعات پر مرکوز کیا۔ اُف میرے خدا۔ انسپکٹر کو بیرسٹر راشد حسین نے بھیجا تھا۔ راشد حسین زندہ ہے۔ یہ کس طرح ممکن ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے۔ مجھ پر دیوانگی کی کیفیت طاری تھی۔ یکے بعد دیگرے ایسے واقعات رونما ہو رہے تھے جو میرے ذہن کو پراگندہ کئے دیتے تھے۔ میں پریشان حال حجرے میں اِدھر اُدھر ٹہلتا رہا۔ اُدھر میرا فوری طور پر باہر جانا ضروری تھا۔ میں پھر ہجوم میں آگیا۔ مجھے دیکھتے ہی لوگ مجھ سے لپٹ گئے۔ کسی نے میرے دامن کو پکڑا۔

کسی نے ہاتھ کو بوسے دیئے۔ کوئی میرے قدموں پر جھک گیا۔ میں نے باآوازِ بلند انہیں مخاطب کیا۔

"اے لوگو۔ جو کچھ ہُوا۔ وہ بہت افسوسناک ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں، ابھی کچھ اور واقعات رونما ہوں گے شمشیر علی مر گیا۔ ممکن ہے ابھی کچھ اور لوگ اس پہاڑی کی آبرو پر اپنی جان قربان کر دیں۔ میں تم سے پُرسکون رہنے کی درخواست کرتا ہوں۔ شمشیر علی خدا ترس آدمی تھا۔ اس کی زندگی نیکیوں میں گزری اور اس نے جنّت میں اپنے لئے جگہ بنائی۔ مجھے مسرّت ہوگی اگر شمشیر علی کو پورے اہتمام سے دفن کیا جائے۔" پھر میں نے دُعا کے لئے ہاتھ اٹھائے شمشیر علی کے لئے فاتحہ پڑھی۔

شام تک مجمع چھٹ گیا۔ شمشیر علی کی میّت کو لوگ پہاڑی سے لے گئے۔ مغرب کے بعد مجھے ابوالحسن نے بتایا کہ "شام کو کچھ پولیس افسروں نے پہاڑی پر چڑھنے کی کوشش کی مگر نیچے بیٹھے عقیدت مندوں نے انہیں روک لیا۔ اس واقعے سے شہر میں بڑی کشیدگی پھیل گئی ہے۔ انسپکٹر سرسوتی کو اسپتال میں داخل کر دیا گیا ہے۔ اس کی حالت شکستہ ہے۔ اس کی ٹانگ ٹوٹ گئی ہے اور وہ ہذیان بک رہا ہے۔ کل صبح دوسرے پولیس افسران پہاڑی کا رُخ کریں گے۔" ابوالحسن اور سارے اجنّہ شہر میں پھیل گئے تھے میں رات بھر جاگتا رہا اور عبادت کرتا رہا۔ دُرِ شہوار سے بھی بات نہ ہو سکی۔ صبح جب سورج طلوع ہُوا تو پہاڑی انسانوں سے بھرنے لگی۔ تھوڑی دیر میں اتنا ہجوم ہو گیا کہ دُور دُور تک انسان ہی انسان نظر آتے

میں جب حجرے سے باہر آیا تو لوگ نعرے لگانے لگے۔ ان کی بے تابیاں دیکھ کر میں نے انہیں پُرسکون رہنے اور بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ تاحدِّ نظر عقیدت مند تھے۔ یقیناً ان میں بعض لوگ ایسے بھی تھے جو کل کے واقعے کی سُن گن لینے آئے تھے جو تماش بین تھے۔ میں نے بغیر کسی تشویش کے اپنا معمول جاری رکھا۔ رحیم خاں اپنے ساتھی شمشیر علی کے انتقال کی وجہ سے بہت دلگیر نظر آتا تھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ تھوڑی دیر بعد پولیس اِدھر کا رُخ کرنے والی ہے اور شاید ہجوم کو بھی اس کا انتظار تھا۔ کوئی نو بجے کے قریب پولیس کی ایک جماعت پہاڑی پر وارد ہوئی۔ مجمع میں اُس کی آمد سے کھلبلی مچ گئی۔ سب آگے والے افسر نے دُور سے مجھے سلام کیا۔ جس سے بے قابو مجمع میں کسی قدر نظم پیدا ہوا۔ افسر نے پوری جماعت وہیں چھوڑ دی اور آگے بڑھنے لگا۔ رحیم خاں نے اسے راستے میں جا لیا۔ اور اس سے کہا کہ وہ میاں صاحب کی ایما کے بغیر اُن سے نہیں مل سکتا۔ پولیس افسر نے اس بات پر سر جھکا دیا۔ وہ ایک ڈی ایس پی تھا۔ رحیم خاں دوڑتا ہوا میرے پاس آیا۔ اور میں نے اُسے پولیس افسر کو اپنے پاس لانے کی اجازت دے دی۔ جب وہ میرے قریب آیا تو اُس نے جُھک کر سلام کیا۔ اور نہایت انکسار سے مخاطب ہُوا۔

"میاں صاحب۔ میرا نام ظفر علی ہے۔ میں نے ہزاروں افراد سے آپ کی بزرگی اور آپ کے دَر سے ہونے والے فیض کے واقعات سُنے ہیں۔ بخدا میرا یہاں آنے کا مقصد آپ کی بزرگی کی تفتیش کرنا نہیں۔ صرف اپنے فرائض کی بجا آوری مقصود ہے۔ بد قسمتی سے مجھے آپ کی قدم بوسی کا شرف حاصل نہ ہو سکا۔ تاہم میں بھی آپ کے سچّے عقیدت مندوں میں سے ہوں۔"

"اس وقت کس کام سے آئے ہو؟" میں نے سپاٹ لہجے میں سوال کیا تو ڈی ایس پی گڑبڑا گیا۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ وہ اپنی آمد کی اصل وجہ بتانے سے جھجک رہا ہے۔ تھوڑے تامّل کے بعد وہ بولا۔

حضرت عبداللہ ابن عمرؓ نے ایک مرتبہ اپنے صاحبزادگان سے ارشاد فرمایا کہ "عورتوں کو مسجد میں جانے کی اجازت دے دیا کرو۔"

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے ایک صاحبزادے نے عرض کیا کہ "ہم اس کی اجازت نہ دیں گے کیونکہ وہ اس کو آئندہ چل کر آزادی فساد اور آوارگی کا بہانہ بنا لیں گی۔"

حضرت ابن عمرؓ اپنے بیٹے سے ناراض ہو گئے اور انہیں خوب بُرا بھلا کہا۔ فرمایا "گستاخ! میں تو حضورؐ کا ارشاد سُناؤں اور تو کہے کہ ہم اجازت نہیں دے سکتے۔"

اس کے بعد حضرت عبداللہ بن عمرؓ اپنے ان صاحبزادے سے زندگی بھر نہیں بولے

(مسلم و ابوداؤد)

"میاں صاحب۔ اس وقت میں یہاں جس مقصد سے حاضر ہوا ہوں۔ اس کے لئے میں تہہ دل سے معذرت خواہ ہوں یقین کیجئے میں صرف کاغذات کی خانہ پُری کے لئے حاضر ہوا ہوں۔"

میرے استفسار پر ڈی ایس پی نے مجھے جو واقعات بتائے اُسے سن کر میرا خون کھول اٹھا۔ ڈی ایس پی ظفر علی کے بیان کے مطابق بیرسٹر راشد حسین کا مکان اور اس کا ساز و سامان جل کر راکھ کا ڈھیر ہو چکا تھا۔ لیکن راشد حسین اور ثمینہ کسی نہ کسی طرح بچ گئے اور اب راشد حسین نے پُرانے واقعات کی روشنی میں میرے خلاف باقاعدہ تحریری رپورٹ درج کرائی ہے۔ اس رپورٹ میں اس مردود نے اس جھوٹے قصے کا بھی ذکر کیا تھا جس کی بدولت مجھے سات سال کا طویل عرصہ جیل میں گزارنا پڑا اور میرے والدین اور بہن مجھ سے ہمیشہ کے لئے چھن گئے تھے۔ ڈی ایس پی انہی واقعات کی تصدیق کے لئے اس وقت میرے پاس آیا تھا۔ کل جو انسپکٹر آیا تھا وہ گستاخ بھی اسی مقصد سے بھیجا گیا تھا۔ اور اب یک نہ شد دو شد کے مصداق دو کیس پولیس کی تفتیش کا مرکز بن گئے تھے۔ پہلا بیرسٹر راشد حسین کی درخواست کا۔ دوسرا شمشیر علی کے قتل کا واقعہ۔ ڈی ایس پی۔ ظفر علی کا اندازِ گفتگو اور اس کا طرزِ عمل بتا رہا تھا کہ وہ ایک نیک خصلت آدمی ہے اور ہر طرح سے ان باتوں کی سختی سے تردید کرنے پر آمادہ ہے جو میری ذات سے منسوب کی گئی تھیں۔ واقعات کے ہر پہلو سے آگاہ کرنے کے بعد اُس نے مجھ سے بڑی سنجیدگی سے کہا:

"میاں صاحب۔ بیرسٹر راشد حسین نے آپ کی بزرگی پر جو کیچڑ اُچھالنے کی کوشش کی ہے اور جو بے بنیاد الزامات آپ کی ذات پر عائد کئے ہیں۔ ان کی تردید کے لئے میرے پاس ہزاروں ٹھوس ثبوت موجود ہیں۔ میں اس کینہ صفت شخص کو ایسا پریشان کروں گا کہ وہ تمام زندگی یاد رکھے۔"

"ظفر علی میاں۔ کسی کی چھان بین کرنا تمہارا ذاتی معاملہ ہے۔ میں اس ضمن میں تمہیں کوئی مشورہ نہیں دوں گا۔ نہ یہ کہوں گا کہ تم جانبداری سے کام لو۔ تم جو سمجھو کرو۔ مجھے اس سے کوئی سروکار ہے نہ اُس کی پروا۔ تم یقیناً حقائق جاننے کی جستجو کرو۔ مجھ سے جو ہو سکا۔ میں تمہاری مدد کروں گا۔" میں نے بمشکل اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے کہا۔

"ظفر میاں، مگر مجھے بتاؤ یہ بیرسٹر راشد حسین کا قیام اب کہاں ہے؟"

"وہ شہر کے ایک پنڈت، پنڈت اونکار ناتھ کے ہاں مقیم ہے دراصل یہ پنڈت ہی راشد حسین اور اُس کی لڑکی ثمینہ کو آگ سے بچا کر لے گیا۔ ویسے یہ بہت حیرت انگیز واقعہ ہے۔ اس کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ کوئی پہنچا ہوا پنڈت ہے۔ بہرحال جتنے منہ ہیں اتنی باتیں۔ مجھے تو یہ اونکار ناتھ کبھی پسند نہیں آیا۔ بلکہ میرا خیال ہے بیرسٹر راشد حسین کی رپورٹ میں اسی کا ہاتھ شامل ہے۔"

پنڈت اونکار ناتھ کا نام سُن کر میرا چہرہ سُرخ ہو گیا۔ میں سرتاپا غصّے میں کانپنے لگا۔ ڈی ایس پی نے مجھے اس کیفیت سے دوچار دیکھا تو اس خیال سے کہ کہیں اس کیفیت میں میری زبان سے اس کے لئے کوئی بد دعا نہ نکل جائے، بڑھ کر میرے پاؤں پکڑ لئے اور گڑگڑانے لگا۔ میں نے اُسے مطمئن کر کے رخصت کیا پھر اُٹھ کر اپنے حجرے میں آ گیا۔

یہ ڈی ایس پی چلا گیا تو دُوسرا آئے گا۔ اب یہ سلسلہ چلتا رہے گا۔ راشد حسین کی رپورٹ میں کوئی جان نہیں۔ اور شمشیر علی کے قتل کے سینکڑوں چشم دید گواہ موجود ہیں۔ میں نے ان واقعات کے قانونی پہلوؤں پر غور کیا۔ مگر پولیس مجھے کسی بھی طرح پریشان کر سکتی ہے۔ اونکار ناتھ اس واقعے سے پورا پورا فائدہ اٹھائے گا میں حجرے میں آ کر یہی سوچتا رہا مجھے کیا کرنا چاہیئے۔ یہ میں کن لوگوں میں پھنس گیا ہوں۔ میاں صاحب کے زمانے میں تو کبھی ایسا نہیں ہُوا۔ یقیناً یہ سب میرے ذہن کی غت ربود کے سبب سے ممکن ہوا ہے۔ باہر لوگوں کا شور بڑھ گیا تھا۔ میں نے باہر آ کر دیکھا ڈی ایس پی سے لوگ گتھے ہُوئے تھے۔ وہ اپنے کسی کاغذ کی خانہ پُری نہ کر سکا۔ لوگوں نے پولیس کے خلاف نعرے لگائے۔ میں نے اشارہ کیا کہ خاموشی اختیار کی جائے۔ ایک لمحے میں وہاں سناٹا ہو گیا۔ ڈی ایس پی ظفر علی، رحیم خان سے کل کے واقعے کی تفتیش میں مصرُوف تھا۔ اور میں نے لوگوں سے معذرت کی کہ آج میں ان سے نہ مل سکوں گا۔ تھوڑی دیر میں ویرانی کا تسلط ہو گیا۔ اور میں حجرے میں آ کر اپنی سوچوں میں گم ہو گیا۔



میں بکھر گیا تھا۔ بار بار مجھ پر رقت طاری ہو جاتی۔ میرا جی چاہا کہ میں پورے شہر کو راکھ کے ڈھیر میں تبدیل کر دوں۔ میری اضطرابی کیفیت کو دیکھ کر ایک طوطے نے چیخ چیخ کر آسمان سر پر اٹھا لیا میں نے اسے بارہا تنبیہ کی کہ وہ یہ بے وقت کی راگنی ختم کرے۔ مگر وہ تو کچھ کہنا چاہ رہا تھا۔ میں اشتعال میں اس قدر بہرا ہو گیا کہ سُن بھی نہ سکا۔ آخر اس نے پھڑ پھڑا کر حجرے میں اپنے وجود کا احساس دلایا میں نے اس کی طرف غصے سے دیکھا تو وہ کہنے لگا "یا حیّ یا حیّ" وہ مجھے ایک وظیفہ یاد دلا رہا تھا جو اس کیفیت کو دُور کرنے کے لئے عام طور پر میاں صاحب پڑھا کرتے تھے۔ میں نے اُسے خاموش کیا۔ میں اس وظیفے کو نہیں پڑھنا چاہتا تھا میں خود کو اور مشتعل کرنا چاہتا تھا۔

میں نے طوطے کی بات کو نظر انداز کر کے اس وظیفے کو پڑھنا شروع کیا، جس کی فضیلت سے میں اپنی آنکھوں کو اس حجرے کی دیواروں سے باہر لے جا سکتا اور تھوڑی دیر بعد میں نے جو دیکھا وہ مجھے اور مشتعل کر دینے کے لئے بہت تھا۔ راشد حسین اور ثمینہ اونکار ناتھ کے ہمراہ ٹھہرے ہوئے تھے۔ راشد حسین بہت سراسیمہ تھا مگر اونکار ناتھ اُسے کچھ اس طرح کی تسلی دے رہا تھا کہ اب یہ فیصلہ ہو کر رہے گا کہ اس علاقے میں کون زیادہ افضل ہے۔ وہ جادوگر شاہد علی یا پنڈت اونکار ناتھ۔

وہ راشد حسین کو تسلی دے رہا تھا "تم کیوں گھبراتے ہو تم میری پناہ میں ہو جب تک میں تمہارے ساتھ ہوں کوئی تمہیں نقصان پہنچانے کی جرأت نہیں کر سکتا" —— "اب نقصان پہنچنے میں کیا رہ گیا ہے" راشد حسین بولا "شہر میں میری رسوائی ہو گئی۔ میرے آباؤ اجداد کی کوٹھی جل گئی۔ پنڈت جی۔ بس کسی طرح اس کم بخت شاہد علی کو ٹھکانے لگا دو۔ مجھے کچھ اور نہیں چاہیئے۔"

"دیکھتے جاؤ راشد حسین آگے کیا ہوتا ہے۔ ممکن ہے تمہیں اس سے برے حالات کا سامنا کرنا پڑے مگر یاد رکھو کہ شاہد علی کا مقابلہ اونکار ناتھ سے ہے تم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ آگ کے شعلوں سے میرے بیر تمہیں کیسے بچا لے آئے۔" پنڈت اونکار غصے میں واہی تباہی بک رہا تھا۔

"مگر سُنا ہے کہ شاہد علی کو پہاڑی والے میاں صاحب نے بہت کچھ سکھا دیا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ وہ ایک پہنچا ہوا بزرگ ہے پنڈت جی آپ نے اچھی طرح سوچ لیا ہے کہ آپ کا واسطہ کس بلا سے ہے" راشد حسین نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔

"راشد حسین" پنڈت اس پر گرجنے لگا۔ "وہ بچہ ہے میاں صاحب میرے سامنے خاموش رہتے تھے۔ اس کی حیثیت کیا ہے۔ پولیس میں رپورٹ کے بعد اس کی شخصیت مشکوک ہو گئی ہے کچھ دنوں بعد وہ رسوا ہو جائے گا۔ میں یہی چاہتا ہوں کہ وہ نادانی میں اُلٹے سیدھے قدم اٹھائے اور میں اسے اس پہاڑی سے بے دخل کر سکوں" —— پنڈت کی اس جرأت و جسارت پر میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ میں نے اور بہت کچھ دیکھا اور میں برداشت نہ کر سکا۔ میں نے اپنی آنکھوں کو وہاں سے واپس بلا لیا۔ طوطے نے پھر "یا حیّ یا حیّ" کی رٹ

لگانی شروع کر دی۔

جب میری حالت زیادہ خراب ہو گئی اور مجھے خود کو سنبھالنا مشکل ہو گیا تو میں نے طوطے کی چیخ پکار پر میاں صاحب کی ہدایت کے مطابق ایک وظیفہ پڑھنا شروع کر دیا۔ جب میں یہ وظیفہ مکمل کر چکا تو میری حالت میں غیر معمولی تبدیلی ہوئی۔ نہ اب کوئی غصّہ تھا نہ اضطراب۔ میں بہت پُر سکون ہو گیا تھا۔ اور اپنی گزشتہ کیفیت پر نادم بھی تھا۔

دُرِّ شہوار اور ابوالحسن میرے پاس آئے تو میں بہت سنبھلا ہوا تھا۔ اتنے بڑے واقعے کے بعد میری حالت اطمینان بخش دیکھنے کے بعد ابوالحسن نے خُدا کا شکر ادا کیا اور مجھے وہی صبر و ضبط کی تلقین کی کہ ان معاملوں میں پڑنا ہمارا منصب نہیں۔ اب یہی مناسب ہے کہ موجودہ نزاع کو کسی طرح نمٹا یا جائے اور اس پہاڑی کی حرمت برقرار رکھی جائے۔ میں ابوالحسن کی باتیں نہایت تحمل سے سنتا رہا۔ اگر میں اس وقت خود کو کوئی مشورہ دیتا تو وہ یہی ہوتا۔ دُرِّ شہوار اپنے باپ کے سامنے نہیں بولتی تھی۔ مگر اُس نے نظروں نظروں میں اپنے باپ کے مشوروں کی توثیق ضرور کر دی تھی۔

میں رات کہیں نہیں گیا۔ اور خود کو سمجھاتا رہا کہ خدا کو بیرسٹر راشد حسین کی تباہی منظور نہیں۔ وہ میرے ہر عتاب سے بچ جاتا ہے۔ اس نے اولکارناتھ کو اس کا محافظ بنا کر کھڑا کر دیا ہے میرا کام کچھ اور ہے۔ مجھے اپنے خدا کے اور قریب ہونا ہے مجھے معاف کر دینا چاہیئے۔ یقیناً میری خاموشی کا غلط مطلب اخذ کیا جائے گا۔ مگر اس سے کیا ہوتا ہے۔ بہت سخت ذہنی کشمکش کے بعد میں نے فیصلہ کر لیا کہ بیرسٹر راشد حسین اور اولکارناتھ دونوں کو معاف کر دیا جائے۔ قابلِ صد احترام ہیں وہ جو دوسروں کو معاف کر دیتے ہیں۔ اس فیصلے پر میرے دل و دماغ کا سارا بوجھ چھٹ گیا۔ ذہن کی ساری کثافت دُور ہو گئی۔ میں نے بارگاہِ ایزدی میں سربسجود ہو کر معافی طلب کی۔ میں نے کہا "خدا مجھے معاف کر۔ میں راستے سے بھٹک گیا تھا۔ میری رہنمائی کر۔"

رات کو میں نے کسی روح کو طلب نہیں کیا۔ میں پوری نیند سے سو رہا۔ دوسری صبح طوطوں نے شور و غل کر کے مجھے بیدار کیا۔ میں نے جلدی سے اُٹھ کر فجر کی نماز ادا کی۔ ایک بار پھر اپنے خدا سے اپنے گناہوں کی معافی مانگی اور رات والے عہد کی تجدید کی۔

میں نماز سے فارغ ہوا تھا کہ دُرِّ شہوار کے بجائے ابوالحسن میرا ناشتہ لے کر آئے۔ دُرِّ شہوار کے نہ آنے سے مجھے ایک کمی سی محسوس ہوئی۔ میں ابوالحسن سے اس کے متعلق پوچھنے والا تھا کہ کسی نے حجرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ ابوالحسن نے دروازے کے باہر جا کر دیکھا تو اکبر وہاں موجود تھا۔ دروازہ کھُلتے ہی وُہ اندر آ گیا۔ اس کے چہرے پر پریشانی کے گہرے تاثرات دیکھ کر میں مضطرب ہو گیا۔ یقیناً وُہ کسی اہم ضرورت کے تحت ہی میرے پاس اس وقت آیا تھا۔ اپنے محسن اور سچے دوست کو پریشان دیکھ کر میں تیزی سے آگے بڑھا۔ اس کی پریشانی کا احوال پوچھا تو اکبر آبدیدہ ہو کر بولا "شاہد میاں! میں تباہ ہو گیا ہوں۔ میرا سب کچھ چھین لیا گیا ہے۔"

"اکبر۔ میرے دوست۔ خدا کے لئے مجھے بتاؤ کہ تم پر کیا افتاد آ پڑی ہے۔ کس نے تمہیں پریشان کرنے کی جرأت کی ہے۔"

میں نے اکبر کو اپنے قریب بٹھاتے ہوئے پوچھا تو وہ بے اختیار ہچکیاں لے کر رو پڑا۔ اس کے آنسو کسی طرح تھمنے کا نام نہ لیتے تھے میں نے اُسے رونے دیا۔ جب اس کے آنسو خشک ہوئے تو وہ بسورتے ہوئے بولا۔

"شاہد میاں۔ رات نہ جانے کس دشمن نے میرے گھر کو آگ لگا دی۔ میری بوڑھی ماں میرا بھائی اور تمہاری بھابی سب جل کر مر گئے۔ ایک میں بدنصیب تھا جو آنسو بہانے کے لئے بچ گیا۔ کاش میں بھی مر گیا ہوتا۔"

اکبر کی زبانی صورتِ حال معلوم ہُوئی تو میرا ماتھا ٹھنکا۔ میں نے اسی وقت چند لمحوں کے لئے ارتکازِ توجہ کی تو سیاہ و سپید سے آگاہ ہو گیا۔ اولکارناتھ نے میرے بے قصور دوست اور محسن کا گھر اس کے خاندان سمیت برباد کر دیا تھا۔ رات میں نے راشد حسین اور اولکارناتھ کے سلسلے میں جو فیصلہ کیا تھا۔ وُہ آنِ واحد میں میرے ذہن سے حرفِ غلط کی طرح مٹ گیا۔ میں اسی وقت جلالی کیفیت

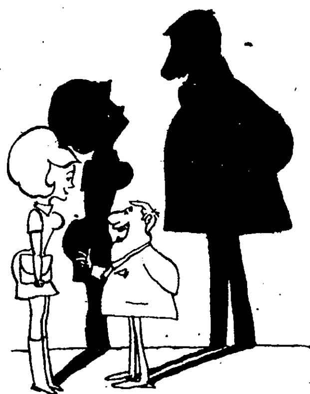
میں اُٹھا اور اکبر کا ہاتھ تھام کر بولا۔
"اکبر۔ میرے ساتھ چلو۔ میں جانتا ہوں۔ تمہاری بربادی میں کس بدبخت اور بدکردار کا ہاتھ ہے۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ وہ اس دنیا میں بدترین انجام سے دوچار ہوگا۔ آؤ میرے ساتھ۔ اب بات دوسرے انداز سے ہوگی۔"
اکبر نے مجھے غصّے کی حالت میں دیکھا تو اپنا غم بھول کر بولا۔
"شاہد میاں۔ میں تمہیں ساتھ لے جانے کی غرض سے نہیں آیا۔ میں تو تمہیں اطلاع دینے آیا تھا۔ میں ابھی واپس جارہا ہوں مجھے ابھی تجہیز و تکفین کرنی ہے۔ بس دعا کرو کہ خدا مجھے صبر عطا کرے۔"
"نہیں نہیں اکبر۔ پانی سر سے اونچا ہوچکا ہے۔ اب یہ چپقلش جنگ کی صورت اختیار کرگئی ہے۔ ایسی صورت میں میں خاموش رہا تو خدا بھی مجھ سے ناراض ہوجائے گا۔"
ابوالحسن جو خاموش کھڑے یہ تمام باتیں سن رہے تھے۔ درمیان میں بولے۔
"آپ کے جانے کی ضرورت نہیں۔ یہاں آپ کے بہت سے خدام ہیں۔ ویسے آپ مرحومین کی تجہیز و تکفین کے سلسلے میں جانا چاہیں تو دوسری بات ہے۔ آپ کی ضرورت اس پہاڑی کو زیادہ ہے۔"
"ہاں مجھ سے زیادہ تمہاری ضرورت تمہارے عقیدتمندوں کو ہے۔" اکبر مجھے سمجھاتے ہوئے بولا "جو کچھ میرے ساتھ ہوا قدرت کو شاید اس میں بھی میری کوئی بہتری منظور تھی مجھے صرف تمہاری دعاؤں کی ضرورت ہے۔ اس کے سوا مجھے کچھ نہیں چاہیئے"
"نہیں، اب حالات حد سے تجاوز کرگئے ہیں۔ عبادت و ریاضت کا کام ایسے پراگندہ ماحول میں خوش دلی سے جاری نہیں رہ سکتا۔ بُرے لوگوں کو راہ راست پر لانا بھی ایک عبادت ہے۔ اب مجھے اس وقت تک سکون نہیں مل سکتا۔ جب تک میں ان بدکردار لوگوں کی اصلاح نہ کردوں۔"
اکبر اور ابوالحسن نے مل کر مجھے بہت سمجھایا۔ میری منت سماجت کی۔ لیکن میں کسی آہنی چٹان کی طرح اپنے فیصلے پر اڑا رہا۔ چنانچہ وہ دونوں میرے عزم کے آگے سرنگوں ہوگئے۔ ابوالحسن نے میرے ساتھ چلنے کی درخواست کی، لیکن میں نے پہاڑی پر عقیدت مندوں کی پرسش کے لئے انہیں مامور کردیا۔ دن خاصا نکل آیا تھا۔ پہاڑی پر عقیدت مند بڑھ رہے تھے۔ ابوالحسن نے میرے مشورے پر عقیدت مندوں کے ہجوم کو میری بیماری کا عذر کرکے بہ حسن و خوبی رخصت کردیا۔ جب پہاڑی خالی ہوگئی تو میں اکبر کے ساتھ باہر آیا لیکن پھر میں نے اپنی روانگی کا ارادہ ملتوی کردیا۔ مجھے خیال آیا کہ اگر میں دن کے وقت پہاڑی سے نیچے اترا تو میرے عقیدت مند مجھے گھیرلیں گے چنانچہ میں نے اکبر کو رخصت کیا اور رات کو آنے کا وعدہ کرکے بے چینی سے رات کا انتظار کرنے لگا
دن میں نے کس کرب سے گزارا۔ اس کا ذکر بے کار ہے ظہر، عصر اور مغرب کی نماز میں نے حجرے میں ادا کی۔ رات کا کھانا درِ شہوار لے کر آئی تو میں نے اس سے کوئی خاص بات نہیں کی۔ خاموشی سے کھانا کھایا۔
میں صرف اس سے اتنا ہی کہہ سکا۔ "دری۔ میں جلد واپس آؤں گا"
اس نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ خاموش خاموش واپس چلی گئی۔ عشاء کی نماز کے بعد ابوالحسن مجھے چھوڑنے آئے۔ میں تاریکی میں باہر نکلا۔ ایک طویل عرصے بعد میں اس راستے پر جارہا تھا، جہاں سے گزر کر میں میاں صاحب کے قدموں تک آیا تھا۔ میرے سامنے تاریکی تھی۔ پہاڑی درختوں سے ڈھکی ہوئی تھی۔ ہر سو تاریکی کا راج تھا۔ میں صرف اپنی آنکھیں روشن محسوس کررہا تھا۔ میرا دل سُلگ رہا تھا۔ 

چھوٹے میاں صاحب شاہد علی نے پہاڑی سے نیچے اتر کر کیا کیا؟ راشد حسین، ثمینہ اور اونکار ناتھ پر کیا بیتی۔ باقی واقعات کے لئے "غلام روحیں" کی چھٹی قسط پڑھیئے۔

آدمی اور سائے

خواہشیں حقیقتیں

ظاہر و باطن





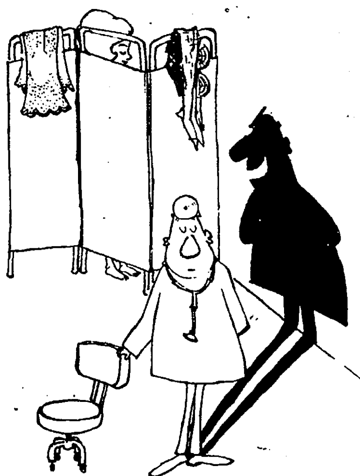


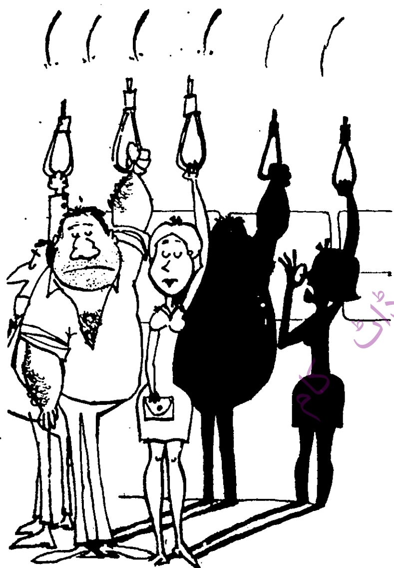




نئے انداز کے کارٹون


TRAVEL AG
AFRICA
MEX











”تو سارجنٹ‘ تمہارے کہنے کے مطابق انہیں شادی کئے ابھی صرف ایک مہینہ گزرا ہے۔“

” تقریباً ایک مہینہ۔ لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کچھ دن کم ہوں یا زیادہ۔ اس مدت میں زندگی کا بیمہ بہرحال کرایا جا سکتا ہے۔ پہلا کیس ایٹلانٹا میں ہوا تھا اور جب ہمیں اس کی لاش ملی تو شادی کو صرف تین ہفتے ہوتے تھے البتہ فونیکس میں زہر خورانی کی دوسری واردات کا ارتکاب کرنے میں اس نے کچھ زیادہ دن لگا دیے تھے۔“



صفدر صدیقی

” اور تمہیں یقین ہے کہ وہ شادی کے بعد اس شہر میں قیام پزیر ہیں — کہیں ایسا تو نہیں کہ تمہیں غلط اطلاع ملی ہو؟“

” اس بات کا کوئی امکان نہیں۔“ سارجنٹ نے جواب دیا۔ ”میں چیک کر چکا ہوں۔ وہ نمبر ۴۸۶ میلروز بلڈنگ میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ یہ فلیٹ انہوں نے گزشتہ ماہ کی ۵ تاریخ کو کرایے پر لیا تھا۔ مجھے اندیشہ ہے کہ ہم یہاں باتوں میں وقت ضائع کر رہے ہیں۔ عین ممکن ہے کہ اس وقت بھی وہاں کوئی اپنا آزمودہ زہر کسی شربت یا کسی کھانے میں ملا کر تیسرا شکار مارنے کی کوشش کر رہا ہو۔“

” اس صورت میں تمہیں ایک لمحے کی تاخیر کے بغیر روانہ ہو جانا چاہیئے۔“

” میں بھی یہی کہنے والا تھا۔“ سارجنٹ نے اٹھتے ہوئے کہا: ”میں بھی یہی اُمید لے کر یہاں آیا تھا کہ اس مرتبہ ہم اپنے اور آپ کے محکمے کے تعاون سے اسے رنگے ہاتھوں پکڑنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔“

"میں ہر ممکن مدد دینے کے لئے تیار ہوں۔" کیپٹن برانڈٹ نے میز پر رکھی ہُوئی گھنٹی پر ہاتھ مارا۔

ایک کانسٹیبل اندر داخل ہُوا۔

"سارجنٹ براؤن کو بلاؤ۔" کیپٹن نے حکم دیا۔

پانچ منٹ بعد سارجنٹ براؤن کیپٹن کو سلیوٹ کر رہا تھا۔

"سارجنٹ ۔۔۔ یہ اٹیلانٹا پولیس کے سُراغرساں سارجنٹ راجرس ہیں۔" کیپٹن نے تعارف کراتے ہُوئے کہا۔ "تمہیں ان کے ساتھ ضروری تعداد میں آدمی لے کر نمبر ۸۶ ہمیلروز بلڈنگ جانا ہے ان کا خیال ہے کہ اگر اب تک وہاں کوئی قتل نہیں ہُوا تو اب عنقریب ہونے والا ہے۔"



بھورے بالوں والے پیٹر ہالیڈے نے بڑی احتیاط سے سُرمئی رنگ کے رقیق کے دو بھرے ہُوئے چمچے گلاس میں ڈالے۔ پھر اس گلاس میں سنترے کا عرق انڈیل کر اچھی طرح آمیز کیا۔ بھرا ہُوا گلاس ہاتھ میں اُٹھا کر وُہ باورچی خانے سے نکلا اور تیز تیز قدم اُٹھاتے ہُوئے بیڈ رُوم میں داخل ہُوا جہاں اس کی بیوی گرم اُونی کمبل اوڑھے لیٹی ہُوئی تھی۔ اُس نے مُسکراتے ہُوئے گلاس اپنی بیوی کے ہاتھ میں دے دیا۔ وُہ بیمار ہونے کے باوجود بڑی حسین لگ رہی تھی۔ پیٹر نے دِل ہی دِل میں اپنے آپ کو مُبارکباد دی۔ اس مرتبہ واقعی وہ بڑا خوش قسمت ثابت ہو رہا تھا۔

"لو ڈارلنگ۔" اُس نے کہا۔ "یہ ڈاکٹر نے خصوصی طور پر تمہارے لئے تجویز کیا ہے۔"

"کیا چیز ہے؟"

"دوا ۔۔۔ اور کیا"

"کس قسم کی دوا۔" اس کی بیوی نے گلاس ناک سے لگاتے ہوئے سُونگھنے کی کوشش کی۔ "اس کی بُو تو بڑی خراب ہے۔"

"زکام اور بخار کی کوئی دوا ہے۔ آنکھ بند کر کے پی جاؤ۔"

"اس کا تو رنگ بھی بڑا عجیب سا ہے۔" اس کی بیوی نے کہا۔ "تمہیں بھی تو چھینکیں آرہی تھیں تم خود کیوں نہیں پی لیتے۔"

"میں اپنے لئے علیحدہ بنا لوں گا۔" پیٹر نے جواب دیا۔ "شاباش، اب جلدی سے پی لو۔"

"ابھی تھوڑی دیر میں پی لُوں گی۔" اُس کی بیوی نے گلاس سرہانے رکھی ہُوئی میز پر رکھ دیا۔

"میں ذرا لیٹر بکس دیکھنے جا رہا ہُوں۔" پیٹر نے تیوری پر بل ڈالتے ہُوئے کہا۔ "شاید کچھ ڈاک آئی ہو لیکن جب میں واپس آؤں تو یہ گلاس خالی ملنا چاہیئے۔"

پھر جب پیٹر ہالیڈے دوبارہ بیڈ رُوم میں داخل ہُوا تو گلاس بھرا ہُوا بدستور میز پر موجود تھا۔ اس نے ملامت آمیز نظروں سے اپنی بیوی کی طرف دیکھا وہ کچھ کہنا چاہتا تھا کہ اُس کی بیوی بول اُٹھی۔

"کیا کچھ ڈاک آئی ہے ڈیئر؟"

"تم نے اپنی دوا کیوں نہیں پی؟"

"کوئی اہم خط تو نہیں ہے؟"

"نہیں"

"انشورنس کمپنی کی جانب سے تو کوئی خط نہیں۔ میرا مطلب ہے ہماری پالیسیوں کی منظوری کے بارے میں۔"

"کل ایک خط آیا تو تھا۔ میں تمہیں بتانا بھول گیا۔" پیٹر نے جواب دیا۔ "انشورنس کمپنی نے رسمی طور پر ہمیں اطلاع دی ہے کہ ہماری پالیسیاں منظور ہو چکی ہیں۔"

"تو اب ہم زندہ رہنے کے بجائے مُردہ حالت میں زیادہ قیمتی ہو گئے ہیں۔"

"بیکار کی باتیں مت کرو۔" پیٹر نے تیزی سے کہا۔ "تم اچھی طرح جانتی ہو کہ مجھے موت کے تذکرے سے وحشت ہوتی ہے۔ اچھا چلو اب گلاس اٹھاؤ اور دوا پی جاؤ۔"

"میں بیمار ہوں۔ اگر اتفاق سے مر گئی تو تم خوش نصیب ہو گے جسے انشورنس کی رقم ملے گی۔"

لیکن پیٹر کو یہ بات بتلائے جانے کی ضرورت نہیں تھی۔ وُہ اس بارے میں پہلے ہی سب کچھ جانتا تھا۔ جانتا ہی نہ تھا بلکہ دو مرتبہ انشورنس کلیم کی رقم بھی وصُول کر چکا تھا۔ اپنی پہلی بیوی سیلی کے انتقال کے بعد اور پھر دُوسری بیوی جینی کے انتقال پر۔

"باتوں میں ٹالنے کی کوشش مت کرو ڈارلنگ۔" اُس نے کہا۔ "دوا نہیں پیو گی تو صحت یاب کیسے ہو گی۔"

" ابھی ایک منٹ میں پیتی ہوں"۔ اُس کی بیوی نے جواب دیا۔
"میں نے گوشت پکنے کے لئے اوون میں رکھ دیا تھا۔ ذرا اسے جا کر دیکھ لو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وُہ جل جائے۔ مجھے اپنی تو فکر نہیں۔ نہ مجھے بھوک ہے اور نہ بیماری کی وجہ سے کھا سکتی ہوں۔ مگر تم ضرور بھوکے رہ جاؤ گے۔"

پیٹر ہالیڈے نے باورچی خانے میں آ کر گوشت دیکھا۔ وُہ ابھی کچا ہی تھا۔ اُس نے اسے دوبارہ اوون میں رکھ دیا۔ کچن کا دروازہ کھلا ہُوا تھا۔ وُہ بیڈ رُوم کا دروازہ بھی کھلا چھوڑ آیا تھا۔ گوشت رکھ کر اُس کی نظر بیڈ رُوم کی جانب اُٹھ گئی اور اس کے خیال میں بڑے موقع سے اُٹھ گئی کیونکہ عین اُسی وقت اُس کی بیوی نے سنترے کے عرق کا گلاس میز سے اُٹھایا اور ہاتھ بڑھا کر کھڑکی کے باہر اُلٹ دیا۔ پھر جلدی سے گلاس میز پر واپس رکھتے ہُوئے وُہ پہلے کی طرح بستر پر لیٹ گئی۔

پیٹر نے یہ دیکھا اور اُسے غصّہ آ گیا۔ ہونٹوں کو دانتوں میں دباتے ہوئے اُس نے اسی دوا کا دُوسرا گلاس تیار کیا۔ گلاس لے کر بیڈ رُوم میں آیا۔

"تم نے ابھی جو حرکت کی ہے وُہ میں دیکھ چکا ہُوں۔ یہ بھی نہیں سوچا کہ کھڑکی کے نیچے نازک پھولوں کے پودے لگے ہیں۔ اگر دوا نے اُنہیں نقصان پہنچایا تب؟"

" مجھے افسوس ہے۔"

" پیٹر نے غصّہ ضبط کرتے ہُوئے کہا "لو اب پی لو۔"

اس کی بیوی نے ابھی گلاس ہونٹوں سے ہی لگایا تھا کہ اطلاعی گھنٹی بجنے لگی۔ آواز سُن کر اُس نے گلاس مُنہ سے ہٹایا اور پیٹر کی طرف دیکھ کر مُسکرائی۔

" بالکل نہیں۔ اس مرتبہ میں تمہیں دوا پھینکنے کا موقع نہیں دُوں گا۔" پیٹر اس کی مُسکراہٹ کا مطلب سمجھ گیا تھا۔ "لاؤ گلاس مجھے دو۔ میں اُسے ساتھ لے جاؤں گا۔"

دروازہ کھولنے کے لئے جاتے ہُوئے پیٹر نے گلاس باورچی خانے میں رکھ دیا۔ پھر جب وُہ دوبارہ دروازہ بند کر کے واپس آیا تو گلاس بھی لیتا آیا۔

" کون تھا۔" اُس کی بیوی نے پوچھا۔

" کوئی شخص کسی مسٹر پی بوڈی اور اُن کی بیگم کا پتا پوچھ رہا تھا۔ میں نے کہہ دیا کہ مجھے نہیں معلوم یہ لوگ کون ہیں۔" پیٹر نے جواب دیا۔ "بہر حال وُہ کوئی بھی ہوں۔ تم اب اپنی دوا پی لو۔"

بُرا سا منہ بناتے ہُوئے اُس کی بیوی نے گلاس پیٹر کے ہاتھ سے لے لیا۔ ذرا سا چکھ کر دیکھا۔ "بہت ہی خراب مزہ ہے۔" وُہ بولی: "مجھے تو فوراً اُبکائی آ جائے گی۔"

" اچھا اب یہ بچوں جیسے نخرے ختم کرو اور پی جاؤ۔ کچھ نہیں ہو گا۔"

مجبُوراً اُس کی بیوی نے گلاس ہونٹوں سے لگایا۔ آنکھیں بند کیں اور غٹ غٹ کر کے پُورا گلاس ایک ہی سانس میں خالی کر دیا۔

" غالباً اب تو تمہیں اطمینان ہو گیا ہو گا۔" وہ خالی گلاس میز پر رکھتے ہُوئے تلخ لہجے میں بولی:

" ہاں۔ اور تمہیں بھی جلد ہی سکُون محسوس ہونے لگے گا" پیٹر نے جواب دیا۔ "اب آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کرو۔"

اس کی بیوی نے بڑی فرمانبرداری سے اس کے حکم کی تعمیل کی۔ سر تکیے پر رکھتے ہوئے آنکھیں بند کر لیں۔

"میں سو جاؤں تو مجھے اُٹھانا مت۔" اس نے آہستہ سے کہا۔ "خود ہی کھانا کھا لینا۔"

" اچھی بات ہے۔" پیٹر نے گلاس اُٹھا کر کمرے سے باہر جاتے ہُوئے جواب دیا۔

بیڈ رُوم سے باہر نکل کر اس نے بڑی احتیاط اور آہستگی سے دروازہ بند کر دیا۔ وُہ آپ ہی آپ مسکرا رہا تھا۔ زیرِ لب کوئی دھن گنگناتے ہُوئے وُہ کچن میں آیا۔ گلاس کو اچھی طرح سے دھویا۔ تولیہ سے خشک کیا اور حفاظت سے الماری میں رکھ دیا۔ ابھی وُہ یہ دیکھنے کے لئے کہ گوشت بھُن گیا ہے یا نہیں اُوون کی طرف متوجّہ ہُوا ہی تھا کہ دروازے کی گھنٹی ایک مرتبہ پھر بجنے لگی۔ اُس نے کچھ چونک کر بیڈ رُوم کی طرف دیکھا اور پھر بیرونی دروازے کی طرف چل دیا۔

" مسٹر ہالیڈے؟" اُن میں سے ایک نے پوچھا۔

" جی ہاں۔ میرا ہی نام ہے۔" پیٹر نے جواب دیا۔

" ہم آپ سے کچھ ضرُوری باتیں کرنا چاہتے ہیں۔" وہ دونوں پیٹر کے جواب کا انتظار کیے بغیر اندر آ گئے۔ پیٹر نے ایک مرتبہ پھر بیڈ رُوم کی طرف دیکھا۔

سقراط کے کانوں میں جب ایک ہمعصر حسین ترین طوائف تھیوڈیٹا کا نام بار بار گونجا تو اس نے طے کیا کہ وہ تھیوڈیٹا سے ملاقات کر کے اسے سمجھائے گا کہ وہ اس پیشے سے باز آجائے ۔ وہ اپنے شاگردوں کے ساتھ تھیوڈیٹا کے مکان پہنچ گیا۔ یہاں کی تو دنیا ہی نرالی تھی۔ کمروں کی سجاوٹ اور اس میں کارفرما حسن مذاق سے سقراط بہت متاثر ہوا۔ کمروں کی ہر چیز عیش و عشرت اور خواہشات نفسانی سے لطف اندوز ہونے کی ترغیب دے رہی تھی ۔ سقراط حیران تھا کہ اتنا قیمتی سامان خریدنے اور سجانے کے لئے تھیوڈیٹا کے پاس دولت کہاں سے آئی ؟

تھیوڈیٹا نے سقراط کا انتہائی خندہ پیشانی سے استقبال کیا۔

سقراط نے پوچھا " میں حیران ہوں کہ اتنا قیمتی سامان خریدنے کے لئے تیرے پاس دولت کہاں سے آئی ؟"

تھیوڈیٹا کے ہونٹوں پر ایک سحر انگیز مسکراہٹ کھیلنے لگی " یہ سب مجھے اپنے پیشے سے حاصل ہوا ہے "

" خوب !" سقراط بھی مسکرا دیا " میں تیرے کمروں کی آرائش اور اس میں کارفرما حسن مذاق سے بہت متاثر ہوں "

سقراط کے شاگرد اپنے اُستاد کے ردِ عمل پر غور کرتے رہے ۔

سقراط کہتا رہا " تجھے اپنی ذات اور مزاج میں چند مزید خوبیاں پیدا کرنی چاہئیں ۔ مثلاً یہ کہ جو لوگ تجھے چاہتے ہیں تجھے بھی ان سے محبت کرنی چاہیئے ، جب وہ بیمار پڑیں تو تجھے ان کی عیادت کرنی چاہیئے کبھی کبھی ان کی مزاج پُرسی کے لئے تجھے خود بھی ان کے گھروں پر جانا چاہیئے ۔ جو بدتمیز ہوں انھیں اپنی قربت سے محروم رکھ ۔ بدمذاقوں سے گریز کر ، اپنے کمروں کی آرائش اور زیبائش میں یکسانی ، اور یک رنگی نہ پیدا ہونے دے وقتاً فوقتاً ان میں تبدیلی کرتی رہ ، لباس کی نفاست اور ان کے رنگوں کے انتخاب میں اپنی خوش مذاقی اور انفرادیت قائم کر ۔ جسم کو صحت مند اور چہرے کو شگفتہ اور تازہ رکھ ، مجھے یقین ہے کہ اگر تو نے ان ہدایتوں پر عمل کیا تو ، تو اپنے پیشے میں دوسروں کے مقابلے میں زیادہ کامیاب اور خوش حال رہے گی "

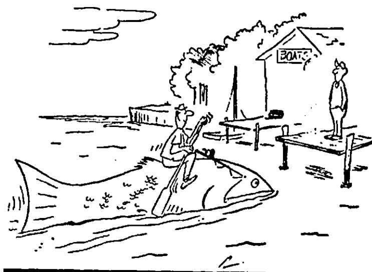
براہِ مہربانی ذرا آہستہ آواز میں باتیں کیجیئے گا ۔" وُہ دروازہ بند کرتے ہوئے بولا " میری بیوی کی طبیعت ٹھیک نہیں ، وُہ ابھی دوا پی کر سوئی ہے ۔"

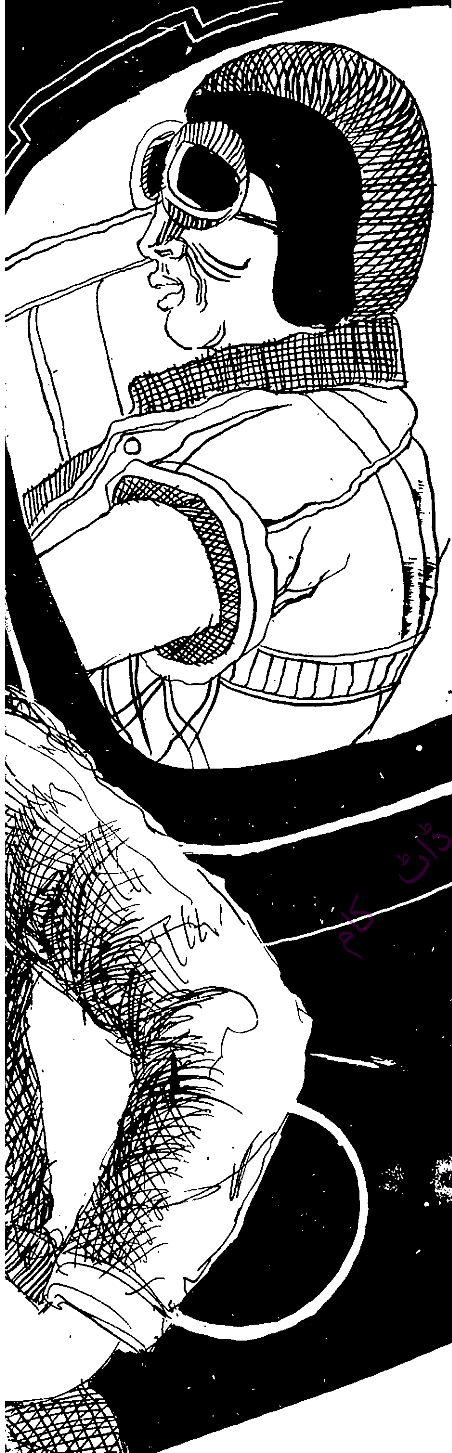


پیٹر ہالیڈے نے سُرمئی رقیق کے دو چمچے گلاس میں ڈال لیے ۔ سنترے کا عرق آمیز کیا اور ایک ہی مرتبہ پُورا گلاس پی گیا ۔ کوئی شک نہیں مشرُوب کا مزہ واقعی بُرا خراب تھا ۔

اس نے کھڑکی سے باہر جھانک کر دیکھا ۔ جہاں اس کی بیوی نے اپنا گلاس اُلٹا تھا ۔ وُہ سوچ رہا تھا کہ کہیں سچ مچ اس دوا نے پودوں کو نقصان نہ پہنچایا ہو ۔ اگر اتنی سردی نہ ہوتی تو وہ باہر جا کر اپنا اطمینان ضرُور کرتا لیکن موجُودہ صورت میں وہ خود بھی زکام میں مبتلا نہیں ہونا چاہتا تھا ۔ دُوسری باتیں ہی کیا کم تھیں کہ اب وُہ بھی بیمار پڑ جائے ۔ اب تک قسمت اس کے ساتھ بڑی ستم ظریفی سے پیش آتی رہی تھی ۔ اُس کی پہلی بیوی تیلی کار کے حادثے میں مری ۔ اُس نے دُوسری شادی کی تو دُوسری بیوی جنیتی تالاب میں ڈوب گئی اور اب پولیس اُس کی تیسری بیوی ڈولی کو گرفتار کر کے لے گئی ہے ۔ حالانکہ اسے ابھی تک یقین نہیں آیا تھا مگر پولیس کا کہنا یہی تھا کہ ڈولی اس سے قبل اپنے دو شوہروں کو زہر دے کر قتل کر چکی ہے اور تو اور وُہ سارجنٹ گوشت کے اس پارچے کو بھی اوون سے نکال کر لے گیا تھا جو ڈولی نے اس کے کھانے کے لئے پکنے رکھا تھا ۔ معلوم ہوتا ہے کہ آج اسے بھوکا ہی رہنا پڑے گا ۔

—————— واہ ری قسمت





جنگِ عظیم کا
ایک کارنامہ

ابو سلمان

موت سے پہلے

رات بہت تاریک اور خاموش تھی اور اس مہم کے لئے انتہائی موزوں جس کے لئے رائل فلائنگ کارپس کے سیکنڈ لیفٹیننٹ مارٹن ویسلیک کو بھیجا گیا تھا بشرطیکہ وہ اپنی ہمت اور اعصاب پر قابو رکھے۔ نوجوان آفیسر کو اپنی صلاحیتوں پر پورا اعتماد تھا اور اسے یقین تھا کہ ایک گھنٹے کے مختصر سے وقفے میں وہ اپنا کام مکمل کر کے واپس آجائے گا۔

"ڈیلڈ نگھم کے شمال مشرق میں پانچ کیلومیٹر کے فاصلے پر انجن بند کر کے پندرہ سو فٹ کی بلندی سے اتر آنا" اُس کے کرنل نے روانگی کے وقت ہدایات دیتے ہوئے کہا تھا: "اور کودنے کا اشارہ دینے سے پہلے یہ اطمینان کر لینا کہ تم مقررہ مقام پر پہنچ چکے ہو۔"

بیس ہزار فٹ کی بلندی پر پرواز کرتے ہوئے مارٹن نے بادلوں کے ایک خلا سے نیچے جھانکنے کی کوشش کی۔ اسے کچھ روشنیاں ٹمٹماتی نظر آئیں جس کا مطلب تھا کہ وہ دشمن کی خندقوں اور مورچوں کے اوپر پہنچ چکا ہے۔ یہاں سے آگے بڑھتے ہوئے اسے یہ احتیاط کرنا تھی کہ کہیں دشمن کے نگراں دستے اسے دیکھ نہ لیں۔ اگر اس کا جہاز اپنا بوجھ اتارنے سے پہلے ہی ان کی نظروں میں آگیا تو اسے اپنی یہ مہم ملتوی کرنا پڑے گی۔



وہ "بوجھ" جسے ایک مقررہ مقام پر پہنچانے کی ذمہ داری اس کے سپرد کی گئی تھی پچھلی نشست پر بیٹھا ہوا ایک بلجین ایجنٹ تھا جسے کچھ انتہائی اہم اور ضروری معلومات حاصل کرنے کے لئے بھیجا جا رہا تھا۔ جو میجر اسے ساتھ لے کر ہوائی اڈے تک آیا تھا اس نے اس کا نام جیکوئس پولیر بتایا تھا۔ اس کے علاوہ مارٹن اس کے بارے میں اور کچھ نہ جانتا تھا لیکن مختلف افواہوں کی بنیاد پر اس کا اندازہ تھا کہ جیکوئس کو اس جرمن حملے کے بارے میں ضروری معلومات حاصل کرنے بھیجا جا رہا ہے جس کے لئے اتحادیوں کا خیال تھا کہ عنقریب شروع ہونے والا ہے۔ فضائی جائزوں سے یہ بات واضح ہو چکی تھی کہ جرمن محاذ کے پیچھے اپنی فوجوں میں برابر اضافہ کر رہے ہیں اور اب فطری طور پر اتحادی ہائی کمان یہ جاننا چاہتی تھی کہ جرمن حملہ کس تاریخ کو اور کتنی طاقت سے کیا جانے والا ہے۔

مارٹن نے رولرز کی جرمن ریلوے لائن کے عقب میں پہنچنے تک بیس ہزار فٹ کی بلندی برقرار رکھی۔ اگر رات اتنی تاریک اور آسمان بادلوں سے ڈھکا ہوا نہ ہوتا تو اب تک کوئی نہ کوئی جرمن سرچ لائٹ اس پر پڑ چکی ہوتی۔ اگرچہ اس صورت میں بھی اس وقت تک کوئی پریشانی کی بات نہ تھی جب تک اس سے رابطہ قائم کر کے تفصیلات نہ جان لی جاتیں کیونکہ ہوائی جہاز کے پروں کے نچلے حصے میں سیاہ کاغذ کی پٹیوں سے جرمن سواستیکا کا نشان چسپاں کر دیا گیا تھا۔ جس سے دشمن اپنے ہی جہاز کی غلط فہمی میں مبتلا ہو کر دھوکا کھا سکتا تھا۔

ولیڈیگھم اب صرف دس کیلومیٹر کے فاصلے پر رہ گیا تھا۔ مارٹن جہاز کو دس ہزار فٹ کی بلندی پر لے آیا۔ اسے مقررہ مقام کی شناخت کے بارے میں بھی کوئی پریشانی نہیں تھی کیونکہ کرنل نے اپنی ہدایات میں یہ بات واضح کر دی تھی کہ ولیڈیگھم کے شمال مشرق میں جرمن ریلوے لائن کو ایک دریا زاویہ قائمہ پر کاٹتا ہوا گزرتا ہے۔ اگر تم اس کراسنگ پر جیکوئس کو نیچے کودنے کا اشارہ دو گے تو وہ زمین تک پہنچتے پہنچتے اپنے صحیح مقام پر اتر جائے گا۔

مارٹن طیارے کو مزید دو ہزار فٹ نیچے لے آیا۔ مگر ابھی تک اسے دبیز بادلوں کی تہہ سے نجات نہیں مل سکی تھی اور اسی وجہ سے اب بھی یہ معلوم کرنا ممکن نہ تھا کہ اس وقت اس کا طیارہ کس مقام پر پرواز کر رہا ہے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ آیا کچھ اور نیچے اترے یا بادلوں کے درمیان کسی کھلی جگہ آنے کا انتظار کرے۔ سوال خاصا پریشان کن تھا۔ کھلی جگہ کے انتظار میں وہ مقررہ مقام سے بھٹک بھی سکتا تھا۔۔۔ دوسری طرف اگر وہ مزید نیچے جائے اور دیکھ لیا جائے تو یہ بھی خطرناک بات تھی۔ جیکوئس جس کام کے لئے جا رہا تھا اس کے لئے ضروری تھا کہ دشمن اسے اترتے ہوئے نہ دیکھے ورنہ کوئی معلومات حاصل کرنے سے پہلے ہی اس کا گرفتار کر لیا جانا یقینی تھا۔ اس گرفتاری کے بعد اس کے انجام کے بارے میں کوئی خوش فہمی حماقت ہی تھی۔ جرمن خاص طور سے بلجین ایجنٹوں کو دیکھتے ہی گولی مار دیا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ مارٹن کا اپنا مستقبل بھی خطرے میں پڑنے کا امکان تھا۔ انٹیلیجنس کا محکمہ اس کی اس ناکامی کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔

آخر اس نے نیچے اترنے کا فیصلہ کیا۔ چھ ہزار فٹ، پانچ ہزار فٹ، چار ہزار فٹ اور زمین اب بھی مکمل طور پر نظروں سے اوجھل تھی۔ اسے بدقسمتی کے سوا اور کیا کہا جا سکتا تھا کہ مارٹن مقررہ مقام کے علاوہ اس سے کم بلندی تک آنے کی ہمت نہیں کر سکتا تھا اور اسے کچھ معلوم نہ تھا کہ وہ اس وقت کس جگہ پرواز کر رہا ہے۔ ایسی صورت میں اس کے پاس اس کے سوا دوسرا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ پھر اوپر جائے اور بادلوں میں ادھر ادھر چکر لگا کر کوئی ایسی جگہ تلاش کرے جہاں بادل نہ ہوں اور وہ بآسانی زمین تک دیکھ سکے۔ اس نے دوبارہ تھروٹل کھول دیا طیارہ اوپر چڑھنے لگا، تیس سیکنڈ تک انجن بڑی خوش اسلوبی سے چلتا رہا پھر ایک دم اس نے جھٹکا سا کھایا۔ مارٹن مغربی محاذ پر گزشتہ دو ماہ کے مسلسل پروازی تجربے کے بعد کافی ہوشیار ہو گیا تھا۔ اس نے جلدی سے تھروٹل کو دو تہائی کھول دیا۔ یہ سوچ کر کہ شاید طیارے کے کاربوریٹرز میں مناسب مقدار میں پٹرول نہیں پہنچ رہا ہے۔ اس کارروائی کا فوری نتیجہ برآمد ہوا اور تقریباً دو منٹ تک طیارے کا انجن بڑی سبک رفتاری سے چلتا رہا لیکن اس سے پہلے کہ مارٹن اس کی طرف سے مطمئن ہو کر کوئی دوسری بات سوچتا انجن نے ایک اور جھٹکا کھایا اور ایک دم بند ہو گیا۔

"کیا پٹرول ختم ہو گیا ہے میگنٹ خراب ہو گئے ہیں یا کوئی اور میکینیکل خرابی پیدا ہو گئی ہے" مارٹن کا ذہن تیزی سے تمام امکانات کا جائزہ لینے لگا اور طیارے کا رخ اترنے کے انداز میں نیچے

کی جانب کر دیا۔ اگر پٹرول آتے آتے رُک گیا ہے تو وہ اب بھی بچ سکتا ہے لیکن اگر ——— کوئی دوسری خرابی ہے تب پھر تباہی یقینی ہے۔

آخری کوشش کے طور پر اس نے محفوظ ٹنکی کا ٹیپ بھی کھول دیا اور دل ہی دل میں دعائیں مانگنے لگا۔ اچانک ایک ہاتھ نے اس کے کندھے کو گرفت میں لیتے ہوئے جھنجوڑ ڈالا۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟" جیکوئس کی سہمی ہوئی آواز مارٹن کے کانوں سے ٹکرائی۔

"انجن بند ہو گیا ہے۔" مارٹن نے جواب دیا۔

"اُوہ خدایا پھر — کیا ہو گا؟" جیکوئس چیخ اُٹھا۔

جواب، وہ خود بھی یہ کہہ سکتا تھا کہ "پھر ہمارا کیا ہو گا؟"

ایک برطانوی پائلٹ کی حیثیت سے مارٹن کو کہیں نازک حالات کا سامنا تھا جبکہ جیکوئس نہ صرف شہری لباس میں بلکہ خود اپنے ملک بلجیم کی حدود میں تھا۔ "مضبوطی سے سیٹ پر بیٹھے رہو، میں جہاز کو غوطہ دینے کی کوشش کرتا ہوں۔" مارٹن نے ترش لہجے میں کہا۔

اس نے کنٹرول کالم کو سنبھالتے ہوئے تھروٹل کو بہت آگے پیچھے کیا لیکن طیارے کے مُردہ انجن میں جان نہ پڑ سکی۔ یہاں تک کہ جہاز زمین سے ایک ہزار فٹ کی بلندی تک آ گیا۔ اب مارٹن نے ہمت ہار دی۔ اب اس حقیقت کے اعتراف کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ اپنے طیارے کو دشمن کے عقب میں اُتارنے پر مجبور ہے۔ اور اس طرح اترنے کا نتیجہ جہاز کی تباہی اور اس کی موت کے سوا کیا ہو سکتا تھا۔ ابھی اس کی عمر ہی کیا تھی۔ صرف اکیس سال۔ بلکہ پورا اکیس سال کا بھی نہیں تھا۔ وہ آئندہ ماہ اپنی اکیسویں سالگرہ گھر پر منانے کا پروگرام بنا رہا تھا۔

اچانک مارٹن کو پچھلی سیٹ پر روتے چلاتے جیکوئس کا خیال آیا۔ اس کی ذمہ داریاں مارٹن سے کہیں زیادہ اہم تھیں۔ اسے ایک خاص فرض سونپا گیا تھا جسے ہر صورت میں تکمیل پانا تھا۔ مارٹن نے سوچا کہ اس کا اپنا انجام خواہ کچھ بھی ہو لیکن کیا وہ جیکوئس کو منصوبے کے مطابق اتارنے کی کوشش نہیں کر سکتا۔ اپنی تمام تر قوتِ ارادی کو کام میں لاتے ہوئے مارٹن نے اپنے آپ کو سنبھالا۔

"میری بات غور سے سنو موسیو جیکوئس۔" وہ بلند آواز میں بولا "اپنے آپ کو سنبھالو۔ تم اب بھی بخیریت زمین پر اتر سکتے ہو، خواہ میں بچوں یا نہ بچوں تم کودنے کے لئے تیار ہو جاؤ، میں پوری کوشش کروں گا کہ جہاز تمہارے کودنے کی جگہ سے زیادہ سے زیادہ دور گر کر تباہ ہو۔"

مارٹن کو اپنی بات دو مرتبہ دہرانا پڑی تب کہیں جا کر خوفزدہ بلجین کی سمجھ میں اس کی بات آئی اور بات جیسے ہی سمجھ میں آئی وہ خوشی سے اچھل پڑا۔ "تو آخر کار میں مرنے سے بچ جاؤں گا۔ لیکن . . ." فوراً ہی کسی نئے خیال نے اس کی مسکراہٹ چھین لی "لیکن یہ جگہ کونسی ہے۔ میں کہاں اتروں گا؟" اس نے گھبرا کر پوچھا "کیا اس جگہ اترنا محفوظ ہو گا۔ تم مجھے اس مقام تک کیوں نہیں لے جاتے جہاں منصوبے کے مطابق مجھے اترنا چاہیئے۔"

"اس لئے کہ جہاز کا انجن بند ہو چکا ہے۔ اب یہ پرواز نہیں کر سکتا۔" مارٹن کو جیکوئس کی خود غرضی پر غصہ آ گیا "لیکن جہاں تک میں اندازہ لگا سکتا ہوں۔ اس کے مطابق اس وقت ہم ویلڈرگم کے جنوب مغرب میں کہیں ہیں۔ اب مقررہ مقام پر تمہیں اپنی ذاتی کوشش سے پہنچنا پڑے گا۔ بہرحال باتوں کا وقت گزر چکا۔ اپنا پیراشوٹ تیار رکھو اور جیسے ہی میں اشارہ دوں فوراً کود جاؤ۔"

اس نے طیارے کو حتی الامکان سنبھالتے ہوئے ایک ہاتھ سے جیکوئس کو جہاز کے کاک پٹ پر چڑھنے میں مدد دی۔ "جب میں تم سے کہوں کہ کود جاؤ تو بلا تامل چھلانگ لگا دینا۔" مارٹن نے ہدایت دی۔ "آہستہ سے تین تک گنتی گن کر پیراشوٹ کی رسی کو جھٹکا دینا وہ کھل جائے گی اور تم بہ حفاظت زمین تک پہنچ جاؤ گے۔"

جیکوئس پھٹی پھٹی خوفزدہ نظروں سے مارٹن کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"کود جاؤ۔" مارٹن نے ایک دم تیزی سے کہا۔

"نن ..... نن ..... نہیں ..... مم ..... میں ..... نہیں کود سکتا۔" جیکوئس خوف سے ہکلانے لگا۔

"تمہیں کودنا پڑے گا۔ تم ضرور کودو گے۔" مارٹن نے جھلا کر جواب دیا اور جیکوئس کے اس ہاتھ پر گھونسا مارا جس سے وہ جہاز کے کاک پٹ کو پکڑے ہوئے تھا۔ گھونسا پڑتے ہی جیکوئس کی گرفت چھوٹ گئی۔ اُس کے منہ سے ایک چیخ نکلی۔ اُس نے دوسرے

عربوں کے قبیلے ربیعہ پر اس کے کسی دشمن قبیلے نے حملہ کر دیا۔ سخت مقابلے کے بعد ربیعہ والوں کو مغلوب ہو جانا پڑا اور دشمن کے قبضے میں مال و اسباب اور قبیلے کی دوسری بہت سی عورتوں کے ساتھ امیرِ قبیلہ کی نوجوان بیٹی بھی چلی گئی۔

کچھ عرصے بعد دونوں قبیلوں کے بزرگوں نے آپس میں مفاہمت کر لینی چاہی اور ایک دوسرے کا حلیف بن جانا چاہا۔ گفتگو کا دَور چلا اور بالآخر دونوں میں جنگ نہ کرنے کا ایک معاہدہ ہو گیا اور یہ بھی طے پایا کہ قبیلہ ربیعہ کی جو عورتیں لوٹ میں چلی گئی ہیں انہیں واپس کر دیا جائے گا۔ قبیلہ ربیعہ کے امیر کو اپنی نوجوان بیٹی کی بڑی فکر تھی۔ حلیف قبیلے نے اسے واپس بھیجنا چاہا لیکن لڑکی نے اپنے باپ کے پاس جانے سے انکار کر دیا۔ اسے اپنے دشمن قبیلے کا ایک نوجوان پسند آ گیا تھا۔ وہ اس کے ساتھ رہنا چاہتی تھی۔ جب لڑکی اپنے قبیلے میں واپس جانے کو تیار نہ ہوئی تو فیصلہ یہ ٹھہرا کہ لڑکی کا باپ خود اس سے ملے اور بات چیت کے ذریعے کوشش کرے کہ لڑکی اپنے قبیلے میں واپس جانے کیلئے آمادہ ہو جائے۔ باپ لڑکی سے ملا اور اس نے ہر قسم کی گفتگو کر کے دیکھ لیا لیکن لڑکی ٹس سے مَس نہ ہوئی۔ وہ اپنے اسی ارادے پر ڈٹی رہی کہ وہ اپنے محبوب ہی کے پاس رہے گی اور کسی قیمت پر بھی واپس نہ جائے گی۔ قبیلہ ربیعہ کا سردار مایوس اور دل شکستہ اپنے قبیلے میں واپس چلا گیا اور لڑکی کی اس جرأت، سرکشی اور سرتابی کی یہ سزا تجویز کی گئی کہ آئندہ اس قبیلے میں جو لڑکی پیدا ہو ہلاک کر دی جائے۔ عربوں میں یہ پہلا قبیلہ تھا جس نے لڑکیوں کی ہلاکت کی رسم رائج کی۔ بعد میں دوسرے قبیلوں نے بھی اس رسم کی پیروی کی اور پورے عرب میں یہ رسم رائج ہو گئی۔

ہاتھ سے کاک پٹ کو پکڑنا چاہا۔ لیکن اس کا یہ ہاتھ پیراشوٹ کھولنے والے چھلّے کو پکڑے ہوئے تھا۔ جھٹکا لگتے ہی ہوائی چھتری کھل گئی اور ہوا کے ایک تیز جھونکے نے اسے طیارے کی دُم کی طرف پہنچا دیا۔

"احمق آدمی کودتے کیوں نہیں؟" مارٹن چلّایا۔ اسے خطرہ تھا کہ اگر پیراشوٹ جہاز کی دُم میں پھنس گئی تو جیکوئس زندہ زمین تک ہرگز نہ پہنچ سکے گا۔ مارٹن نے ایک مرتبہ پھر پوری قوت سے اس کے ہاتھوں پر گھونسا مارا۔ جیکوئس کے منہ سے ایک چیخ نکلی اور وہ فضا میں پھسل گیا۔

مگر اتنی دیر میں پیراشوٹ جہاز کی دُم میں پھنس چکی تھی۔ جیکوئس کا وزن بھی اُسے چھڑانے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ مارٹن نے دیکھا کہ وہ طیارے سے تقریباً بیس فٹ نیچے لٹکا ہوا ہاتھ پاؤں مار رہا ہے۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ جہاز زمین سے بمشکل چھ سات سو فٹ کی بلندی پر رہ گیا تھا۔ اگر چند لمحوں کے اندر کسی معجزے کے طور پر پیراشوٹ جہاز کی دُم سے آزاد نہیں ہوئی تو جیکوئس کی موت یقینی تھی۔

اور بات صرف اتنی ہی نہ تھی بلکہ دُم کی جانب لٹکے ہوئے جیکوئس کے وزن نے طیارے کو سیدھا کرنا شروع کر دیا تھا۔ زمین تیزی سے قریب آتی جا رہی تھی۔ اگر طیارہ ترچھی صورت میں نوک کی طرف سے ٹکرانے کے بجائے سیدھی طرف سے ٹکرایا تو بچنے کا کوئی موہوم سا امکان بھی باقی نہ رہ جاتا تھا۔ گرتے ہی اس کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جانا یقینی تھا۔

اس سے اگلے چند لمحے مارٹن کی زندگی میں کسی خواب پریشاں کی حیثیت رکھتے تھے۔ اس کا ذہن ان گنت خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ لیکن اب بھی ہوائی چھتری کو جہاز کی دُم سے آزاد کرانے کا خیال سب پر حاوی تھا۔ اگر اس کا انجن کام کر رہا ہوتا تو وہ طیارے کو بلندی پر لے جا کر خود اس کی دُم کی طرف جانے کا خطرہ مول لے کر جیکوئس کو چھڑانے کی کوشش کرتا۔ لیکن اب تو وقت اتنا کم رہ گیا تھا کہ کوئی بات اگر سمجھ میں بھی آ جاتی تب بھی اس پر عمل کرنے کی مہلت نہ تھی۔

طیارہ نیچے اور نیچے گرتا چلا جا رہا تھا۔ مارٹن کا دل ڈوب گیا وہ اپنے مشن میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ اس نے اپنے اسکواڈرن اور برطانوی فوج کی اعلیٰ کارکردگی کو بٹّا لگایا تھا۔ وہ آزمائش کے وقت اپنے ملک اور اپنی قوم کی توقعات پر پورا اترنے میں ناکام رہا تھا۔ وہ نہ صرف اپنی بلکہ ایک وفادار جاسوس اور ایک طیارے کی تباہی کا بھی ذمہ دار تھا۔

کوئی چیز پُرشور آواز کے ساتھ ٹوٹی۔ خدایا یہ کیا تھا؟ مارٹن نے تیزی سے گھوم کر دیکھا۔ پیراشوٹ غائب ہو چکی تھی جیکوئس

کا وزن ہوائی چھتری کے کچھ حصے میں بھری ہوئی ہوا کا دباؤ اور بار بار پڑنے والے زبردست تھپیڑے۔ جہاز کی دُم کے لئے ناقابلِ برداشت تھے۔ وُہ ٹوٹ کر نیچے گری اور اپنے ساتھ بلجئین ایجنٹ جیکوئس کو بھی زمین کی طرف لے گئی۔

مارٹن کے رگ وپے میں اطمینان کی لہر دوڑ گئی۔ وُہ نیچے اترتے ہوئے جیکوئس کو دیکھنے کے قابل تو نہیں تھا۔ مگر اب کم از کم اُس کا حفاظت سے زمین تک پہنچنے کا امکان ضرور روشن ہو گیا تھا۔ مارٹن کو اپنی جان کی پرواہ نہ تھی۔ یہ رہے یا جائے اب اسے یہ خوشی ضرور تھی کہ جو فرض اُسے سونپا گیا تھا وہ پُورا ہو چکا ہے۔ وُہ تیزی سے اپنی سیٹ سے نکلا اور جہاز کی اوپری سطح سے چپک گیا۔ شاید اس طرح زمین سے ٹکرانے کا جھٹکا اس تک پہنچتے پہنچتے کچھ ہلکا ہو جائے۔ زمین پر گرتے ہوئے اس کی آنکھوں کے سامنے پانی کی سطح۔ درختوں کا جھنڈ اور ایک مکان یہ سب تیزی سے گزرتے چلے گئے۔

پھر ایک خوفناک دھماکا ہوا۔ طیارے کے پر شاید کسی ——— درخت سے ٹکرائے اور ٹوٹ گئے۔ مارٹن نے جہاز کو کانپتے ہوئے محسوس کیا۔ پھر شاید اس کا اگلا نوکیلا سرا دُور تک زمین پر گھسٹتا چلا گیا۔

مارٹن شاید کبھی بھی یہ نہ جان سکے گا کہ اس کے بعد کیا ہُوا تھا؟ غالباً درخت نے کسی اسپرنگ کی طرح جہاز کی ٹکر کا بیشتر حصّہ خود برداشت کر لیا تھا۔ اور جب اس کا جہاز زمین سے ٹکرایا تو اس میں زیادہ شدت نہیں رہ گئی تھی۔ مارٹن ٹکڑے ٹکڑے ہونے کی توقع کر رہا تھا۔ لیکن اس کے بجائے اس نے اپنے آپ کو ایک جھاڑی کے اوپر گرا ہوا پایا۔ اس ہولناک حادثے سے سہما ہوا۔ وہ دو ایک منٹ تک بالکل گم سم سا کھڑا رہا تھا۔ پھر ہوش میں آ کر اس نے اپنا جائزہ لیا۔ یہ حیرت انگیز بات تھی کہ نہ صرف وہ زندہ تھا بلکہ جھاڑی سے لگنے والی چند خراشوں کے علاوہ اُسے کوئی زخم بھی نہیں آیا تھا

فوراً ہی بھاگ کر اپنی طرف آتے ہوئے قدموں کی آواز نے اسے احساس دلایا کہ وہ دشمن کے ملک میں کھڑا ہے۔ ان آوازوں کے ساتھ ہی اسے جہاز کے پروں کے نیچے لگے ہوئے سواستیکا کا نشان یاد آ گیا۔ زندہ بچ جانے کی خوشی آن واحد میں کافور ہو گئی۔ مگر ظاہر ہے کہ وہ کیا کر سکتا تھا۔ اس کے پاس کوئی ہتھیار تک نہ تھا۔ ہوتا بھی تو وہ ایک رائفل یا مشین سے چاروں طرف پھیلی ہوئی جرمن قوت کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ مارٹن نے ایک گہری سانس لی اور تن کر کھڑا ہو گیا۔

تقریباً تیس سیکنڈ بعد اس نے اندازہ لگایا کہ یہ بھاگ کر آنے والا کوئی ایک ہی فرد ہے اس نے سوچا کہ اگر کسی طرح وہ اس آنے والے کو قابو میں کر لے تو اُسے اتنا موقع ضرور مل سکتا ہے کہ وہ جہاز کے پروں کے نیچے لگے ہوئے سواستیکا کے نشان کو کھرچ ڈالے۔ کسی ایسے ثبوت کے بغیر جس سے اس کی پوشیدہ مہم کی نوعیت پر روشنی پڑتی ہے۔ اُسے ایک عام جنگی قیدی کا درجہ دیا جائے گا۔ لیکن سواستیکا نشان کی موجودگی کا یہ مطلب تھا کہ اس نے جرمن افواج کو دھوکا دینے کی کوشش کی ہے اور وہ یقیناً کسی خفیہ مشن پر آیا ہے اور جرمنوں کے اس یقین کے بعد پھر اس کے ساتھ کسی عام جنگی قیدی کا برتاؤ نہیں بلکہ فوجی جاسوس کا سلوک کیا جائیگا اور وہ سلوک تھا، رائفل یا مشین گن کی گولی۔

مارٹن دبے پاؤں پیچھے ہٹا اور جھاڑی کے پیچھے چھپ گیا اس کے کان قدموں کی آواز پر لگے ہوئے تھے جو دم بدم قریب آتی جا رہی تھی۔ قدموں کی پھرتی اور ہلکے پن سے اندازہ ہوتا تھا کہ یا تو وہ کوئی ٹھگنے قد کا آدمی ہے۔ یا پھر کوئی عورت۔

اور پھر اس نے دیکھا کہ وہ ایک عورت، عورت بھی کیا، لڑکی تھی۔ لانبا چھریرا جسم۔ جہاز کے قریب آ کر اس کے قدم آہستہ ہو گئے۔ تاریکی کے باوجود مارٹن اُسے بخوبی دیکھ رہا تھا اس نے ایک بلاؤز اور اسکرٹ پہن رکھا تھا۔ کاندھوں پر ایک شال لپٹی ہوئی تھی۔ فوری طور پر فیصلہ کرتے ہوئے مارٹن نے اپنے آپ کو لڑکی کے رحم و کرم پر چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ لڑکی مقامی معلوم ہوتی تھی۔ کوئی اور مدد ملے یا نہ ملے اس سے اُسے اتنا ضرور پتا چل سکتا تھا کہ مارٹن اس وقت کس علاقے میں موجود ہے؟

مارٹن کو اچانک جھاڑی کے پیچھے سے نمودار ہوتے دیکھ کر موریانہ ایکدم رک گئی۔ اس نے لپٹی ہوئی شال کو کچھ اور مضبوطی سے پکڑ لیا۔ لیکن خطرے کے احساس کے باوجود جب وہ بولی تو اس کی آواز میں اعتماد تھا۔ قوت تھی۔ وہ فرنچ زبان میں بات کر رہی تھی۔ مارٹن فرانسیسی بول سکتا تھا۔ مارٹن نے اُسے بتایا کہ وہ ایک انگلش آفیسر ہے۔

"تم انگلش آفیسر ہو" موریانہ نے اس مرتبہ انگریزی میں پوچھا "لیکن تم یہاں......"

"میرا جہاز ایک حادثے کے نتیجے میں ان درختوں سے ٹکرا گیا" مارٹن نے جواب دیا "اور اب مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے پیدل مارچ کرنا پڑے گا۔"

موریانہ کو اس مزاحیہ لہجے سے کوئی ہنسی نہیں آئی۔

"مگر یہ تو بہت بُرا ہوا" وہ بولی "اگر تم جرمنوں کے ہتھے چڑھ گئے تو وہ تمہیں قتل کر دیں گے۔"

مارٹن کو ایک مرتبہ پھر طیارے کے پروں میں لگے ہوئے سواستیکا کے نشان کا خیال آ گیا۔

"اگر تم میری مدد کرو تو میں بچ بھی سکتا ہوں" اس نے التجا آمیز لہجے میں کہا "بولو۔ کیا تم میری مدد کرو گی؟"

موریانہ نے کچھ غیر یقینی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"جو کچھ میرے بس میں ہو گا ضرور کروں گی" اس نے کہا "تم مجھ سے کس قسم کی مدد چاہتے ہو؟"

مارٹن نے اس کا ہاتھ پکڑا اور ٹوٹے ہوئے جہاز کے نیچے لے گیا۔

"ان پروں پر سیاہ رنگ کی کاغذی پٹیاں لگی ہوئی ہیں" اس نے بتایا "سب سے پہلے ہمیں انہیں کھرچ کر صاف کر دینا چاہیئے۔ اگر جرمنوں نے یہ نشانات....."

"کیا تم اکیلے ہی یہاں آئے ہو؟" لڑکی نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کچھ جوش کے ساتھ کہا۔

"ہاں۔ بالکل" مارٹن نے فوراً جواب دیا۔ وہ کسی کو بھی جیکوئس کے بارے میں نہیں بتانا چاہتا تھا۔ خواہ پوچھنے والی کوئی ہمدرد لڑکی ہی کیوں نہ ہو۔

"شاید تم مجھ پر اعتماد نہیں کرتے!" موریانہ نے افسردگی سے گردن ہلائی "لیکن میں سب کچھ جانتی ہوں۔"

"کیا جانتی ہو؟"

"یہی کہ تم یہاں تنہا نہیں آئے ہو۔"

"یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو؟"

"تمہارے ساتھ ایک بلجین باشندہ بھی تھا جسے یہاں سے قریب ہی ایک مقام پر پیراشوٹ سے نیچے اترنا تھا" موریانہ نے مارٹن سے کہا۔

مارٹن نے موریانہ کی بات کا فوراً ہی کوئی جواب نہیں دیا لڑکی کا لب و لہجہ اتنا یقینی اور پُراعتماد تھا کہ اس کی بات محض اندازے پر مبنی نہیں ہو سکتی تھی۔ لیکن اُسے اتنی اہم اطلاع کس سے اور کیسے ملی؟ مارٹن نے کھُل کر بات کرنے سے پہلے کچھ مزید اطمینان کرنا چاہا۔

"تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم اس کا نام بھی جانتی ہوگی؟" اس نے بات کو مزاحیہ رنگ دیتے ہوئے کہا۔

"اگر تم چاہو تو نام بھی بتا سکتی ہوں۔" موریانہ نے سنجیدگی سے جواب دیا "اس کا نام جیکوئس پولییر ہے۔"

"کمال ہے یہ سب باتیں تمہیں کیسے معلوم ہوئیں؟" مارٹن نے حیرت سے پوچھا۔

"اس کا جواب بہت آسان ہے۔" موریانہ نے شانے اُچکائے۔ "جیکوئس میرا منگیتر ہے اور میں یہاں اس کی واپسی کا انتظار کر رہی تھی۔"

یہ انکشاف بے شک حیرت انگیز تھا، لیکن مارٹن نے یہ جواب سن کر حیرت کے بجائے سکون و اطمینان محسوس کیا۔ اس کا واضح مطلب یہ تھا کہ وہ دوستوں کے درمیان ہے۔ جیکوئس کی سفارش پر یہ لوگ اس وقت تک اُسے ضرور پناہ دے سکیں گے۔ جب تک وہ ہالینڈ کی سرحد پار کر کے اپنی فوجوں سے نہیں جا ملتا۔

"پھر تو بات ہی کچھ اور ہو گئی۔" آخر مارٹن نے کہا "ہاں تمہارا خیال درست ہے۔ جیکوئس میرے ساتھ ہی آیا تھا۔"

اور اس کے بعد اس نے جہاز کے انجن بند ہونے سے لے کر جیکوئس کے نیچے اترنے اور جہاز کے ٹکرانے تک کا پورا واقعہ سنا دیا۔

"تمہیں یقین ہے موسیو کہ وہ بحفاظت اُتر گیا ہوگا؟" موریانہ نے اضطراب سے پوچھا۔

"کوئی دوسری بات سوچنے کی بظاہر کوئی وجہ تو نہیں ہے۔" مارٹن نے جواب دیا "جیکوئس کی پیراشوٹ پوری طرح کھل گئی تھی"

"وہ کس جانب گرا تھا؟"

مارٹن نے ہاتھ اُٹھا کر مغرب کی جانب اشارہ کیا۔

"جہاں تک میرا خیال ہے اس طرف۔" اس نے کہا "یہاں سے زیادہ سے زیادہ نصف میل کے فاصلے پر۔۔۔ مگر۔۔۔۔۔ بات تو سنو۔۔۔۔۔"

لیکن موریانہ اُس کی بتائی ہوئی سمت میں تیزی سے بھاگتی ہوئی نظروں سے غائب ہو گئی۔ اگر سواستیکا کے نشانات کو مٹانا اتنا ضروری نہ ہوتا تو شاید مارٹن بھی اس کے پیچھے ہی چلا گیا ہوتا۔ لیکن وہ اُن کے انکشاف کا خطرہ مول لے کر اپنی اور جیکوئس کی زندگی کو خطرے میں نہیں ڈال سکتا تھا۔ اس نے جہاز کے ریڈی ایٹر سے پانی لیا اور کاغذ کی پٹیوں کو بھگو بھگو کر انہیں کھرچنے میں مصروف ہو گیا۔ جس شخص نے بھی وہ پٹیاں چپکائی تھیں بہت مضبوطی سے چپکائی تھیں۔ جہاز کی موجودہ پوزیشن میں مارٹن کے لئے انہیں چھڑانا بہت دشوار اور محنت طلب ثابت ہو رہا تھا۔

ابھی وہ ایک نشان بھی پوری طرح نہ کھرچ سکا تھا کہ ایک آواز نے اُسے چونکا دیا۔ اُسے اپنی رگوں میں خون جمتا ہوا محسوس ہوا یہ ایک تیز اور تحکمانہ آواز تھی جو کچھ فاصلے پر اندھیرے میں لپٹی ہوئی تاریک شکلوں کو ہدایت دے رہی تھی۔ مارٹن نے دیکھا کہ چاروں طرف مناسب فاصلے سے بکھری ہوئی چھوٹی چھوٹی قطاریں ایک دائرے کی شکل میں جہاز کی طرف بڑھ رہی ہیں۔ یقیناً کسی نہ کسی نے قریبی جرمن چوکی کو جہاز کے گرنے کی اطلاع دے دی تھی۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز کے ایک گورنر عبدالحمید ابن عبدالرحمٰن نے ان کو لکھا کہ "میرے اجلاس میں ایک ایسا شخص پیش کیا گیا ہے جس کا یہ جرم ہے کہ وہ آپ کو اکثر و بیشتر بُرا بھلا کہتا رہتا ہے پہلے تو میرا یہ خیال تھا کہ اس کی گردن اُڑا دی جائے لیکن پھر میں نے یہ سوچا کہ اس بارے میں امیرالمومنین کی رائے معلوم کر لی جائے اور اس کے مطابق اس کو سزا دی جائے، سردست میں نے اسے قید کر دیا ہے اور آپ کے حکم کا منتظر ہوں۔"

حضرت عمر بن عبدالعزیز نے جواب میں لکھا۔

"اگر تم نے اسے قتل کر دیا ہوتا تو میں تم سے اس کے قتل کا قصاص لیتا۔ اب اگر تم چاہو تو تم بھی اس کو بُرا بھلا کہہ لو اور اسے فوراً رہا کردو۔ یاد رکھو کہ صرف وہی شخص واجب القتل ہے جو رسول اللہ ﷺ کو (معاذ اللہ) گالیاں دیتا ہے۔"

مارٹن کو ایک بار پھر فوری فیصلہ کرنا پڑا۔ وہ گرفتاری سے تو بہر حال نہ بچ سکتا تھا۔ لیکن اُس نے تہیّہ کر لیا کہ جرمن یہ سیاہ نشان نہیں دیکھ سکیں گے۔ اتنی جلدی دُوسرے نشان کو کھرچنا ناممکن تھا۔ اس نے انجن تک پیٹرول لے جانے والی ربر کی نلکی کو پکڑ کر زور سے جھٹکا دیا۔ نلکی کا سرا نکل کر اُس کے ہاتھ میں آگیا۔ اُس نے جلدی جلدی ادھر اُدھر پیٹرول چھڑکا اور پھر نلکی کو زمین پر جہاز کے نیچے لٹکاتے ہُوئے جیب سے ماچس نکالی۔

ایک تیلی جلائی۔ وُہ بجھ گئی۔ اُس نے دُوسری تیلی جلائی وہ بھی بجھ گئی۔ ہوا کافی تیز تھی۔ جرمن سپاہی زیادہ سے زیادہ دو سو فٹ کے فاصلے پر رہ گئے تھے اگر اگلے چند سیکنڈ میں اُسے کامیابی نہ ہوسکی تو جیکوئس کی زندگی اور اس سے زیادہ اس کی خفیہ مہم خطرے میں پڑ جائے گی۔ کانپتے ہاتھوں سے اُس نے ایک اور کوشش کی۔ مگر ماچس کا ننھا سا شعلہ روشن ہوتے ہی ہوا کے ایک اور تیز جھونکے نے گل کر دیا۔

مارٹن کا ذہن اندیشوں سے بھرتا جا رہا تھا۔ کیا وُہ ایک اور ماچس جلائے۔ نہیں۔ ماچس جل بھی گئی۔ آگ لگ بھی گئی۔ تب بھی دشمن اتنا قریب آگیا تھا کہ سواستیکا کا نشان مکمل طور پر جلنے سے پہلے دیکھ لیا جانا یقینی تھا۔ پھر وہ کیا کرے؟ اپنے آپ کو دشمن کے حوالے کر دے یا بھاگنے کی کوشش کرے۔ اگر جرمنوں کا محاصرہ مکمل ہے تو اُسے جلد ہی شوٹ کر دیں گے۔ بلا سے کر دیں۔ وہ اپنی آزادی کے لمحات کو کچھ تو طول دے سکتا ہے۔

مارٹن اور آنے والے جرمن فوجیوں کے درمیان جہاز حائل تھا۔ وُہ جہاز کی آڑ لے کر درختوں کے جھنڈ کی طرف چلنے لگا۔ اس نے سوچا کہ درختوں کے دوسری طرف پہنچتے ہی بھاگ کھڑا ہو گا جلد ہی جرمن طیارے کے گم شدہ پائلٹ کو تلاش کرتے پھر رہے ہوں گے لیکن اس پُورے علاقے کو گھیرے میں لینے اور پھر اُسے تلاش کرنے میں کئی گھنٹے بھی لگ سکتے ہیں۔ اور ان گھنٹوں میں کچھ بھی ہوسکتا ہے۔

اس کے فرار کی کامیابی کا ایک امکان یہ بھی تھا کہ وہ جیکوئس کو تلاش کرے۔ مقامی باشندہ ہونے کی وجہ سے اس علاقے میں جیکوئس کے دوستوں اور پڑوسیوں کی خاصی تعداد موجود ہوگی جس کا ایک ثبوت خود موریانہ تھی۔ اگر یہ لوگ اُسے ایک دو دن کے لئے پناہ دینے پر آمادہ ہو جائیں اور اُسے کچھ شہری کپڑے بھی فراہم کر دیں تو عین ممکن تھا کہ وہ سرحد پار کر کے ہالینڈ پہنچ جائے۔

درختوں کے کافی دُور تک کھیت ہی کھیت پھیلے ہُوئے تھے۔ ان کھیتوں میں سے کچھ کی زمین سخت تھی اور کچھ میں تازہ ہل چلا ہوا تھا۔ مارٹن نے اپنے بھاگنے کے لئے سخت زمین والے کھیتوں کو پسند کیا تاکہ اس کے پیچھے قدموں کے نشانات نہ رہیں اور وہ جلد ہی کھیتوں کو پار کر کے ایک سڑک پر آنکلا۔ اور اپنی رفتار آہستہ کر دی۔ لیکن یہ بات اب بھی اُسے معلوم نہ تھی کہ وہ کس علاقے میں ہے اور اُسے پناہ کے لئے کس طرف جانا چاہیئے۔

قیاس سے جیکوئس کے گرنے کی سمت کا تعین کر کے وُہ دور تک چلا گیا۔ وہ کافی تھک چکا تھا۔ اگر اُسے یہ خطرہ نہ ہوتا کہ جہاز کے پروں پر سواستیکا کا نشان دیکھتے ہی جرمن اس کی تلاش شروع کر دینگے تو وہ یقیناً کسی درخت کی آڑ میں کچھ سستا لیتا لیکن گرفتاری اور جان جانے کے خوف سے وہ آگے ہی بڑھتا چلا گیا۔ ایک موہوم سی اُمید کے سہارے کہ شاید جیکوئس زمین پر اُترنے کے بعد اسی جگہ ٹھہرا رہے اور اُس کا انتظار کرے اور پھر مارٹن اس کے ساتھ اس کے دوستوں کے درمیان کہیں جا کر چھُپ جائے۔

مارٹن کو چلتے ہُوئے دس منٹ سے زیادہ ہو چکے تھے، اور جیکوئس یا اس کے کسی دوست کو پانے کی امید دم بدم مایوسی میں بدلتی جا رہی تھی۔ کہ اچانک کچھ فاصلے پر ایک درخت کے تنے سے کوئی سفید سا دھبا لپٹا ہُوا نظر آیا۔ اس نے قریب جا کر دیکھا۔ یہ پیراشوٹ تھی ابھی وہ اپنے آئندہ اقدام کے بارے میں کوئی فیصلہ بھی نہ کر سکا تھا کہ اچانک اُس نے اپنی جانب حرکت سی محسوس کی۔ گرفتاری کے خوف سے اُس کا دل دھڑکنے لگا۔ مگر نظر جما کر دیکھنے پر معلوم ہُوا کہ کوئی شخص زمین پر اوندھے منہ لیٹا ہوا ہے۔ مارٹن نے اطمینان کا سانس لیا یہ زخمی جیکوئس تھا۔ مارٹن اس پر جُھک گیا۔

جیکوئس بُری طرح زخمی ہو چکا تھا مگر ابھی تک ہوش میں تھا۔ اس کے دونوں پیر ٹوٹ گئے تھے۔ پیراشوٹ کے ساتھ درختوں سے ٹکرانے اور کھیتوں میں گھسٹنے سے تمام کپڑے تار تار

ہو چکے تھے اور جسم بے شمار چھوٹی بڑی خراشوں سے بھرا ہوا تھا جن سے خون رس رہا تھا۔ جیکوئس نے مارٹن کو فوراً پہچان لیا۔

"چھتری بہت دیر سے کھلی۔" اس نے ایک کراہ کے ساتھ بتایا۔

"مجھے اس حادثے پر بہت افسوس ہے جیکوئس۔" مارٹن نے جواب دیا "مگر تم آرام سے لیٹے رہو۔ بولنے یا ہلنے کی کوشش مت کرو۔ میں تمہیں اس طرح نہیں مرنے دوں گا۔ یہاں قرب و جوار میں تمہارے کچھ دوست بھی ضرور ہوں گے۔ میں ان کی مدد لے کر ابھی واپس آتا ہوں۔"

"کوئی فائدہ نہیں موسیو۔" جیکوئس نے نفی میں سر ہلایا "میرا وقت آچکا ہے۔"

"بیکار باتیں نہ کرو۔" مارٹن نے اُسے اطمینان دلانے کی کوشش کی "تھوڑی ہی دیر بعد تمہارے زخموں کی مرہم پٹی ہو جائے گی اور تم آرام دہ بستر پر اپنے دوستوں کے درمیان لیٹے ہو گے" مارٹن کھڑا ہو گیا۔ ان حالات میں اس کے سامنے ایک اور راہ تھی۔ وہ یہ کہ اگر جلد ہی جیکوئس کا کوئی دوست نہ مل سکے تو وہ اپنے آپ کو فوج کے حوالے کر دے اور پھر ان کے جذبۂ رحم سے اپیل کرے کہ وہ جیکوئس کے خاطر خواہ علاج کی طرف توجہ دیں لیکن اس فیصلے پر عمل کرنے میں سب سے بڑی رکاوٹ وہ مشن تھا جس کے لئے جیکوئس کو یہاں بھیجا گیا تھا۔ خواہ وہ کتنا ہی بہترین بہانہ کیوں نہ بنائے یہ بات یقینی تھی کہ جرمن اُس کی اور اُس سے زیادہ جیکوئس کی حقیقت اور یہاں آنے کے مقصد سے ضرور واقف ہو جائیں گے اور اُس کے بعد خواہ وہ صحت یاب ہی کیوں نہ ہو جائے۔ اس کی تقدیر مشین گن کی گولی کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتی۔

مارٹن ابھی "کیا کرے اور کیا نہ کرے" کی الجھن میں ہی پھنسا ہوا تھا کہ اس نے جیکوئس کو بُری طرح کانپتے محسوس کیا۔ وہ ایک مرتبہ پھر اس پر جھک گیا۔ جیکوئس کچھ کہنے کی کوشش کر رہا تھا مگر اُس کے منہ سے کوئی آواز نہیں نکل رہی تھی۔ اس کا ایک ہاتھ اپنے کوٹ کو مضبوطی سے پکڑے ہوئے بار بار ہل رہا تھا۔ یہ سمجھتے ہوئے کہ جیکوئس اس کی توجہ اپنے کوٹ کی جانب مبذول کرانا چاہتا ہے۔ مارٹن نے اس کے کوٹ کی جیبیں ٹٹولیں اور اندرونی جیب میں رکھا

قائدِ اعظمؒ کو تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد ایک بار کیریکٹر سرٹیفکیٹ کی ضرورت پیش آئی۔ یہ سرٹیفکیٹ چیف جسٹس کا ہونا چاہیئے تھا۔ قائدِ اعظم اس سے واقف نہ تھے اور اپنے اس کام کے لیے کسی کی سفارش بھی پسند نہ کرتے تھے۔ قائدِ اعظم نفاست پسند تو تھے ہی۔ ایک دن چھپا ہوا کیریکٹر سرٹیفکیٹ جیب میں رکھ کر تنہا چیف جسٹس کے پاس پہنچ گئے اور اس سے اچانک سوال کر دیا۔

"جناب جسٹس! میں آپ کو کس قسم کا انسان نظر آتا ہوں!"

جسٹس نے اُوپر سے نیچے تک قائدِ اعظمؒ کا جائزہ لیا۔ صاف ستھرا لباس، نفیس اتنا کہ کہیں شکن کا نام تک نہ تھا۔ وضع قطع سے چست اور مستعد بشرے سے شرافت اور صداقت نمایاں تھی۔ جسٹس اس بے باک نوجوان سے بہت متاثر ہوا۔ جواب دیا۔

"انتہائی شریف انسان۔"

قائدِ اعظمؒ نے جیب سے کیریکٹر سرٹیفکیٹ نکال کر جسٹس کی طرف بڑھا دیا اور بلا جھجک عرض کیا۔ "جنابِ والا! جو کچھ آپ اپنی زبان سے فرما رہے ہیں۔ اس پر دستخط کر کے اپنے قلم سے بھی اس کی تصدیق فرما دیں۔"

جسٹس بے باک نوجوان کی ذہانت کے آگے بے بس ہو گیا اور خاموشی سے دستخط کر دیے۔ جسٹس انگریز تھا۔ اس نے اُسی دن یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ اس نوجوان میں ساحرانہ ذہانت اور کشش پائی جاتی ہے اور اس سے غیر معمولی کارنامے انجام پائیں گے۔

ہوا پیکٹ نکال لیا۔ جیکوئس کے چہرے کے تاثرات نے اسے بتایا کہ اس کا اندازہ درست تھا۔ وہ یہی چاہتا تھا۔

"کیا تم یہ چاہتے ہو کہ میں انہیں ضائع کر دوں؟" مارٹن نے اس سے پوچھا۔

جواب میں جیکوئس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"اچھی بات ہے۔ لیکن ......؟"

الفاظ مارٹن کے حلق میں پھنس گئے۔ اس نے دیکھا کہ جیکوئس کے جسم کو ایک جھٹکا سا لگا اور اس کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔ موت نے اس کے تمام دُکھ درد کا خاتمہ کر دیا تھا۔ لیکن جیکوئس کی افسوس ناک موت پر دلگرفتہ ہونے کے باوجود

مارٹن کچھ اطمینان سا محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکا۔ مگر یہ اطمینان صرف ایک ثانیے کا تھا۔ جب تک جیکوئس زندہ تھا۔ مارٹن اس کی حالت اور مدد کی فوری ضرورت کے سامنے اپنی الجھنوں کو کچھ دیر کے لئے بھول گیا تھا۔ لیکن اب اُسے احساس ہوا کہ جیکوئس کی زندگی کے ساتھ ہی خود اس کے بچنے کی موہوم امید بھی جاتی رہی ہے۔ مارٹن نے جیکوئس اور اس کے دوستوں کی امداد پر دل ہی دل میں اتنا بھروسا کر لیا تھا کہ اب یہ مایوسی اس کی قوتِ برداشت سے باہر محسوس ہو رہی تھی۔ اس سے تو یہی بہتر تھا کہ وہ اپنے طیارے کے پاس ہی ٹھہرا رہتا۔ بلاشبہ جیکوئس کے دوست اسے پناہ دینے پر آمادہ ہو سکتے ہیں۔ لیکن اب وُہ انہیں کہاں اور کیسے تلاش کرے گا۔ اپنی برٹش یونیفارم میں اُسے نقل و حرکت کی اتنی ہی آزادی حاصل تھی جتنی بلیوں سے بھرے ہُوئے کسی کمرے میں ایک چوہے کو ہو سکتی تھی۔

اور پھر اچانک ہی مارٹن کو اپنی پریشانی کا ایک انوکھا حل سوجھ گیا۔ کیوں نہ وہ جیکوئس کی جگہ لے لے۔ وہ فرانسیسی زبان اتنی آسانی سے بول اور سمجھ سکتا تھا کہ کسی کو اس کے بلجین ہونے پر شک نہ ہو گا۔ خاص طور پر اس صورت میں کہ وُہ جیکوئس کے کپڑے بھی پہن لے اور اس کے شناختی کاغذات بھی اپنے قبضے میں کر لے۔ اس صورت میں قوی امکان تھا کہ جرمن سپاہی اسے بلجیم کا کوئی باشندہ خیال کریں گے۔

اگرچہ اس خیال پر کام کرنا کوئی خوشگوار کام نہ تھا لیکن مارٹن کے پاس اپنی جان بچانے کا کوئی دوسرا راستہ بھی تو نہ تھا۔ وہ فوراً عمل پر تیار ہو گیا۔ جیکوئس کی لاش گھسیٹ کر درختوں کے ایک جھنڈ کے پیچھے لے گیا اور پھر اس کے کپڑے اتارنے لگا۔ کام خاصا دشوار اور سُست رفتار تھا۔ لیکن کم و بیش ایک گھنٹے کی محنت کے بعد مارٹن اپنی یونیفارم جیکوئس کو پہنانے اور اس کے کپڑے خود پہننے میں کامیاب ہو گیا۔ اتنا ہی نہیں اُس نے وردی میں ملبوس جیکوئس کی پشت سے پیراشوٹ بھی باندھ دی اور اس کی لاش کو اس انداز سے زمین پر ڈال دیا۔ جیسے وُہ جہاز سے اترتے ہُوئے ہلاک ہوا ہے۔ اس کے بعد جیکوئس کے کاغذات اپنی جیبوں میں ٹھونس لئے اور واپسی کے ارادے سے سیدھا ہو گیا۔

اب اس کا ارادہ اس گھر کو تلاش کرنے کا تھا جسے اُس نے جہاز کے زمین پر گرنے کے دوران دیکھا تھا۔ اس کے اندازے کے مطابق یہ مکان کھیتوں کے دوسری جانب سڑک سے مخالف سمت میں تھا۔ چنانچہ وہ اسی راستے سے واپس ہوا جس سے کچھ دیر پہلے گزرا تھا۔ ابھی وہ سڑک سے اُتر کر کھیتوں میں کچھ ہی دُور گیا تھا کہ اس نے کچّے راستہ پر سامنے سے کسی کو آتے دیکھا۔ مارٹن جلدی سے کٹی ہُوئی گھاس کے ایک ڈھیر کے پیچھے چھپ گیا۔

آنے والا جب قریب سے گزرا تو مارٹن نے پہچان لیا تھا یہ وہی لڑکی تھی جو اُسے جہاز کے پاس ملی تھی۔ اس نے موریانہ کو آہستہ سے آواز دی۔ اور آڑ سے نکل کر سامنے آ گیا۔ موریانہ نے اُسے پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھا۔

"کیا تم وہی انگلش آفیسر ہو؟" اس نے پوچھا

"ہاں"

"جیکوئس کہاں ہے؟" موریانہ بیتابی سے بول اُٹھی۔ "میں اُسے گھنٹوں سے تلاش کر رہی ہوں۔ جرمن فوج کے ایک گشتی دستے کے خوف سے مجھے چھپنا پڑ گیا تھا"

"مجھے افسوس ہے..... مگر..... وُہ ..... جیکوئس کو ایک حادثہ پیش آ گیا ہے" مارٹن کے لئے موریانہ کو اصل واقعے سے آگاہ کرنا دشوار ہو گیا تھا۔

"کیا..... کیا وہ مر گیا ہے؟" موریانہ نے اپنے ہونٹ دانتوں سے دبا لئے جو شدّتِ غم سے لرزنے لگے تھے۔

"ہاں" مارٹن نے افسردگی سے بتایا اور پھر مختصر الفاظ میں جیکوئس کے ملنے، اس کی موت اور لباس کی تبدیلی تک کے تمام حالات بتا دیئے۔ موریانہ نے کپڑوں کی تبدیلی کے خلاف شدید ناراضی کا اظہار کیا۔

"تم کو ایسی گری ہوئی حرکت کرنے کی ہمّت کیسے ہُوئی؟" وہ مشتعل ہو گئی "تم نے یہ کیوں نہیں سوچا کہ اگر جرمن اسے ایک انگریز آفیسر سمجھتے رہے تو جیکوئس اپنے اصلی نام اور قومیت کے ساتھ دفن کس طرح ہو سکے گا؟"

اور واقعی مارٹن کو بھولے سے بھی یہ خیال نہ آیا تھا۔

"مجھے افسوس ہے" اس نے شرمندگی کے ساتھ کہا "لیکن

تم خود دیکھ سکتی ہو کہ میرے پاس اپنی جان بچانے کا اس کے سوا ....."

"تمہارے افسوس سے مجھے کیا فائدہ پہنچے گا؟" موریانہ نے مارٹن کی بات کاٹ دی" جو غم مجھے اور جیکوئس کے والدین کو پہنچا ہے اس کی تلافی کسی طرح بھی ممکن نہیں۔"

مارٹن کے پاس موریانہ کی اس بات کا کوئی جواب نہ تھا۔ اس کا خیال تھا کہ مقامی باشندے جرمنوں کے خلاف اس کی مدد کرینگے لیکن لباس تبدیل کرنے کی حرکت سے موریانہ کی طرح اُن کے ناراض ہو جانے کا بھی خطرہ پیدا ہو گیا تھا اگر ایسا ہوا تو پھر اس اجنبی ملک میں اسے کہاں پناہ مل سکے گی۔

"میں نے دشمنوں سے بچنے کے لئے مجبوراً ایسا کیا ہے۔" مارٹن نے ملتجیانہ لہجے میں جواب دیا" مجھے تو یہ اُمید تھی کہ تم جرمن سپاہیوں سے بچانے میں میری مدد کرو گی۔"

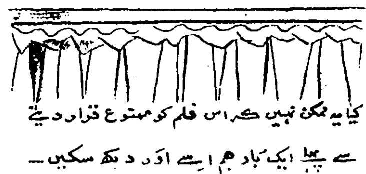
"نہیں" موریانہ نے زور زور سے نفرت سے سر ہلایا" میں تمہاری مدد نہیں کرونگی خواہ ...... یہ کیا ہے؟" اس نے سہم کر مارٹن کا بازو پکڑ لیا۔

مارٹن نے کان لگا کر سنا۔ فوجی بوٹوں کی بہت ہلکی آوازیں آ رہی تھیں۔ اور کسی ایک جانب سے نہیں چاروں طرف سے۔

"جرمن معلوم ہوتے ہیں۔" مارٹن نے بتایا

"تب پھر ہمیں فوراً بھاگ جانا چاہیئے۔" موریانہ نے اس کا بازو پکڑ کر گھسیٹا" اس طرف۔ جلدی۔"

اگر مارٹن اُسے روک نہ لیتا تو وہ درختوں کے جھنڈ سے نکل کر کھلے میدان کی طرف بھاگ کھڑی ہوتی۔ لیکن مارٹن دیکھ چکا تھا کہ اس طرف سے بڑھنے والے فوجیوں کی تعداد کچھ زیادہ ہی تھی اور وہ بڑے منظم طریقے سے آگے بڑھ رہے تھے۔ دفعتہً مارٹن کو اپنا دل رکتا ہُوا محسوس ہُوا۔ اور حلق میں جیسے کانٹے پڑنے لگے۔ وہ چاروں طرف سے گھیر لئے گئے تھے۔ اب گویا ہر اُمید اور ہر کوشش کا خاتمہ تھا۔ ممکن ہے جرمن فی الحال اس کی کہانی پر اعتبار کر لیں لیکن جب جیکوئس کی لاش دریافت ہو گی۔ تب کوئی بہانہ نہ چل سکے گا۔ پھر مزید یہ کہ اسکے پاس وہ خفیہ کاغذات بھی موجود تھے جو اس نے جیکوئس کی جیب سے نکالے تھے۔ اُس نے جلدی سے لفافہ نکال کر موریانہ کے ہاتھ میں دے دیا۔



کیا یہ ممکن نہیں کہ اس فلم کو ممنوع قرار دینے سے پہلے ایک بار ہم اسے اور دیکھ سکیں۔

"یہ کاغذات جرمنوں کے ہاتھ نہیں آنا چاہئیں۔" مارٹن نے سرگوشی میں کہا" یہ جیکوئس کے ہیں اور ان سے یہ ثابت ہو جائے گا کہ وہ فوجی جاسوس تھا۔"

"لیکن میں ان کا کیا کروں؟"

"جیسے ہی موقع ملے انہیں فوراً ضائع کر دینا۔" مارٹن نے کہا اور اسے گھاس کے ایک بڑے ڈھیر کی طرف دھکا دے دیا۔

"وہاں جا کر چھپ جاؤ۔" وہ بولا، میں کوشش کروں گا کہ جرمن تمہیں نہ پا سکیں۔"

مارٹن نے اپنے دونوں ہاتھ بلند کئے اور فوجیوں کی طرف چلنے لگا۔

"کامریڈ" اس نے بلند آواز میں جرمن سپاہیوں کو مخاطب کیا۔

اسے دیکھتے ہی جرمن آفیسر نے کرخت آواز میں اپنے جوانوں کو کوئی حکم دیا۔ دوسرے لمحے کئی مضبوط ہاتھ مارٹن کو اپنی گرفت میں لے چکے تھے۔ اسے دھکے دیتے ہوئے دستے کے کمانڈر کے سامنے لایا گیا۔ کمانڈر نے جو عہدے کے اعتبار سے کیپٹن تھا۔ ٹارچ کی روشنی

میں مارٹن کا جائزہ لیا۔ اس کی پیشانی پر بل پڑے ہوئے تھے۔ شاید اس لئے کہ اُسے اپنے آرام دہ بستر سے اٹھا کر اس ڈیوٹی پر بھیج دیا گیا تھا۔ طبیعت کا تکدر چہرے سے ظاہر تھا۔ یقیناً وہ اس وقت کسی جذبۂ رحم سے کام لینے کے موڈ میں نہیں معلوم ہوتا تھا۔

"تم کون ہو۔ اور کہاں سے آئے ہو؟" اس نے بگڑی ہوئی فرانسیسی زبان میں پوچھا۔

"میرا نام جیکوئس پولیر ہے موسیو"۔ مارٹن نے جواب دیا۔

"مجھے یہ سن کر کوئی خوشی نہیں ہوئی۔" کیپٹن نے تلخی سے کہا "تم مجھے کوئی جاسوس معلوم ہوتے ہو۔"

اس نے پلٹ کر اپنے ساتھیوں کو حکم دیا۔

"دو سارجنٹ! چار جوانوں کی نگرانی میں اس آدمی کو کمانڈنٹ کے پاس لے جاؤ۔ اس طرح شاید وہ بوڑھی بھیڑ کچھ دیر کے لئے ممیانا بند کر دے۔ باقی لوگ تلاش جاری رکھیں گے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہاں کوئی اور چھپا ہوا نہیں ہو گا۔"

مارٹن نے اپنی سانس روک لی۔ موریانہ اس سے بے حد ناراض معلوم ہوتی تھی۔ لیکن اس کے باوجود وہ نہیں چاہتا تھا کہ جرمن اسے پکڑ لیں۔ وہ ایک طرح اس بہادر لڑکی کو پسند کرنے لگا تھا۔ اس شخص نے جسے کیپٹن نے سارجنٹ کہہ کر مخاطب کیا تھا یونہی اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر نفی میں سر ہلانے لگا۔

"یہاں کوئی نہیں کیپٹن۔" اس نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ پھر آگے بڑھو۔"

تمام سپاہی اسی انداز میں آگے بڑھنے لگے۔ سارجنٹ اپنے ساتھ چار فوجیوں کی نگرانی میں مارٹن کو لے کر ویلڈ ہیگم جانے والی سڑک پر چل دیا۔ راستے میں مارٹن کے لئے اپنی موجودہ صورتحال پر غور کرنے کے لئے کافی وقت تھا۔ اسے یقین تھا کہ جرمن کمانڈر اس کے لباس یا شناختی کاغذات سے دھوکا نہیں کھا سکے گا۔ کافی سوچنے کے بعد آخر اس نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ سچائی سے کام لے گا۔ ممکن ہے آخر کار یہی اس کے حق میں بہتر ثابت ہو۔ اگر اس کی موت مقدر ہی ہو چکی ہے اور جس میں بظاہر کوئی شبہ بھی نظر نہیں آتا۔ تو وہ ایک بلجین جاسوس کے بجائے اپنے ملک کی فوجی وردی میں مرنا زیادہ پسند کرے گا۔ اس طرح اس خوبصورت لڑکی موریانہ کی شکایت بھی جاتی رہے گی اور وہ اپنے منگیتر کو اس کے اصلی نام کے ساتھ دفن کر سکے گی۔

لیکن ہیڈکوارٹر پہنچنے کے بعد مارٹن کو فوراً ہی کمانڈر کے سامنے پیش نہیں کیا گیا۔ کمانڈر آرام کر رہا تھا۔ اور چونکہ کسی میں بھی اُسے بیدار کرنے کی ہمت نہ تھی۔ اس لئے مارٹن کو ایک تنگ و تاریک کوٹھری میں بند کر دیا گیا۔

مارٹن کو کمانڈر کے سامنے پیش کرنے کی مسرت دوسرے دن صبح کے سات بجے سے پہلے اُسے حاصل نہ ہو سکی۔ ایک مختصر دستے کے درمیان مارچ کرتے ہوئے وہ ویلڈ ہیگم کی کئی سڑکوں سے گزر کر شہر کے ایک کلومیٹر کے فاصلے پر ایک کھلے میدان میں لایا گیا۔ مارٹن کی ذہنی و جسمانی حالت اس وقت کچھ بہتر نہ تھی۔ کوٹھری کے ٹھنڈے فرش پر وہ تمام رات سردی سے سکڑتے ہوئے کروٹیں بدلتا رہا تھا پھر کل رات ہی سے اُسے کچھ کھانے پینے کو بھی نہیں ملا تھا۔ وہ اس وقت اپنے آپ کو بے حد کمزور اور تنہا محسوس کر رہا تھا۔

کھلے میدان میں اس کے چاروں طرف مختلف نوعیت کی سرگرمیاں جاری تھیں۔ جرمن فوج کے مختلف دستے اور کمپنیاں جگہ جگہ پریڈ کر رہی تھیں۔ گولہ بارود، ہلکی بھاری توپیں اور دوسرا اسلحہ اِدھر سے اُدھر لے جایا جا رہا تھا۔ ایک جانب خیموں کی قطار کافی دُور تک چلی گئی تھی۔ اور جہاں خیمے ختم ہوتے تھے وہاں ایک عارضی ہوائی اڈا نظر آ رہا تھا۔

ہوائی اڈے پر بہت سے فوکر ٹو سیٹر طیارے کھڑے تھے۔ ان میں کچھ کے انجن چالو تھے اور کچھ کو اسٹارٹ کرنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ مارٹن نے اندازہ لگایا کہ اس وقت جو کچھ وہ دیکھ رہا ہے۔ اس کے مطابق یہاں جرمن افواج کے کم سے کم دو اسکواڈرن ضرور موجود ہیں۔ اس نے سوچا کہ کاش کسی طرح ان میں سے کسی ایک طیارے پر قبضہ کرنے کا موقع مل جائے تو پھر وہ دشمن کے ہاتھ سے ضرور بچ نکلے گا اور اگر بچ کر نہ نکل سکا اور اس کے طیارے کو مار کر گرا لیا گیا تب بھی وہ موت اس بے بسی و بیچارگی کی موت سے کہیں زیادہ بہتر ہو گی۔

مگر ایک ٹھنڈی سانس لے کر اُس نے اس خیال کو ذہن سے نکال دیا۔ کیونکہ اتنے مسلح فوجیوں کے درمیان کسی طیارے تک

پہنچنے کا کوئی امکان ہی نہ تھا۔ قدم اٹھانے سے پہلے ہی بے شمار گولیاں اس کے جسم کو چھلنی کر سکتی ہیں وہ مارچ کرتے ہوئے فوجی دستے کے ساتھ خیموں کے درمیان سے گزر کر ایک عمارت کے سامنے پہنچ چکا تھا۔ یہ غالباً جرمن افواج کے کمانڈر کی قیام گاہ تھی۔

مارٹن نے دیکھا کہ جرمن کمانڈر عمارت کی سیڑھیوں پر کھڑا ہوا ہے۔ اس نے ہاتھ میں پکڑا ہوا چشمہ آنکھوں پر لگاتے ہوئے بڑی حقارت آمیز نظروں سے مارٹن کی طرف دیکھا۔

"لیفٹیننٹ ویلان۔ اس جانور کو میرے پاس لانے کی کیا ضرورت تھی؟"

ویلان نے ایڑیاں بجاتے ہوئے کمانڈر کو سلام کیا۔ وہ جانتا تھا کہ جنرل وان ہوفمین ڈسپلن کے معاملے میں بہت سخت ہے۔

"میں نے آپ کے حکم کی تعمیل کی ہے جنرل" اس نے کہا "یہ وہ آدمی ہے جسے کل رات دشمن کے ایجنٹ ہونے کے شبے میں گرفتار کیا گیا تھا۔"

جنرل وان ہوفمین نے غصے سے منہ بنایا۔ اسے پہلے ہی ایک برٹش طیارے کی تباہی کی اطلاع مل چکی تھی۔ ایسا طیارہ جس کے پروں کے نیچے سواستیکا کا نشان بنا ہوا تھا۔ اس کا پائلٹ بھ اپنی پیراشوٹ کے ساتھ مردہ پایا گیا تھا۔ اور اسے اس بات پر بڑا غصہ تھا کہ دشمن نے اس علاقے میں جو اس کے زیر کمان تھا۔ اپنا ایک ایجنٹ آتارنے کی دیدہ دلیری کی تھی۔

"اس کو لے جا کر گولی مار دو۔" جنرل نے جرمن زبان میں حکم دیا۔ اور گھوم کر عمارت کے اندر داخل ہو گیا۔

مارٹن جرمن زبان نہیں جانتا تھا۔ اس لئے اس پر اس کا کوئی جذباتی ردعمل ظاہر نہیں ہوا۔ وہ تو صرف یہ دیکھ رہا تھا کہ فوجی دستہ اسے ساتھ لئے ہوئے واپس چلا۔ مگر ویلڈ نگھم کی طرف جانے کے بجائے اب اُس کا رُخ کچھ فاصلے پر بنی ہوئی ایک پتھر دیوار کی طرف تھا۔ لیکن جب یہ دستہ دیوار کے پاس رک گیا اور فوجیوں نے اس کے ہاتھ پیچھے کی جانب باندھ کر اسے دیوار کی طرف دھکا دیا۔ تب مارٹن بخوبی سمجھ گیا کہ اس کی آخری منزل آ پہنچی ہے۔

اس انکشاف کے چند لمحوں بعد تک حیرت اور خوف نے مارٹن سے بولنے کی طاقت سلب کر لی۔ اُسے یہ گمان تک نہ تھا کہ صفائی کا موقع دیئے بغیر اسے یوں مارنے کا حکم دے دیا جائے گا



اس کا خیال تھا کہ کمانڈر کم سے کم اس کے شناختی کاغذات تو ضرور ہی طلب کرے گا۔ لیکن یہ طرزِ عمل تو کسی طرح جائز اور منصفانہ نہیں کہا جاسکتا۔ موت ہی سہی لیکن اسے ایک برٹش آفیسر کی حیثیت سے مرنے کا اعزاز تو ضرور ہی ملنا چاہیئے۔

مارٹن نے گردن گھما کر اس نوجوان لیفٹیننٹ کی طرف دیکھا جو احکام جاری کر رہا تھا۔

"مجھے تم سے ایک بہت ہی اہم بات کہنی ہے۔" وہ فرانسیسی زبان میں چلّا کر بولا "میں ....."

"خاموش" ایک دوسرا آفیسر گرجا۔

"میں ایک برٹش آفیسر ہوں۔" اس مرتبہ مارٹن نے انگریزی میں کہا "اور میں مطالبہ کرتا ہوں کہ ....."

آفیسر نے آگے بڑھ کر مارٹن کے منہ پر زور سے گھونسا مارا اور جب اُس کی اس حرکت پر لیفٹیننٹ نے کوئی باز پرس نہیں کی تو مارٹن کو یقین ہو گیا کہ اب مزید کوشش کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اُسے دیوار کے ساتھ پیٹھ ملا کر کھڑا کر دیا گیا۔

"مجھے ہمت سے مردانہ وار موت قبول کر لینی چاہیئے۔"

مارٹن بار بار زیرِ لب اپنے آپ سے کہہ رہا تھا۔

اور یہ الفاظ بڑبڑاتے ہوئے وہ بالکل خواب کی سی حالت میں اپنے سامنے چند قدم کے فاصلے پر فوج کے چھ جوانوں کی نقل و حرکت دیکھ رہا تھا۔ وہ ایک قطار کی صورت میں اس کے سامنے کھڑے تھے۔ ان کی رائفلیں مارٹن کی جانب تنی ہوئی تھیں۔ ہر ایک کے چہرے پر مختلف قسم کے تاثرات تھے۔

"تیار" آفیسر نے کڑک کر کہا۔

مگر اس سے پہلے کہ اس کی زبان سے کوئی دوسرا لفظ ادا ہو یا وہ کوئی اشارہ کرے میدان میں بھاگتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دی۔ مارٹن نے موریانہ کو تیزی سے دوڑ کر اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا۔

"دو تم میں سے ایک جوان اس لڑکی کو روکے اور پکڑ کر یہاں سے لے جائے۔" آفیسر نے حکم دیا۔

"ٹھہرو" موریانہ چیخی "یہ وہ آدمی نہیں ہے جو تم سمجھ رہے ہو۔"

اپنی طرف بڑھنے والے فوجی کی گرفت سے بچتے ہوئے موریانہ بھاگ کر لیفٹیننٹ کے پاس پہنچ چکی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک کھلا ہوا کاغذ تھا جسے اُس نے لیفٹیننٹ کی آنکھوں کے سامنے کر دیا۔

"لو دیکھ لو" وہ بولی "یہ کاغذ تمہیں بتلائے گا کہ میں سچ کہہ رہی ہوں۔"

مارٹن نے نوجوان لیفٹیننٹ کی آنکھوں کو حیرت سے پھیلتے دیکھا۔ اُس نے کاغذ موریانہ کے ہاتھ سے جھپٹ لیا اور دوبارہ پوری توجہ اور دلچسپی سے پڑھنے لگا۔ بے اختیار اس کی زبان سے کچھ جرمن الفاظ نکلے۔

"یہ کاغذ تمہیں کہاں سے ملا؟" اس نے موریانہ سے پوچھا۔

موریانہ نے ہاتھ اٹھا کر مارٹن کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ کاغذ اس نے کل رات مجھے دیا تھا۔" اسی کا نام جیکوئس پولییر ہے۔"

"ٹھیک کہتی ہو۔" لیفٹیننٹ نے اثبات میں سر ہلایا "اگر ہم اسے گولی مار دیتے تو جنرل ہم میں سے ہر ایک کی کھال کھنچوا دیتا۔" اُس نے اپنے ماتحت آفیسر کو کوئی حکم دیا اور وہی آفیسر جس نے مارٹن کے منہ پر گھونسا مارا تھا۔ جلدی سے آگے بڑھ کر مارٹن کے ہاتھ کھولنے لگا۔ اس کے بعد مارٹن کو ایک مرتبہ پھر کمانڈر کی قیام گاہ کے سامنے لایا گیا۔ لیکن اس مرتبہ وہ تنہا نہیں تھا بلکہ موریانہ بھی اس کے ساتھ چل رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ہوئے بالکل اس طرح جس طرح کوئی لڑکی اپنے منگیتر یا محبوب کے ساتھ چل سکتی ہے۔

"ہمت سے کام لو۔" اس نے مارٹن کے کان میں سرگوشی کی "جو کچھ میں کہوں تم اس کی تائید کرتے جانا اور خیال رکھنا کہ کوئی غلط لفظ زبان سے نہ نکلے۔"

جنرل وان ہوفمین کو دوسری بار۔ اور غالباً ناشتہ چھوڑ کر۔ اپنے گھر سے نکلنا پڑا تھا۔ وہ بے حد غصے میں تھا۔

"لیفٹیننٹ" وہ گرجا "آخر اس کا کیا مطلب ہے جب میں تمہیں کوئی حکم دیتا ہوں تو میرا مقصد اس کی تعمیل ہوتا ہے۔

ملک شاہ سلجوقی اور قیصر روم کی فوجیں برسرِ پیکار تھیں۔ اسی دوران ایک دن ملک شاہ اپنے چند خادموں کے ہمراہ شکار کے لئے لشکرگاہ سے باہر گیا اور قیصر کے سپاہیوں کے ہاتھوں گرفتار ہوگیا۔ رومی سپاہی اسے پہچان نہ سکے اور اسے اپنی لشکرگاہ میں لئے چلے گئے۔ وزیرِ سلطنت نظام الملک طوسی کو پتہ چلا تو اس نے شاہی سراپردے کے باہر کھڑے ہو کر اعلان کیا کہ بادشاہ سلامت شکار سے واپس آگئے ہیں۔

دوسرے دن صبح طوسی خود قیصر روم کی خدمت میں پہنچ گیا اور صلح کی خواہش ظاہر کی۔ قیصر نے اسے قبول کرلیا۔ دورانِ گفتگو قیصر نے تازہ اسیروں کا تذکرہ کیا۔ نظام الملک نے کہا: "ہمارے لشکرگاہ میں تو ایسی کوئی اطلاع موصول نہیں ہوئی۔"

ان اسیروں کی حیثیت معمولی قرار دے کر، انھیں خواجہ نظام الملک کے حوالے کر دیا گیا۔ خواجہ نے قیصر اور اس کے درباریوں کے سامنے انھیں سخت سرزنش کی لیکن جب یہ قافلہ قیصر کی لشکرگاہ سے کچھ دور نکل گیا تو خواجہ اپنے گھوڑے سے نیچے اترا، آداب بجالایا اور اپنی درشت کلامی کی معافی مانگی۔ ملک شاہ اپنے وزیر کی دانائی پر بے حد خوش ہوا۔

لیکن کچھ دنوں بعد جنگ کا دوبارہ آغاز ہوا۔ دونوں فوجیں ایک دوسرے کے خلاف برسرِ پیکار ہوگئیں۔ اس بار قیصر خود میدانِ کارزار میں گرفتار ہوا اور ملک شاہ کی خدمت میں لے جایا گیا۔ قیصر نے ملک شاہ کو پہچان لیا اور کہا: "اگر تو بادشاہ ہے تو مجھے معاف کردے، اگر تو سوداگر ہے تو مجھے فروخت کردے لیکن اگر تو قصاب ہے تو ذبح کردے۔"

ملک شاہ نے فراخ دلی کا مظاہرہ کیا۔ مسکراتے ہوئے جواب دیا: "میں بادشاہ ہوں۔" اور پھر قیصر کو شانِ شاہانہ کے ساتھ اسکے پایۂ تخت روانہ کردیا گیا۔

تم اس آدمی کو دوبارہ میرے پاس کیوں لائے ہو؟"

لیفٹیننٹ نے ایڑیاں بجائیں۔ سیلوٹ کیا۔ اور آگے بڑھ کر بڑے ادب سے وہ کاغذ جنرل کے ہاتھ میں دے دیا جو اسے مورین نے دیا تھا۔

"یہ لڑکی اسے لے کر آئی تھی" اس نے بتایا "یہ اس کی منگیتر ہے۔"

جنرل نے کاغذ لے کر پڑھا۔ دفعتہً اس کے چہرے کے تاثرات تبدیل ہوگئے۔ اس نے آہستہ سے سیٹی بجائی۔

"گویا۔ اگر تم نے اس آدمی جیکوئس کو گولی ماردی ہوتی لیفٹیننٹ" اس نے نرم لہجے میں کہا "تو یہ میری بے داغ فوجی زندگی پر سب سے بدنما دھبا ہوتا۔ شاباش۔ تم نے اسے میرے پاس واپس لاکر بہت اچھا کیا۔"

جنرل نے ایک مرتبہ پھر اس کاغذ کی طرف دیکھا۔

"جانتے ہو" اس نے کچھ آواز دبا کر پرجوش لہجے میں لیفٹیننٹ سے کہا "یہ شخص کتنی اہم اطلاع لے کر آیا ہے برٹش فوجوں نے محاذ کو مزید پندرہ میل تک پھیلا دیا ہے۔ محض ہمیں فریب دینے کے لئے۔ ورنہ ان کے پاس ہر مورچے کے پیچھے مقابلہ کرنے والے فوجیوں کی تعداد انتہائی ناکافی ہے۔ ہم کل صبح اپنا حملہ شروع کردیں گے۔ اور مجھے پورا یقین ہے کہ دو دن کے اندر ایمینس تک پہنچ جائیں گے۔"

اس نے اپنے قریب کھڑے ہوئے ایک دوسرے آفیسر کو حکم دیا۔

"وائرلیس پر کمانڈر انچیف کو اطلاع دو کہ وُہ فوراً محاذ پر پہنچیں۔ ہم اس سنہری موقع کو ضائع نہیں کرسکتے۔"

اس کے بعد جنرل نے مارٹن کو اپنے قریب آنے کا اشارہ کیا۔

"موسیو جیکوئس" وہ بڑے مشفقانہ لہجے میں مخاطب ہوا "میں تم سے اس افسوسناک غلط فہمی کے لئے معذرت خواہ ہوں میرے ماتحت آفیسر تمہاری اصل شخصیت کے بارے میں مجھے مطلع کرنے سے قاصر رہے۔ انہیں اس لاپروائی کی سزا ضرور دی جائے گی۔ کیا تم نے ابھی تک ناشتہ نہیں کیا؟ میرا خیال ہے کہ نہیں کیا؟"

جنرل ہوفمین شاید موسیو جیکوئس کو اپنے ساتھ ناشتہ کرنے کی دعوت دینے والا تھا لیکن اس کی خستہ حالت۔ پھٹے ہوئے خاک آلود کپڑے اور بڑھے ہوئے خط کو دیکھ کر ارادہ بدل دیا۔

"میرا خیال ہے موسیو کہ تم گاؤں جا کر اطمینان سے ناشتہ کرلو

پھر ایک گھنٹے کے بعد یہاں واپس آجانا۔ ٹھیک ہے۔ یوں بھی میں سمجھتا ہوں کہ تمہیں اپنی خوبصورت منگیتر سے بہت سی باتیں کرنا ہوں گی"
وہ لیفٹیننٹ کی طرف گھوما۔
"لیفٹیننٹ۔ موسیو جیکوئس کو اُن کی ضرورت کی ہر چیز مل جانا چاہیئے۔"



اس کے بعد جنرل نے سر ہلا کر انہیں جانے کا اشارہ کیا۔
حیران و ششدر مارٹن موریانہ کے ساتھ سڑک کی جانب چل دیا۔ اس کی سمجھ میں ابھی تک نہیں آیا تھا کہ موریانہ نے کیا کرامت دکھائی ہے جس نے اُسے ایک پل میں رائفل کی گولی کے بجائے آزادی کی نعمت بخش دی تھی۔ ویسے ابھی وہ یہ بات جاننا بھی نہ چاہتا تھا یہ سب کچھ بعد میں بھی پوچھا جا سکتا ہے۔ فی الوقت تو اس کا ذہن فوکر ٹو سیٹر طیاروں کی جانب تھا۔ جنرل کے حکم کے تحت لیفٹیننٹ بھی اُن کے ساتھ ہی چل رہا تھا۔
"اس سے کہو کہ وہ آگے جائے ہم اُسے گاؤں میں مل جائیں گے۔" مارٹن نے موریانہ سے کہا۔
موریانہ نے لیفٹیننٹ سے کہہ دیا۔ اور وہ کسی شک و شبہے کے بغیر سر ہلاتے ہوئے تیز قدموں سے ویلڈ بیگھم کی جانب چل دیا۔ مارٹن اُسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ پھر جیسے ہی وہ نظروں سے اوجھل ہوا مارٹن سڑک چھوڑ کر رن وے کی جانب گھوم گیا۔
"تم کہاں جا رہے ہو؟" موریانہ نے پوچھا۔
"واپس فرانس۔" مارٹن نے جواب دیا۔ "کیا تم میرے ساتھ آؤ گی؟"
"ہاں موسیو۔" موریانہ نے اثبات میں سر کو جنبش دی۔
"تمہارے چلے جانے کے بعد جرمن مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"
گھاس کا قطعہ پار کر کے جب وہ رن وے کی جانب بڑھے تو کسی نے اُن کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ مارٹن سب سے آگے کھڑے ہوئے طیارے کے پاس رک گیا۔ اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے اُس نے پھرتی سے موریانہ کو سہارا دے کر پچھلی نشست پر بٹھا دیا۔ اور پھر خود بھی اُچھل کر پائلٹ کی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے جہاز کا کنٹرول سنبھال لیا۔

فوراً ہی کسی نے چیخ کر دوسرے فوجیوں کو مارٹن کی حرکت سے خبردار کیا۔ لیکن وُہ بہت دُور تھے۔ مارٹن نے تھروٹل کو پورا کھول دیا۔ طیارہ حرکت میں آگیا اور رن وے پر دوڑنے لگا۔ بھاگتے ہوئے سپاہی ابھی دُور ہی تھے کہ مارٹن نے بڑی صفائی سے جہاز کو فضا میں بلند کر دیا۔ اُس کا رُخ مشرق کی جانب تھا۔

نیچے جھانک کر دیکھتے ہوئے مارٹن کو جرمنوں کی مضطربانہ کوششوں پر ہنسی آگئی۔ اب وُہ کبھی ان کے ہاتھ نہیں آسکتا ایک لڑکی کی بروقت دلیرانہ امداد نے اس کی زندگی بچالی تھی۔

پھر جب وہ بحفاظت برطانوی مورچوں کے پیچھے اتر گیا تو موریانہ نے اسے سب کچھ بتا دیا۔ وہ کاغذات جو جیکوئس کی جیب سے نکلے تھے اور جنہیں مارٹن نے ضائع کرنے کے لئے موریانہ کے حوالے کر دیا تھا۔ انہیں پڑھنے پر معلوم ہُوا کہ جیکوئس حقیقت میں جرمنوں کا ایجنٹ تھا۔

"وُہ غدار تھا۔ اپنے ملک اور قوم کا دشمن تھا" موریانہ نے بڑے جذباتی لہجے میں کہا "اور یہ سوچ کر مجھے اپنے آپ سے نفرت ہونے لگتی ہے کہ کبھی میں نے ایک غدار وطن سے محبت کی تھی۔ اور پھر میں تم سے بھی شرمندہ ہوں موسیو کہ میں تم پر صرف اس لئے برس پڑی تھی کہ تم نے اس کے کپڑے پہن لئے تھے۔"

"میں نے صرف اس کے کپڑے ہی نہیں پہنے تھے بلکہ اس کی جگہ بھی لے لی ہے" مارٹن نے معنی خیز لہجے میں جواب دیا۔

لیکن موریانہ ایسی بن گئی جیسے اُس نے مارٹن کی بات سنی ہی نہ ہو۔

"تم اپنے کرنل سے کہہ سکتے ہو کہ جرمن فوجیں کل صبح اپنا حملہ شروع کریں گی" وہ دوسری طرف دیکھتے ہوئے بولی "اور یہ یہ بات تم نے کسی معمولی افسر سے نہیں خود جنرل وان ہوفمین کے منہ سے سنی ہے۔"

مارٹن نے انکار میں گردن ہلادی۔

"یہ بتانے کا فرض میں تمہارے اوپر چھوڑتا ہوں" اس نے چہکتے ہوئے لہجے میں کہا "مجھے جو بات کرنل سے کرنا ہے وہ کچھ اور ہی ہے۔"

"وہ کیا ہے؟" موریانہ نے نظریں چُراتے ہوئے پوچھا۔

"یہ کہ مجھے فوری طور پر کم از کم ایک ہفتے کی خصوصی رخصت دی جائے۔ کیونکہ میں بلجیئم کی سب سے زیادہ باہمت اور حسین ترین لڑکی سے شادی کرنے جا رہا ہوں۔"

رام دیال سے میری دوستی زیادہ پرانی نہ تھی لیکن وہ اور اس کی ماں پردیس میں میرا بہت خیال رکھتے تھے۔ البتہ رام دیال کی ماں مجھے کچھ عجیب اور ناقابلِ فہم معلوم ہوتی تھی۔ اس کا آئے دن برت رکھنا۔ آدھی آدھی رات کو مرگھٹ جانا اور پجاری پنڈتوں سے گھنٹوں بیٹھ کر سرگوشیاں کرنا اسکے یہ تمام مشاغل میری سمجھ میں نہیں آتے تھے! ایک روز رام دیال کی ماں نے اپنی شفیق آواز میں کہا کہ اگر میں اس کے بتائے ہوئے منتر پڑھ ڈالوں تو میری

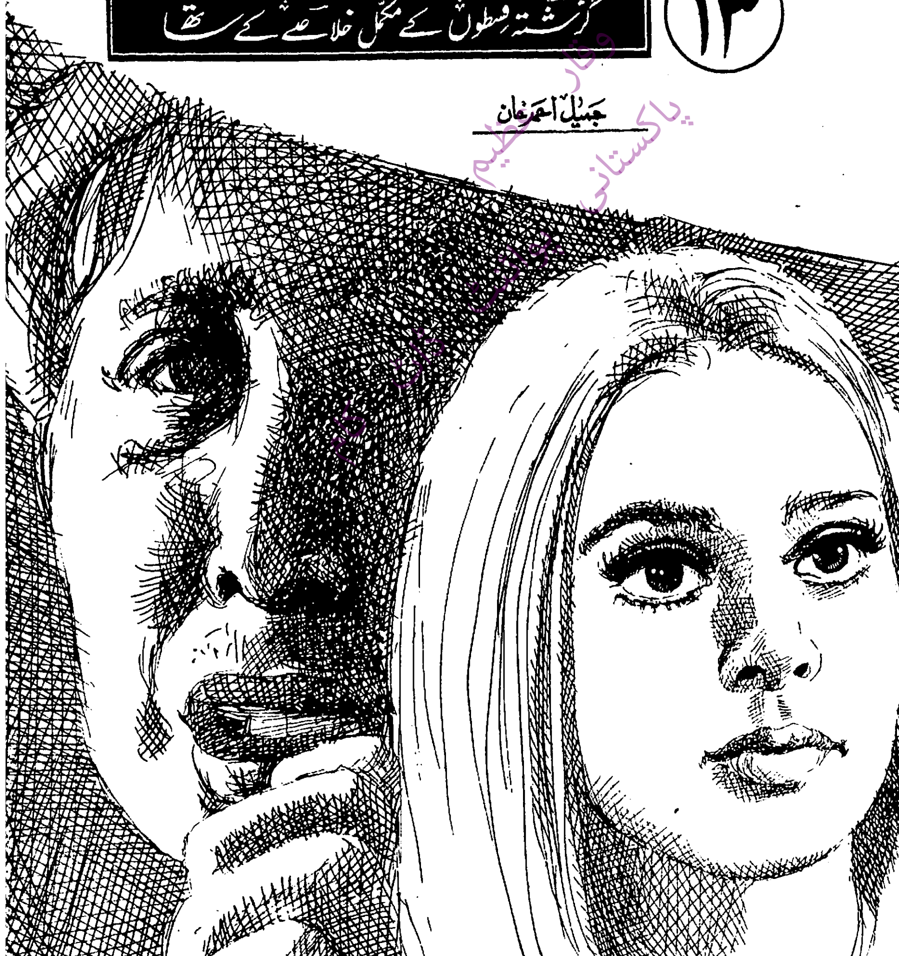
ممکن ہے ایسا واقعہ آپ نے پہلے نہ پڑھا ہو:

— ایک پُراسرار آپ بیتی —

۱۳

گزشتہ قسطوں کے مکمل خلاصے کے ساتھ

جمیل اعمر خان





دنیا بدل سکتی ہے۔ میں انکا کو اپنے قبضے میں کر کے تمام عمر عیش کر سکتا ہوں۔ مجھے ان لغویات سے کوئی دلچسپی نہ تھی اس لئے میں نے رام دیال کی ماں کی بات پر کان نہ دھرے۔ بات آئی گئی ہوگئی۔ کچھ عرصے بعد رام دیال کی ماں کا انتقال ہوگیا۔ رات کو میں اس کے کریا کرم میں شرکت کرنے مرگھٹ گیا میری واپسی رات گئے ہوئی، صبح جب میں دفتر جا رہا تھا تو اچانک مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی ہلکی پھلکی چیز میرے سر پر آن گری ہو۔ میں نے سر کو بار بار جھٹکا، انگلیوں سے بالوں میں کنگھی بھی کی لیکن بے سود، کوئی پُراسرار شے میرے سر سے چپکی ہوئی تھی۔ میں اپنے سر میں باریک باریک پنجوں کی چبھن محسوس کر رہا تھا۔ اس پُراسرار وجود نے، جسے میرے ذہن نے ایک خوبصورت اور نازک اندام لڑکی کی شکل دے رکھی تھی مجھے اپنا نام "انکا" بتایا اور کہا کہ اگر میں اس کے اشارے پر چلتا رہا تو بہت جلد بڑا آدمی بن جاؤں گا۔ انکا نے اپنی نوازشوں کے عوض میں مجھ سے اپنے احکام کی تعمیل کا عہد بھی لے لیا تھا۔

تقریباً بیس روز ہوئے تھے کہ میں انکا کی حیرت انگیز قوتوں سے خاصا آسودہ حال بن گیا اور عیش و آرام کی زندگی بسر کرنے لگا۔ ایک روز کا ذکر ہے، میں حسب معمول شام کو پارک میں بیٹھا اپنی محبوبہ نرگس اصفہانی کو پُرشوق نظروں سے دیکھ رہا تھا کہ جمشید نامی ایک شخص اس کے قریب آکر بیٹھ گیا۔ انکا نے جب یہ بتایا کہ جمشید نرگس کا منگیتر ہے تو رقابت کا ایک شدید جذبہ میں نے اپنے اندر محسوس کیا۔ پھر جب انکا نے مجھے حکم دیا کہ میں جمشید کو قتل کر دواؤں تو میں انکار نہ کر سکا۔ مجھے مجبوراً انکا کے وجود کو برقرار رکھنے کے لئے اسے انسانی خون فراہم کرنا پڑا، مگر دوسرے دن جب جمشید کی لاش کی تفصیل اخبارات میں چھپی تو میں گرفتاری کے خوف سے اور نرگس کے مشورے پر بمبئی بھاگ گیا۔ بمبئی میں انکا کی پُراسرار قوت نے مجھے لاکھوں روپے کا مالک بنا دیا۔ گاڑی، بنگلا، نوکر دن کی فوج۔ میں دن میں ریس کھیلتا اور رات کو میری خوابگاہ کسی حسین دوشیزہ کی خوشبو سے معطر ہوتی، شراب و شباب کی سرمستیوں میں، میں یہ بھی بھول گیا تھا کہ انکا مجھ سے ایک خطرناک عہد لے چکی ہے۔ بہرحال ایک روز دوسری بار انکا کے کہنے پر مجھے طوعاً و کرہاً کملا نامی ایک خوبصورت لڑکی کو قتل کرنا پڑا۔ انکا نے اس بدنصیب لڑکی کا سارا خون بھی اپنے وجود کو تقویت بخشنے کی خاطر پی ڈالا۔

کملا کی موت کی خبر چھپی نہ رہ سکی، میں نے پولیس کو ڈیڑھ لاکھ روپے کی خطیر رقم دے کر کسی نہ کسی طرح گلوخلاصی حاصل کرلی مگر عدالتوں اور تھانوں کے چکر نے میرے اوسان خطا کر دیئے۔ میں نے انکا سے درخواست کی کہ وہ اپنا وجود برقرار رکھنے کے لئے کوئی اور ذریعہ تلاش کرے تو وہ مجھ سے خفا ہوگئی۔ لیکن میرے سر سے چپکی رہی۔ اس عرصے میں نرگس اپنے ماں باپ کو چھوڑ کر بمبئی آگئی۔ میں نے اس سے شادی کرلی اور بُری عادتوں کو چھوڑ کر نرگس میں گم ہو جانا چاہا، انکا نے اپنی ناراضگی کا انتقام یوں لیا کہ میرے برطرف شدہ ملازم کو ایک بدنام شخص کلن خاں کے ہاتھوں قتل کرا دیا اور کلن خاں سے عدالت میں یہ بیان دلوا دیا کہ اس نے ایک لمبی رقم کے عوض میرے ایما پر قتل کیا ہے۔ میں نے ہرچند اپنی بے گناہی کا یقین دلایا اور عدالت کو بتایا کہ ایک پُراسرار عورت میرے سر پر سوار ہوگئی ہے جس کے حکم کا میں تابع ہوں اور جو کچھ میں نے کیا ہے اس کے اشارے پر کیا ہے، لیکن کسی نے میری بات کا یقین نہیں کیا۔ کملا اور رحمت علی کے قتل کے جرم میں مجھے چودہ سال قید بامشقت کی سزا سنادی گئی۔

قید خانے میں جب میں خوفناک مجرموں جیسی دی جانے والی سزائیں بھگت رہا تھا تو کچھ دنوں بعد میں نے انکا کو ایک بار پھر اپنے سر پر محسوس کیا، انکا نے مجھ سے کہا کہ اگر میں ہر ماہ کے بجائے چار ماہ میں بھی اس کے لئے انسانی خون فراہم کرنے پر آمادہ ہو جاؤں تو وہ اپنی پُراسرار قوت کے ذریعے مجھے چھٹکارا دلا سکتی ہے۔ میں نے نرگس کی پریشانیوں کی خاطر اس کی بات مان لی اور اس وقت میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب مجھے جیلر نے بتایا کہ کلن خاں اپنے سابقہ بیان سے منحرف ہوگیا ہے۔ تحریری طور پر اس نے میرے ملازم بلکہ کملا کے قتل کا بھی اقرار کرلیا ہے اور میری بیوی نے عدالت کے فیصلے کے خلاف اپیل دائر کردی ہے کلن خاں کے منحرف بیان اور نرگس کی اپیل کے بعد مجھے باعزت طور پر بری کر دیا گیا، میری گرفتاری اور رہائی کا یہ سارا کھیل انکا کی پُراسرار قوت کا کرشمہ تھا۔ مگر میں نے دل میں یہ عہد کرلیا تھا کہ اپنے سر پر قابض اس خطرناک وجود سے چھٹکارا پانے کی پوری کوشش کروں گا چاہے اس کا انجام کتنا ہی خطرناک کیوں نہ ہو۔ مگر میں اپنے ارادے میں کامیاب نہ ہو سکا میں نے انکا سے فرار حاصل کرنا چاہا لیکن انکا میرے سر پر مسلط رہی، وہ نرگس سے بھی ناراض ہوگئی کیونکہ اسنے مجھے انکا سے نجات دلانے کے لئے شولاپور میں کسی بزرگ کی درگاہ کا رُخ کیا تھا۔ اسکے بعد مجھے نہ جانے کتنے معصوم انسانوں کو انکا کے ایما پر موت کے گھاٹ اُتارنا پڑا، کتنے لوگ مر گئے ——— میں جب انکا سے ناراض ہوا تو اس نے بھیانک انتقام لیا، ہماری ہر ترکیب ہر کوشش ناکام ہوگئی، انکا کو دیر سے سہی مگر ہر بات کا پتا چل جاتا۔ جیل کا ظالم سنتری شہباز قتل ہوا، کلن خاں بھی انکا کا شکار ہوگیا۔ میرے منیجر کو اس نے نرگس کے ہاتھوں قتل کروا ڈالا۔ اس نے ہر بار مجھے عبرتناک سزا دی اور مجھے اپنے منحوس وجود کی پراسراریت سے ڈرایا دھمکایا۔ وہ مجھے کسی نہ کسی جرم میں پھنساتی اور رہا کراتی رہی، میری زندگی تلخ ہو چکی تھی، دولت مجھے اب بے کار معلوم ہوتی۔ نرگس نے میرے ساتھ سکھ کا کوئی

دن نہیں گزارا تھا، کوئی صورت ایسی نہیں بنتی تھی کہ انکا میرے سر سے ہٹ جائے۔ کبھی کبھی وہ میرے سر سے چلی جاتی جب اسے میرے خلاف یا میرے حق میں دوسرے کسی شخص سے کوئی کام کرانا ہوتا تھا۔ اس کی عدم موجودگی میں، میں اور نرگس پروگرام بناتے مگر اسے سب معلوم ہوجاتا تھا اور آتے ہی وہ کسی نئی مصیبت میں مجھے مبتلا کردیتی۔ میں چونکہ بمبئی میں مشکوک ہوچکا تھا لہٰذا چند دنوں کے لئے دہلی آگیا، یہاں نرگس نے حضرت خواجہ نظام الدین اولیا کی درگاہ پر حاضری دینے اور انکا کے چنگل سے میری نجات کی دعا مانگنے کی کوشش کی۔ مگر راستے ہی میں انکا میرے سر پر سوار ہوگئی اور اس نے ہماری اس کوشش کو بھی ناکام بنا دیا۔ نرگس کو اس کی اس جرأت پر ایک ناقابلِ بیان صورتحال سے دوچار کر دیا۔ نرگس مجھے اچانک چھوڑ کر چلی گئی۔ اور میری آنکھوں نے اسے شارع عام پر ایک اجنبی شخص کے ساتھ شرمناک حالت میں دیکھا، نرگس نے مجھے پہچاننے سے بھی انکار کر دیا تھا مجبوراً میں نے پھر انکا سے مفاہمت کا رویّہ اختیار کیا۔ اس سے معافی مانگی۔ انکا نے میری التجا پر نرگس کو واپس کرنے کا وعدہ کرلیا۔ رات کو بارہ بجے اس نے مجھے ایڈورڈ پارک بھیجا جہاں سناٹے میں ایک شخص نرگس سے دست درازی میں مصروف تھا اور نرگس آہ وزاری کر رہی تھی۔ میں یہ شرمناک منظر دیکھ کر اپنے آپے میں نہ رہ سکا میں نے اسے مار دیا اور نرگس کو ساتھ لے آیا۔ ایک اور قتل ہوچکا تھا، انکا نے میری غیرت کے چیتھڑے بکھیر کر مجھ سے ہولناک انتقام لیا تھا۔ وہ جو چاہتی کرسکتی تھی۔

بہت دیر میں نرگس کے اوسان بحال ہوئے، اسے کچھ یاد نہیں تھا کہ وہ اس عرصے میں کہاں اور کس کے ساتھ رہی۔ اب یہی مناسب تھا کہ میں دلّی چھوڑ کر بمبئی کا رُخ کروں جہاں میرا کاروبار پھیلا ہوا تھا۔ اس عرصے میں انکا میرے سر سے غائب رہی۔ بمبئی میں جب میں اپنے مقتول منیجر کے گھر والوں کو تسلی تشفی دے کر واپس آرہا تھا کہ انکا میرے سر پر دار د ہوگئی اور مجھے پھر تاؤ آگیا، غصّے کی شدّت نے مجھے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے محروم کردیا۔ میں انکا سے لڑ پڑا، اس نے نرگس کے ساتھ بہت دل سوز مذاق کیا تھا، میں نے اسے دھمکیاں بھی دیں۔ انکا نے مجھے حسبِ معمول تنبیہ کی کہ اس بار وہ مجھے پہلے سے زیادہ ہولناک مصائب سے دوچار کردے گی۔ مگر میں نرگس کی بے عزّتی یاد کر کے اور بپھر گیا، میں اسے بُرا بھلا کہتا رہا۔ اس کے پنجوں کی چبھن میرے سر پر تیز ہوگئی، اسٹیئرنگ پر میرے ہاتھ کانپنے لگے اور فضا میں ایک زبردست دھماکا ہوا۔

مجھ سے ایک خطرناک ایکسی ڈنٹ ہوگیا تھا جس میں چار آدمی ہلاک ہوچکے تھے اور میرا ایک ہاتھ کٹ گیا تھا۔ میں اپاہج ہوگیا۔ نرگس اگر نہ ہوتی تو میں خودکشی کرلیتا۔ جب میری طبیعت سنبھلی تو مجھے چار آدمیوں کو ہلاک کرنے کے الزام میں گرفتار کرلیا گیا، لیکن یہاں بھی انکا نے ایک اور تماشا کیا۔ وہ تفتیش کرنے والے انسپکٹر کے سر پر چڑھ گئی اور اس نے عدالت میں اس کی زبانی ایسے ناقابلِ یقین بیانات دلوائے کہ پورے کیس کی نوعیت بدل گئی۔ ڈی، ایس، پی منوہر لال کو اپنی پوزیشن کا ناجائز استعمال اور عدالت کو دھوکا دینے کے الزام میں گرفتار کرلیا گیا۔ انکا نے ناممکن کو ممکن بنا کر مجھ پر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ وہ کس قسم کی پُراسرار عورت ہے۔ اس کے بعد انکا حسبِ معمول میرے سر پر آگئی اور میں نے حسبِ معمول اس سے تلخ رویّہ اختیار کیا۔ مگر اس بار انکا اداس تھی۔ کچھ بجھی بجھی سی۔ اس عرصے میں ہوا یہ کہ نرگس کے والد اصفہانی صاحب ہیں، اپنے گھر لے گئے انکا میرے سر پر تھی اور اب وہ بہت خاموش رہا کرتی تھی۔ اس سے ناراضگی اور نفرت کے باوجود مجھ سے اس کی اُداسی نہ دیکھی گئی — آخر اس سے میری وابستگی پُرانی تھی۔ میں نے اس سے اس کی اُداسی کا سبب پوچھا تو اس نے دل گرفتہ لہجے میں جواب دیا "دنیا کی تمام قوتیں بھی اگر مل کر مجھے پریشان کریں تو میں تنہا ان کا مقابلہ کرسکتی ہوں لیکن ایک طاقت ایسی ہے جس پر میرا زور نہیں" انکا نے بتایا کہ اسے قابو میں کرنے کیلئے کٹھن جاپ کرنا پڑتا ہے، یہ جاپ ایک شخص نے اسی شہر میں شروع کر دیا ہے۔ اگر وہ اس میں کامیاب ہوگیا تو انکا اس کی غلام بن جائے گی اور اس کی مرضی کی تابع ہوگی۔ اگر اس کے جاپ میں ذرا سی چوک ہوگئی تو وہ انکا کی غذا بن جائے گا۔ انکا سے یہ خبر وحشت اثر سن کر میں پریشان ہوگیا — گویا انکا مجھ سے چھن جائے گی — کچھ بھی ہو وہ میری مونس و غمگسار رہی تھی۔ میں نے پچھلی تمام باتیں بھلا دیں اور انکا سے کہا "اگر تمہیں انسانی خون کی ضرورت ہے تو میں تمہیں فراہم کر دوں گا۔ اگر تمہیں اس پنڈت سے ڈر ہے تو میں اسے جہنم رسید کر دوں گا۔ بتاؤ میں تمہارے لئے کیا کروں۔ انکا میری بات سن کر مسکرائی اور کہنے لگی "کاش ہم دونوں زندگی بھر ایک ساتھ رہ سکتے" پنڈت کا جاپ مکمل ہونے میں اٹھارہ بیس روز باقی رہ گئے تھے۔ انکا نے مجھے بتایا کہ جب تک وہ منڈل میں ہے کوئی اس کا بال بیکا بھی نہیں کرسکتا۔ لیکن اس عرصے میں انکا کی افسردگی دُور کرنے کا ایک موقع ہاتھ آگیا۔ میرے خسر اصفہانی صاحب کو ایک ٹھیکیدار نے پریشان کر رکھا تھا۔ جب مجھے معلوم ہوا تو میں نے انکا سے کہا اور دوسرے دن بڑی خاموشی سے میں نے انکا کی مدد سے اسے ختم کر دیا، انکا کو اس کی غذا مل گئی اور اصفہانی صاحب کی راہ کی رکاوٹ دُور ہوگئی۔ اس واردات کے دوران ایک حسین و جمیل عورت

نازلی سامنے آئی۔ انکانے مجھے بتایا کہ نازلی میرے خسر کی داشتہ ہے جسے انھوں نے ایک مجسٹریٹ کو دھوکا دے کر حاصل کیا ہے۔ میں اصفہانی صاحب کو بہت پارسا شخص سمجھتا تھا۔ بہرحال جب اس نازنین اور پری پیکر لڑکی کو میں نے دیکھا تو دیکھتا رہ گیا، مجھ سے برداشت نہ ہو سکا میں اس سے ملا اور میں نے اس کے قدموں پر دولت نچھاور کر دی۔ اس کے عوض مجھے اس کی گداز قربت ملی۔

مگر پھر وہی بات کہ پنڈت کے جاپ کے دن پورے ہو رہے تھے، وہ اپنے جاپ میں اب تک کامیاب تھا۔ اگر وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا تو انکا میرے ہاتھ سے نکل جائے گی۔ میں انکا کے مشورے سے ایک ملنگ کے پاس گیا مگر اس نے اُلٹی سیدھی باتیں کیں۔ چار و ناچار کچھ سوچے سمجھے بغیر یوں کہیئے کہ جذبات کی رَو میں بہہ کر میں سیدھا مرگھٹ کی طرف چل پڑا جہاں وہ منحوس پنڈت اپنے جاپ میں مصروف تھا۔

انکا نے مجھے بہت منع کیا کہ میں اپنے اس ارادے سے باز رہوں مگر میں منڈل کے قریب پہنچ گیا۔ وہاں برگد کے ایک تناور درخت کے نیچے ایک پنڈت آلتی پالتی مارے اپنے جاپ میں مصروف تھا۔ اگر میں اس کے گیان دھیان میں خلل ڈالنے میں کامیاب ہو جاتا تو پنڈت اپنے جاپ میں ناکام ہو جاتا۔ چنانچہ میں نے اسے اشتعال دلانے کی ہر طرح کوشش کی۔ اسے بُرا بھلا کہا، اس پر پتھر پھینکے مگر منڈل کے اندر داخل ہوتے ہی پتھر موم کی طرح پگھل گئے۔ میں نے آخر کار منڈل میں داخل ہونے کا ارادہ کیا۔ ابھی میں منڈل میں ایک پاؤں ہی رکھ پایا تھا کہ مجھے محسوس ہوا جیسے مجھے بجلی کا جھٹکا لگا ہو۔ انکا میرے سر پر نہیں تھی۔ میں نے گھبرا کر قدم پیچھے ہٹا لیا۔ دوسرے لمحے انکا میرے سر پر آ گئی۔ اب یہ بات طے ہو گئی تھی کہ اس منحوس پنڈت کو اس کے خطرناک ارادے سے باز رکھنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔ اس مایوسی اور بددلی میں انکا نے مجھے ایک پنڈت بھگوان پرشاد کے پاس جانے کا مشورہ دیا۔ بھگوان پرشاد کو راضی کرنا آسان کام نہ تھا اور وہ کیوں تیار ہوتا، مگر جب اس نے میرے سر پر انکا کو دیکھا تو ششدر رہ گیا اور اس نے مرعوب ہو کر وعدہ کر لیا کہ وہ ایک ہفتے بعد تربینی کے جاپ کو توڑنے کا کوئی نہ کوئی اوپائے ڈھونڈے گا۔ یہ ایک ہفتہ بڑی مایوسی اور کرب میں گزرا۔ نرگس کو میں نے پوری صورتحال سے آگاہ کر دیا تھا۔ ادھر صابر علی مجسٹریٹ نے اپنی بے عزتی کا انتقام لینے کے لئے نازلی کو اسمگلنگ کے ایک چکر میں پھنسوا دیا۔ اس خبر کا مجھ پر کوئی اثر نہ ہوا، میں تو انکا کی جدائی سے ہراساں تھا۔ آٹھ دن بعد بھگوان پرشاد نے حسب وعدہ مجھے مٹی کی ایک کوری ہانڈی دی جس کا ڈھکنا سوکھے آٹے سے بند تھا، پنڈت بھگوان پرشاد نے مجھے ہدایت کی کہ میں کالی مائی کا شبھ نام لے کر اُسے منڈل کے اندر پھینک دوں۔ اسے یقین تھا کہ تربینی اپنا جاپ چھوڑ کر بھاگ جائے گا یا بصورتِ دیگر ہم دونوں پر تباہی آ جائے گی۔ منڈل کے قریب پہنچ کر میں نے تربینی کو اُکسایا اور ہانڈی اس کی طرف اُچھال دی۔ ہانڈی تربینی کے قریب پہنچ کر اس سے ٹکرانے کے بجائے فضا میں معلق ہو گئی۔ دوسرے ہی لمحے لاتعداد شیطانی آوازوں کا شور اُبھرنے لگا۔ گدھ منڈلانے لگے تھے، اچانک میں نے دیکھا کہ بھگوان پرشاد چیختا ہوا منڈل کے قریب پہنچا اور کالی مائی سے گڑگڑا گڑگڑا کر معافی مانگنے لگا۔ لیکن بھگوان پرشاد کے اوپر ہانڈی واپس آ گری۔ اسے چھوٹے چھوٹے ناگوں نے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ میں یہ منظر دیکھتے ہی وہاں سے بھاگا۔ اس حادثے کا مجھ پر اتنا گہرا اثر ہوا کہ میں ایک دن بے ہوش رہا۔ اب ہر ترکیب ناکام ہو چکی تھی۔ میں نے اپنے سر کی طرف دیکھا انکا اُداس اور ٹوٹی پھوٹی نظر آ رہی تھی۔ میری انکا — میری زندگی انکا — پھر وہ وقت آ گیا جب اس نے مجھ سے رقت بھرے لہجے میں کہا "جمیل — میں اب تم سے جدا ہو رہی ہوں، ہمارا ساتھ چھوٹنے والا ہے۔"

اور وہ لمحہ بھی آ گیا۔ انکا واقعی مجھ سے جدا ہو گئی۔ تربینی اپنے جاپ میں کامیاب ہو گیا تھا۔ میں انکا کے جانے کا صدمہ برداشت نہ کر سکا۔ پھر تو میری دُنیا ہی پلٹ گئی۔ میرا جی اپنے سسر کے گھر میں نہ لگا۔ میں نے نرگس سے واپس بمبئی چلنے کے لیے اصرار کیا مگر اس عرصے میں ایک واقعہ ایسا ہو گیا کہ جس نے مجھ سے میری نرگس کو چھڑا دیا۔ نازلی نہ جانے کیسے وارد ہو گئی۔ اور اسے میرے سسر نے میرے ساتھ شرمناک حالت میں دیکھ کر مجھے گھر سے نکال دیا۔ میں تنہا بمبئی آیا تو ذہنی انتشار نے مجھے گھیر لیا۔ میں نے شراب اور عیاشی میں اپنے غم بُھلانے چاہے۔ میں تباہ ہوتا گیا۔ رفتہ رفتہ سب ختم ہو گیا۔ مکان، کاروبار، عزت اور نرگس بھی۔ نرگس کو میں نے طلاق نامہ لکھ کر بھجوا دیا۔ میرے پاس سے ہر چیز چھن گئی۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ میں ایک سستے قسم کے ہوٹل میں مقیم ہو گیا — وہاں میرے پاس میری پرانی شناسا شکنتلا آئی اور اس نے مجھ سے پونا چلنے کیلئے اصرار کیا۔ میں اسے برقع میں ملبوس ایک ٹیکسی میں بٹھا کر پونا لے گیا۔ وہاں ہم دونوں پکڑے گئے۔ شکنتلا گھر سے بھاگ کر آئی تھی اور پونا پولیس کو اس کی تلاش تھی۔ اس نے تھانے میں میرے خلاف بیان دیا کہ میں اسے بمبئی سے بھگا کر لایا ہوں۔ چار ماہ تک میں جیل میں رہا۔ جب مجھے رہائی ملی تو میری جیب میں کوئی پیسہ نہیں تھا میری داڑھی بے تحاشا بڑھی ہوئی تھی۔ میں ایک سڑک پر کھڑا اپنی بے بسی پر آنسو بہا رہا تھا کہ کسی نے میرے آگے بھیک ڈال دی۔ میں نے بھوک سے مجبور ہو کر انہیں اُٹھا لیا۔ یوں میں بھکاری بن گیا۔ ایک روز میں ریس کورس کے فقیروں کے ساتھ کھڑا تھا کہ میں نے تربینی کو دیکھا۔ وہی تربینی جس نے انکا کو مجھ سے چھین لیا۔ وہ ایک خوبصورت عورت کے ساتھ

تھا۔ اس کا حلیہ بدل چکا تھا۔ وہ میرے قریب آیا اور ایک دس کا نوٹ میرے ہاتھ میں تھما کر چل دیا۔ تربینی کا میں خون پینا چاہتا تھا۔ میں نے اس کے دیئے ہوئے نوٹ کے پرزے پرزے کر دیئے اور اس انتظار میں کھڑا ہو گیا کہ کب ریس ختم ہو، کب وہ باہر نکلے اور کب میں اس کا کام تمام کروں ——

جب تربینی ریس کے اختتام پر باہر نکلا تو میں نے ایک پتھر کھینچ مارا۔ مجھے تعجب تھا کہ میرا نشانہ حیرت انگیز طور پر خطا ہو گیا، پتھر ایک پارسی کے سر سے ٹکرایا اور ایک بار پھر میں پولیس کے چنگل میں پھنس گیا۔ لوگوں نے مجھے بہت مارا اس قدر کہ میرے اوسان جاتے رہے۔ پھر اچانک ایک عجیب بات رونما ہوئی۔ خود تربینی میری رہائی کے لئے آیا، اس نے مجھے اپنے ساتھ لیا اور گھر آ گیا۔ میں نے یہ سوچ کر کہ اس طرح میں تربینی سے قریب رہ سکوں گا اس کے ساتھ رہنے پر آمادگی ظاہر کر دی۔

میں وہاں رہ تو رہا تھا مگر میری حیثیت تربینی کے زرخرید غلام کی سی تھی، مجھ سے توہین آمیز برتاؤ کیا جاتا تھا۔ تربینی کی زندگی کا ہر لمحہ 'انکا' کے سبب عیش و نشاط میں گزر رہا تھا۔ ایک رات اس نے مجھے ایک لڑکی کو قتل کرنے کا حکم دیا۔ جب پستول میرے ہاتھ میں آیا تو میں نے لڑکی کے بجائے تربینی پر گولی چلا دی لیکن اس پر کوئی اثر نہ ہوا، ناچار مجھے لڑکی کو مارنا پڑا۔ دوسری صبح مجھ پر سخت مظالم توڑے گئے۔ بیس روز تک میں موت و زیست کی کشمکش میں مبتلا رہا۔ آخر میں نے تربینی سے وعدہ کیا کہ میں آئندہ اس قسم کی حرکت نہیں کروں گا۔ ایک رات جب میں نے اپنی سابق محبوبہ شکنتلا کو تربینی کے ساتھ بدمست پایا تو تربینی پر پھر حملہ کرنے کی ٹھانی۔ لیکن عین اس وقت جب میں اسے پیچھے سے مارنا چاہتا تھا انکا میرے سر پر وارد ہو گئی اور اس نے مجھے دھمکی دی کہ اگر آئندہ میں نے اس کے آقا پر حملہ کیا تو وہ مجھے عبرتناک حالات سے دوچار کر دے گی۔ انکا کا رویہ عجیب تھا، وہ مجھ سے ایک اجنبی کی طرح باتیں کر رہی تھی۔ اب تربینی کو مارنے کی کوئی صورت نہ تھی! مگر ایک ترکیب میرے ذہن میں آ ہی گئی، میں نے سوچا کہ جس وقت انکا خون پینے میں مصروف ہو اور تربینی کا سر خالی ہو عین اس وقت میں اس پر حملہ کر دوں تو کامیاب ہو سکتا ہوں۔ خوش قسمتی سے ایسا موقع ہاتھ آ گیا۔ جب انکا اپنے شکار کا خون پینے میں مصروف تھی میں بھاگا ہوا ڈرائیور کے پاس آیا اور اسے کوٹھی کی طرف چلنے کی ہدایت کی۔

—— سب رنگ کا سب سے مقبول سلسلہ ——

میرے پاس

صِرف تین گھنٹوں کی مُہلت تھی۔ تین گھنٹے جو میری زندگی کا رُخ پلٹ سکتے تھے۔ میں کامیابی کی صُورت میں پھر بڑا آدمی بن سکتا تھا۔ میرا ذہن بڑی تیزی سے کام کر رہا تھا۔ مجھے اِس بات کا پُورا یقین تھا کہ اِنکا شکنتلا کا خُون پینے میں کم از کم تین گھنٹے ضرُور صَرف کرے گی۔ میں اس عرصے میں تربینی کو موت کے گھاٹ اُتار کر اِنکا کو دوبارہ حاصل کر سکتا تھا۔

میں اپنی نشست پر بیٹھا خود کو آنے والے حالات سے مُقابلہ کرنے کے لئے تیار کر رہا تھا۔ میری نظریں سامنے ویران اور سنسان سڑک پر مرکُوز تھیں۔ تربینی کا ڈرائیور بدستُور خاموش تھا۔ میں ابھی اپنے منصُوبے کو تمام پہلوؤں سے جانچنے میں مصرُوف تھا کہ یکلخت ڈرائیور نے گاڑی کو بائیں جانب تیزی سے موڑا اور کچھ دُور جا کر اسے ایک چار منزلہ عمارت کے سامنے روک دیا:

"کیوں ——" میں نے ڈرائیور کو پریشان نگاہوں سے دیکھتے ہُوئے پُوچھا۔ "تم نے گاڑی یہاں کیوں روک دی؟"

"تم گاڑی میں بیٹھو۔ میں اپنی پتنی سے ایک ضرُوری بات کر کے آتا ہوں۔"

"کیا تم اِسی عمارت میں رہتے ہو؟"

"ہاں ——" ڈرائیور نے مُسکراتے ہُوئے کہا۔ پھر وہ گاڑی کا دروازہ کھول کر باہر نکلنا ہی چاہتا تھا کہ میں نے اسے بازُو سے تھام کر روکتے ہُوئے کہا:

"تربینی نے ہمیں فوری واپسی کا حُکم دیا تھا۔ اسے ہمارا انتظار ہو گا۔ تم اپنی پتنی سے پھر مِل لینا۔"

"فکر مت کرو —— میں دس پندرہ منٹ سے زیادہ نہیں لُوں گا۔"

"نہیں ——" میں نے کرخت لہجے میں کہا۔ "میری بات مانو —— جو میں کہتا ہُوں اُسے سُنو۔ تمہیں پہلے تربینی کی کوٹھی چلنا ہو گا۔"

"کیا مطلب؟" ڈرائیور نے میرا ہاتھ بڑی نفرت سے جھٹکتے ہُوئے جواب دیا۔ "خبردار جو تُو نے پھر کبھی اپنا گندا ہاتھ میرے شریر کو لگایا۔"

برا ۶۷

ٹھنڈے کہیں کے۔"

میرے ذہن میں اس وقت صرف ایک ہی خیال گردش کر رہا تھا "مجھے جلد از جلد کوٹھی پہنچ کر تربینی کو ٹھکانے لگا دینا چاہیئے۔" ایسی صورت میں ڈرائیور کا اپنی دھرم پتنی کے پاس جانا وقت کی بربادی کا باعث بن سکتا تھا میں اس سنہری موقع کو کسی قیمت پر گنوانے کے لئے تیار نہیں تھا۔ پھر جس انداز میں ڈرائیور نے مجھے ٹھنڈا کہا تھا۔ وُہ بھی انتہائی تضحیک آمیز تھا میری آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ میں نے بگڑتے ہوئے اُسے مخاطب کیا:

"سنو مہاشے! ــــ اگر تمہیں اپنا جیون پیارا ہے تو پہلے مجھے کوٹھی پہنچا دو اس کے بعد تم جہاں مرضی آئے جا سکتے ہو"

"ابے جا ــ" ڈرائیور نے مجھے ایک گندی گالی دی پھر پلٹ کر گاڑی سے اُترنا ہی چاہتا تھا کہ میں نے جھپٹ کر اسے دبوچ لیا۔ میرا واحد ہاتھ آنِ واحد میں اس کی گردن میں پھانسی کے پھندے کی طرح پہنچ گیا۔ پھر اس کا حلقہ تنگ ہونے لگا۔ ظاہر ہے میں اُکا کو دوبارہ حاصل کرنے کے لئے سب کچھ کر گزرنے کے لیے تیار تھا۔

"بھگوان کے لئے ــــ مجھے شما کر دو ـــ تم جو کہو گے میں وُہی کروں گا۔"

ڈرائیور کے حلق سے گھنسی گھنسی آواز اُبھری تو میرا خون اَور کھول اُٹھا۔ موت کو سامنے دیکھ کر میں نے بڑے بڑے سورماؤں کو زندگی کے لئے بھیک مانگتے دیکھا تھا لیکن اس وقت میں موت اور زندگی کے فلسفے پر غور کرنے سے زیادہ اس بات کا متمنی تھا کہ جلد از جلد ڈرائیور کو ٹھکانے لگا کر تربینی تک پہنچ جاؤں۔ چنانچہ میں نے اپنی ساری قوت سمیٹ کر ہاتھ کے حلقے کو اور تنگ کر دیا۔ ڈرائیور نے چھٹکارا پانے کے لئے بہت ہاتھ پاؤں مارے لیکن کچھ دیر بعد ہی وُہ بے دم ہو کر میرے اُوپر جھول گیا میں نہیں سمجھ سکا کہ وہ مر گیا ہے یا بے ہوش ہو گیا ہے۔ بہرحال میں نے اُسے بڑی پھرتی سے گھسیٹ کر پچھلی نشست پر ڈالا اور خود اس کی جگہ سنبھال لی۔ ایک ہاتھ سے گاڑی چلانا بہت مشکل کام تھا۔ مجھے گاڑی چلائے دن بھی خاصے ہو چکے تھے مگر اس وقت میں نے اپنی تمام صلاحیتوں اور قوتوں کو مجتمع کیا اور اسٹیرنگ کو اپنے ایک ہاتھ سے قابو میں کیا۔ گاڑی بڑی تیزی کے ساتھ گھوم کر دوبارہ اسی سڑک پر آگئی جو تربینی کی کوٹھی کی سمت جاتی تھی۔

مجھے کوٹھی تک پہنچنے میں بمشکل دس منٹ صرف ہوئے۔ میرے ذہن پر اس وقت جنون سوار تھا۔ میں نے گاڑی کو پورٹیکو میں روکا اور نیچے اُتر کر تیز تیز قدم اُٹھاتا کوٹھی کے اندر داخل ہو گیا۔ تربینی کی خوابگاہ تک پہنچنے میں بھی میں نے غیر معمولی عجلت سے کام لیا تھا خوابگاہ کے دروازے پر ٹھہر کر میں نے چابی والے سوراخ سے اندر جھانکا لیکن اندھیرے کی وجہ سے کچھ نہ دیکھ سکا۔ غالباً تربینی سونے کے لئے لیٹ چکا تھا۔ میں نے دروازے کے ہینڈل کو آزمایا مگر وہ اندر سے بند ہونے کے سبب نہ کھل سکا۔ دوسرے ہی لمحے میں نے کچھ سوچ کر دروازے کو کھٹکھٹانا شروع کر دیا۔ مجھے اپنے ارادے میں ناکامی نہیں ہوئی چند ثانیے بعد اندر سے تربینی کی آواز سنائی دی۔

"کون ہے ؟"

"میں ہوں سرکار ـــ جمیل احمد خان۔" میں اُونچی آواز میں بولا "جلدی دروازہ کھولیے۔ پولیس نے ڈرائیور کو گرفتار کر لیا ہے۔"

چابی والے سوراخ سے روشنی کی کرن پھوٹی تو میں سمجھ گیا کہ تیر ٹھیک نشانے پر لگا ہے۔ میرے دل کی دھڑکنیں اور تیز ہو گئیں میں دروازے کے قریب ایک قدم پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ اندر سے آہٹ اُبھر کر دروازے کے قریب آئی۔ بولٹ کھلنے کی آواز اُبھری اور پھر تربینی ڈریسنگ گاؤن میں ملبوس میرے سامنے موجود تھا۔

"کیا بات ہے ـــ پولیس نے ڈرائیور کو کیوں گرفتار کیا" تربینی نے لاپرواہی سے پوچھا۔

"مجھے نہیں معلوم سرکار۔" میں نے بمشکل اپنے دل کی دھڑکنوں پر قابو پاتے ہوئے جواب دیا "شکنتلا کو ٹھکانے لگانے کے بعد جب میں واپس آیا تو پولیس والے ڈرائیور سے باز پرس کر رہے تھے۔ میں وہاں رُکنے کے بجائے بھاگ کر آپ کو اطلاع دینے آگیا۔"

"شکنتلا کو تم نے گاڑی سے کتنی دُور لے جا کر ٹھکانے لگایا؟"

"میں اسے خاصی دُور لے گیا تھا سرکار لیکن ہو سکتا ہے کہ ڈرائیور پولیس والوں سے خائف ہو کر زبان کھول دے۔"

پُرانی حکایتوں میں ہے کہ کسی ملک کے بادشاہ کا انتقال ہوگیا تھا اور اُس کے جانشین کا مسئلہ زیرِ غور تھا۔ مروجہ طریقے کے مطابق شہر کی فصیل کا منہدم دروازہ کھُلنے پر جو شخص سب سے پہلے دروازے میں داخل ہوتا، وُہی بادشاہ کا جانشین قرار پاتا۔ چنانچہ اس مرتبہ جب دروازہ کھُلا تو اس میں سب سے پہلے داخل ہونے والا ایک فقیر تھا۔ لوگوں نے اُسے پکڑا اور اُس کے توبہ تلّا اور نا نا کرنے کے باوجود تخت پر بٹھا دیا۔ فقیر بادشاہ بن گیا۔ فقیر نے جب یہ دیکھا کہ بادشاہت قضائے مبرم کی طرح پیچھے ہی پڑ گئی ہے تو اپنا خرقۂ فقیری اور عصا ایک کمرے میں احتیاط سے رکھ کر بادشاہت کے مزے لوٹنے لگا۔

فقیر بادشاہ کی حماقت کے چرچے دُور دُور تک پھیل گئے۔ پڑوسی دُشمن بادشاہ کی نیت خراب ہُوئی اور وُہ حملے کی تیاریاں کرنے لگا۔ جاسوسوں نے فقیر بادشاہ کو مطلع کیا کہ "حضور! دُشمن حملے کی تیاریاں کر رہا ہے۔"

بادشاہ سلامت نے دارُوغۂ مطبخ کو بُلایا اور اُسے حکم دیا کہ "گرم گرم حلوہ تیار کرو۔" حکم کی تعمیل کی گئی۔ حلوہ تیار ہُوا اور بادشاہ سلامت نے اسے نہایت ذوق و شوق سے مزے لے لے کر نوش فرمایا۔ کچھ دنوں بعد جاسوسوں نے پھر اطلاع دی "حضور! دشمن اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ حملے کی نیت سے کوچ کر چکا ہے۔" بادشاہ سلامت نے پھر حکم دیا۔ "دارُوغۂ مطبخ سے کہو حلوہ تیار کرے۔" حلوہ تیار ہُوا اور بادشاہ سلامت پھر نوش فرما کر بسترِ استراحت پر تشریف لے گئے۔ اُمرا و ارکینِ سلطنت حیران تھے کہ آخر یہ معاملہ کیا ہے؟

مخبروں نے آخری خبر بہم پہنچائی کہ "دُشمن نے ہمارا محاصرہ کر لیا ہے۔ براہِ کرم اس کے مقابلے کا حکم اور بچاؤ کی تدابیر فرمائی جائیں۔"

بادشاہ سلامت نے جواب کے بجائے خرقۂ فقیری اور عصا والا کمرہ کھولا۔ اس میں سے دونوں چیزیں نکالیں۔ شاہی لباس اُتار کر ایک طرف پھینک دیا اور اپنا پرانا لباس زیبِ تن فرما کر عصا ہاتھ میں لیا اور چور دروازے سے یہ کہتے ہوئے فرار ہو گئے "میاں! ہم تو حلوہ کھانے آئے تھے سو کھا لیا، حکومت ہمیں جس بھاؤ ملی تھی اسی بھاؤ دے کر واپس جا رہے ہیں۔ اب تم جانو اور تمہارا کام۔"

ترینی کی آنکھوں میں تشویش کے اثرات ایک لمحے کے لئے اُبھر کر غائب ہو گئے۔ وُہ میری پریشان حالت پر ایک نظر ڈالنے کے بعد بولا:

"تم یہیں رُکو۔ میں ابھی فون کے ذریعے سب معلوم کئے لیتا ہوں۔"

میں نے اثبات میں سر کو خفیف سی جنبش دی لیکن میں پُوری طرح اپنے سوچے سمجھے منصوبے پر عمل کرنے کے لئے تیار تھا۔ چنانچہ ترینی جیسے ہی واپسی کے ارادے سے گھُوما میں نے کسی ہوشیار چیتے کی طرح، جست لگائی اور ترینی کے سر پر پہنچ گیا۔ پھر میں نے بڑی پھُرتی سے اپنا ہاتھ ترینی کی گردن میں اسی طرح پھنسایا جیسے کچھ دیر پیشتر میں نے ڈرائیور کے گلے میں پھنسایا تھا۔ ترینی دراز قد ہونے کی وجہ سے اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا۔ جب وُہ پُشت کی جانب قدموں پر لڑکھڑایا تو اس کی گردن پر میری گرفت کمزور پڑ گئی مگر میں نے جلدی سے دُوسرا پلیترا بدل کر پھر اسے قابُو میں کر لیا۔

"کمینے ——" ترینی کسی زخمی شیر کی طرح دھاڑا —— "میں تجھے نرکھ میں جھونک دُوں گا۔"

میں نے ترینی کی بات کا جواب دینے کے بجائے اپنا کام اور تیز کر دیا۔ مجھ پر خون سوار تھا مجھے نہیں معلوم کہ اس وقت میرے اندر اتنی طاقت کہاں سے آگئی تھی۔ میں کسی قدر ترچھا ہوا۔ پھر جب میں نے جھٹکا دے کر اسے گھسیٹا تو وہ اِس طرح معلق ہو گیا کہ اس کی کمر میری کمر پر تھی اور اُس کے دونوں پیر ہوا میں تھے۔ اپنے دونوں ہاتھوں سے وُہ میرا ہاتھ تھامے ہُوئے خود کو بچانے کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ دُوسری طرف میری ساری قوت اُس کی گردن پر صرف ہو رہی تھی۔ میں اپنے ہاتھ کا حلقہ تنگ کرتا جا رہا تھا —— اور تنگ —— اور تنگ۔ مجھے قوی اُمید تھی کہ اب ترینی کچھ دیر کا مہمان ہے اور اُس کی موت سے میں اُس عذابناک زندگی سے نجات پاؤں گا اور انکا کو دوبارہ حاصل کر لوں گا۔ انکا۔ جس کے بغیر میری زندگی اَدھوری تھی۔ اسی کی وجہ سے میری ویران زندگی میں بہار آئی تھی۔ اُسی نے مجھ سے علیحدہ ہو کر مجھے سڑکوں پر بھیک مانگنے کے لئے چھوڑ دیا تھا۔ ترینی نے اسے مجھ سے چھین لیا تھا۔ مگر ترینی کا خاتمہ اور میری زندگی کا حسین ترین لمحہ مجھ سے بہت قریب تھا۔ میری انکا میرے پاس آنے والی تھی۔ ترینی کا ہولناک انجام میرے سامنے تھا۔

میرا ذہن اِنکا کے تصوّر میں گم تھا اور اُس کے خیال سے میرے اندر بلا کی طاقت آ گئی تھی۔ میرا ہاتھ برابر تریبنی کی گردن پر اپنا حلقہ تنگ کرتا جا رہا تھا۔ تریبنی کے حلق سے اُکھڑی اُکھڑی اور گُھٹی گُھٹی آوازیں نکل رہی تھیں۔ وُہ ماہیِ بے آب کی طرح ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ پھر اچانک اس نے اُکھڑی اُکھڑی آواز میں کہا:

"اِن.... کا.... اِنکا... میری... سہائے.... تا.... کر۔"

"اِنکا کو اب بھُول جاؤ تریبنی داس جی...." میں سرد لہجے میں بولا۔ "وہ اِس سمے شکنتلا کے خوُن سے اپنے وجُود کو سیراب کر رہی ہو گی اور جب تک وہ تمہاری سہایتا کو آئے گی تم مر چکے ہو گے۔ تم نے مجھے بہت ستایا ہے تریبنی۔ بہت ظُلم کیا ہے۔"

"اِنکا ـــ اِنکا ـــ" تریبنی نے گُھٹی گُھٹی آواز میں دوبارہ چِلّانے کی کوشش کی۔

مجھے تریبنی کی بے بسی پر رحم آنے کے بجائے خوشی ہو رہی تھی۔ اُس کی تڑپ کا تماشا دیکھ کر مجھے کیسا سکوُن مل رہا تھا۔ پھر اچانک مجھے ایسا محسُوس ہُوا جیسے میرے ہاتھ کا حلقہ تنگ ہونے کے بجائے ڈھیلا پڑ رہا ہو جیسے کوئی غیر مرئی طاقت میرے ہاتھ تریبنی کی گردن سے علیحدہ کر رہی ہو۔ میں اس اچانک تبدیل ہونے والی حالت پر تلملا اُٹھا۔ میں نے بوکھلا کر دوبارہ اپنی گرفت مضبُوط کرنی چاہی تو مجھے یُوں محسُوس ہُوا جیسے کسی نے میرے بازُو میں نشتر اُتار دیا ہو۔ ابھی میں بازُو میں ہونے والی شدید تکلیف اور جلن پر غور بھی نہ کر پایا تھا کہ مجھے سر پر ننھے ننھے سے نشتر چُبھتے محسُوس ہوئے۔

"اِنکا ـــ" میرے ذہن میں اِنکا کا نام اُبھرا تو مجھے جھرجھری آ گئی۔ میرا ہاتھ مشینی انداز میں تریبنی کی گردن سے علیحدہ ہُوا تو وُہ کسی کٹے ہُوئے شہتیر کی طرح قالین پر ڈھیر ہو گیا۔

میں نے عالمِ تصوّر میں اپنے سر پر نظر ڈالی تو مارے دہشت کے سرتاپا لرز اُٹھا۔ میرا اندازہ غلط نہیں ثابت ہُوا۔ میرے سر پر اِنکا کا پُراسرار وجُود موجُود تھا۔ اِنکا اس وقت بڑی بھیانک نظر آ رہی تھی اُس کا تمام چہرہ خوُن میں لتھڑا ہُوا تھا اُس کی آنکھیں جو کبھی مجھے زندگی کی حسین ترین مسرّتوں کا پیغام دیا کرتی تھیں اُس وقت بڑی خوفناک نظر آ رہی تھیں۔ اس کے چہرے پر سخت گیری کے تاثرات موجُود تھے۔ اُس کے بال بُری طرح بکھرے ہُوئے تھے۔ اُس کی خوُن آلوُد اور خوفناک آنکھیں میرے چہرے پر مرکُوز تھیں۔ چند ثانیے تک وُہ مجھے گھُورتی رہی پھر حقارت بھرے لہجے میں مخاطب ہُوئی:

"جمیل احمد خان ـــ میں نے تمہیں منع کیا تھا کہ میرے آقا کی طرف کبھی غلط نظروں سے مت دیکھنا۔ مگر تم نہیں مانے۔"

"اِنکا ـــ یہ سب میں نے تمہارے لیے کیا ہے۔" میں نے بے چین ہو کر کہا۔ "میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ میں تمہیں دوبارہ حاصل کرنا چاہتا ہُوں۔"

"تم بیوقوف ہو ـــ مجھے بتاؤ کہ تُم نے میرے آقا پر حملہ کرنے کی جرأت کیسے کی۔" اِنکا نے اپنے ہونٹوں کے اُوپر جمے ہُوئے خوُن کو زبان سے چاٹتے ہُوئے کہا:

"میں ایسا کرنے پر مجبُور تھا اِنکا ـــ اب صرف یہی ایک طریقہ رہ گیا تھا۔" میں نے جذباتی لہجے میں کہا۔ "اب مزید ذلت مجھے منظور نہیں یا تو میں تمہیں حاصل کر لوُں گا یا پھر تمہاری خاطر اپنی جان کی بازی لگا دُوں گا۔"

"تم بہت معمُولی آدمی ہو جمیل احمد خان ـــ" اِنکا تیوری چڑھا کر بولی۔ "تم نے اس وقت مجھے چھیڑ کر اچھا نہیں کیا۔ تمہیں معلوم تھا کہ میں اِس وقت شکنتلا کے خوُن سے اپنے وجُود کو تقویت دے رہی تھی۔ تم نے مجھے میرے شکار سے علیحدہ کر کے بہت بُرا کیا ہے۔ تم نے میرے آقا پر قاتلانہ حملہ کرتے وقت شاید یہ سوچا تھا کہ میں خون کے چٹخارے سے منہ موڑ کر یہاں نہ آؤں گی۔ مگر تم یہ کیُوں بھُول گئے تھے کہ تریبنی میرا آقا ہے اور میں اُس کی داسی ہُوں۔ اُس نے مجھے حاصل کرنے کے لئے کٹھن جاپ کیا ہے۔ اس کے اُوپر جب بھی کوئی ایسی بپتا آئے گی میں آ جاؤں گی۔ اگر اس کے پُکارنے پر میں نہ آتی تو دیوتا مجھ سے ناراض ہو جاتے اور خود میرا وجُود خطرے میں پڑ جاتا۔ کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ اگر تم نے میرے آقا کی طرف غلط نظروں سے دیکھا تو میں تمہیں عبرتناک حالات سے دوچار کر دُوں گی۔ جمیل احمد خان تمہیں سب کچھ بتا دیا گیا تھا۔"

اِنکا کی بے وفائی اور اُس کی بے مروّتی دیکھ کر میرا دِل خوُن کے آنسوُ رونے لگا۔ پھر بھی میں نے اُس کے سامنے ہاتھ باندھ کر گڑگڑاتے ہُوئے کہا:

"اِنکا تمہارے پُراسرار وجُود میں انسانی جذبوں کو محسُوس کرنے

کی کوئی قوت نہیں ہے۔ اگر تم کو میری حالت پر رحم نہیں آتا تو مجھے اپنے ہاتھوں سے مار ڈالو۔ میں اُف تک نہ کروں گا۔ تمہارے ہاتھوں جو موت مجھے نصیب ہوگی وُہ بھی مجھے عزیز ہے۔"

"مجھ سے کسی ہمدردی کی توقع مت کرو جمیل احمد خان"۔ انکا چمک کر نفرت سے بولی "تم نے میرے آقا کو دُکھ دیا ہے۔ تمہاری سزا موت بھی ہو سکتی ہے۔ مگر میں تمہیں صرف ایک ایسی سزا دُوں گی جسے تم ہمیشہ یاد رکھو گے اور پھر کبھی انکا کے آقا کو زیر کرنے کی جرأت نہ کر سکو گے۔"

میں گُنگ سا کھڑا انکا کو تصویرِ حیرت بنا دیکھتا رہا۔ اس وقت انکا کی آنکھوں میں میرے لئے ہمدردی کا کوئی جذبہ نہ تھا۔ وہ غیظ و غضب کے عالم میں میرے سر پر کھڑی مجھے خونخوار نظروں سے دیکھے جا رہی تھی۔ اس کے پنجوں کی چبھن میرے سر کی جلد میں شدید ہوتی جا رہی تھی۔ چند لمحوں تک وُہ اسی نفرت بھرے انداز سے مجھے تکتی رہی پھر بڑے ناگوار اور توہین آمیز لہجے میں بولی:

"جمیل احمد خان —— تم اپنا ایک ہاتھ پہلے ہی کھو چکے ہو۔ اب میں تمہیں تمہاری ایک آنکھ کی نعمت سے محرُوم کر دُوں گی۔ سمجھے۔ میں تمہاری ایک آنکھ کی بینائی چھین لُوں گی۔ یہ کم سے کم سزا ہے جو تمہیں دی جاتی ہے ..."

"نہیں انکا —— نہیں"۔ میں گڑگڑانے لگا۔ "میری طرف غور سے دیکھو انکا —— یہ میں ہوں۔ میرا نام جمیل احمد خان ہے۔ میں نے تمہاری خاطر متعدد بے گناہوں کا خون بہایا ہے۔ کیا تمہیں مجھ پر بالکل ترس نہیں آتا۔ میں تمہارے لئے اپنا سب کچھ لُٹا چکا ہوں۔ میں نے بہت کچھ کہا۔ گزری باتوں کو یاد دلایا۔ میں نے منتیں کیں مگر انکا حقارت سے بولی:

"جمیل احمد خان۔ گزری باتوں کو بھول جاؤ۔ میں ایک ایسی عورت ہوں اور داسیاں سوائے اپنے آقا کے اور کسی کو محبت کی نگاہ سے دیکھنا گناہ سمجھتی ہیں۔ میں تمہیں سزا دے کر آئندہ کے لئے تنبیہہ کر دینا چاہتی ہوں کہ تم میرے آقا سے ہمیشہ وفادار رہو ورنہ ——"

"انکا —— تم مجھے ایک ہی بار جان سے مار کیوں نہیں ڈالتیں"۔ میں نے انکا کا جملہ درمیان سے اُچکتے ہوئے کہا تو وہ مُنہ بنا کر بولی:

"وُہ بہادر ہوتے ہیں جمیل احمد خان جو صرف ایک بار مرتے ہیں۔ تم بُزدل ہو، احمق ہو خود غرض ہو۔ ایسے لوگ تو ہر روز جیتے مرتے ہیں"۔

میں ہاتھ جوڑ کر انکا کی منت و خوشامد کرتا رہا لیکن اُس پر میری کسی بات کا کوئی اثر نہ ہُوا۔ اس کے نفرت انگیز لہجے میں اور شدت آگئی وُہ سر سے پھُدک کر میرے شانوں پر آگئی۔ میں سہمی سہمی نظروں سے اُس کو دیکھتا رہا۔ مجھ میں اتنی ہمت بھی نہ تھی کہ اسے اپنے شانوں سے جھٹک دیتا۔ اس کی خونخوار نظروں میں انتقام کے شعلے بھڑک رہے تھے۔ پھر اُس نے اپنا نازک ہاتھ اُٹھایا۔ اس کی انگلیوں کے ناخن نوکیلے نشتر کی طرح تھے۔ اس کا ہاتھ آہستہ آہستہ میری سیدھی آنکھ کی طرف دراز ہوتا رہا۔ میں اس پُراسرار اور حیرت انگیز منظر کو کسی خاموش تماشائی کی طرح دیکھتا رہا۔ یُوں جیسے میں اس وقت عملِ تنویم کے زیرِ اثر تھا۔ اُس کے ہاتھ کی لمبائی پُراسرار طور پر بڑھتی رہی۔ اس کی انگلیاں اور ناخن بھی بتدریج بڑے ہوتے گئے۔ مجھے شریانوں میں اپنا خون منجمد ہوتا محسُوس ہو رہا تھا لیکن میں کچھ کہنے سے قاصر تھا۔ نہ جانے وہ کون سی غیر مرئی قوت تھی جس نے میرے اعصاب کو جکڑ کر مضمحل کر دیا تھا۔ پھر میں اس وقت اپنی کربناک چیخ کو ضبط نہ کر سکا جب میں نے اپنے سر پر کوئی چٹان گرتے ہوئے محسُوس کی۔ یہ انکا کے بڑھے ہوئے ہاتھ کی ضرب تھی۔ مجھے شدید تکلیف کے ساتھ ایسا لگا جیسے میری آنکھ اُبل پڑی ہو۔ اس کے بعد میرے ذہن نے میرا ساتھ چھوڑ دیا۔ مجھے بس اِس قدر یاد ہے کہ میں لڑکھڑا کر نیچے کی طرف جھکتا چلا گیا تھا۔



مجھے یاد نہیں کہ میں کتنے دنوں بے ہوش رہا۔ بہرحال مجھے اتنا یاد ہے کہ جب میرا ذہن جاگا تو اسپتال کے ایک بستر پر پڑا ہُوا تھا۔ ایک آنکھ پر پٹی بندھی ہُوئی تھی۔ جب میری آنکھ کھُلی تو مجھے دَرو دیوار دھُندلے دھُندلے نظر آئے۔ میں نے گھبرا کر اپنی آنکھ پر ہاتھ رکھا کیا واقعی میری ایک آنکھ جاتی رہی۔ میں نے عالمِ وحشت میں دُوسری آنکھ کی پٹیوں کو نوچنا شروع کر دیا۔ میری اس دیوانگی کو دیکھ کر سفید لباس میں ملبوس ایک خوبصورت نرس میرے سرہانے آئی اور میرے ہاتھ کو نرمی سے روکتے ہوئے شیریں لہجے میں بولی:

"نہیں نہیں جمیل صاحب ایسا نہ کیجیے۔ خُدا کا شکر ہے کہ آپ ہوش میں آگئے۔ ڈاکٹروں نے آپ کی زندگی کے لئے جی جان سے کوشش کی ہے۔ یقیناً آپ کو دُوسری زندگی ملی ہے۔ اب ہم آپ سے

مٹھائی کھائیں گے۔ واقعی بڑا خطرناک حادثہ تھا۔"

میں نے نرس کی بات کا جواب دینے کے بجائے اپنا ہونٹ دانتوں تلے بھینچ لیا۔ میں اپنا دل مسوس کر رہ گیا۔ میری ایک آنکھ بھی جاتی رہی۔ نرس مجھے نئی زندگی کی نوید دے رہی ہے۔ کاش وہ میرے مرنے کا اعلان کرتی۔ انکانے میری ایک آنکھ کی روشنی مجھ سے چھین لی۔ انکانے میرا ہاتھ مجھ سے چھین لیا۔ سب کچھ میرے پاس سے چلا گیا۔ اب یہ نرس مجھے زندگی کے طعنے دے رہی ہے۔ مجھ سے یہ مذاق برداشت نہ ہو سکا۔ میری آنکھ میں آنسو آ گئے۔ شفیق نرس کو شاید مجھ پر ترس آ گیا۔ وہ اپنے رومال سے میرے آنسوؤں کو پونچھنے لگی۔

"جمیل صاحب، دل چھوٹا نہ کیجیے۔ مجھے افسوس ہے آپ کی ایک آنکھ روشنی سے محروم ہو گئی۔ مگر آپ کی ایک آنکھ تو بچ گئی۔ یہ بھی غنیمت ہے۔ زندگی بچ گئی۔ یہی بہت ہے۔ ایک آنکھ سہی، آپ اس سے سب کچھ دیکھ تو سکتے ہیں۔"

"ن رس۔ نرس۔" میرے منہ سے بمشکل نکلا۔ اس کے شفقت بھرے لہجے سے مجھے نرگس یاد آ گئی۔ کاش اس وقت وہ میرے پاس ہوتی۔ میرا تو کوئی بھی نہ رہا۔ نرس کے اس مشفقانہ انداز پر میرے ضبط کا بندھن ٹوٹ گیا۔ میں بہت دیر تک ہچکیوں سے روتا رہا۔

نرس میری آہ و زاری سے بہت متاثر ہوئی۔ وہ ایک معصوم اور مغموم لڑکی تھی۔ شاید اس پر بھی کچھ غم ٹوٹے تھے۔ اس نے میرا سر اپنی گود میں رکھ لیا اور اس وقت تک رونے دیا جب تک میرے پاس رونے کے لئے آنسو بھی نہ رہے۔

جب میں اپنے دل کا غبار اس کی گداز آغوش میں نکال چکا تو میں نے اس سے دبی زبان میں پوچھا:

"مجھے یہاں کون لایا تھا؟"

"تربینی جی ۔۔۔" نرس نے نہ جانے کیوں شرمیلے انداز میں نظریں نیچی کرتے ہوئے کہا۔ "بڑے اچھے آدمی ہیں۔ آپ کے علاج پر انہوں نے پانی کی طرح روپیہ بہایا ہے۔ وہ آپ سے بڑی محبت کرتے ہیں۔"

میں نے تربینی کا نام سنا تو نفرت سے منہ دوسری سمت کر لیا۔ نرس ہمدردیوں کا اظہار کر کے کچھ دیر بعد چلی گئی تو میں تربینی کے بارے میں سوچنے لگا۔ ایک بار وہ مجھے پولیس کے چنگل سے بھی نجات دلا چکا تھا اور اب پھر وہ مجھے زندہ رکھنے کے لئے کوشاں تھا۔ آخر کیوں؟

وہ مجھ سے کیا کام لینا چاہتا ہے؟ کیا اسے یہ علم نہیں کہ مجھے جب بھی موقع ملا میں اسے موت سے ہمکنار کرنے کی کوشش ضرور کروں گا۔ وہ مجھ پر ترس کس لئے کھا رہا ہے؟ کیا انکانے اس سے میری سفارش کی ہوگی۔ مگر کیوں؟

میرا ذہن ان گتھیوں کو سلجھانے کی ناکام کوشش کرتا رہا میں کسی آخری نتیجے پر نہ پہنچ سکا۔ بہرحال میں نے اپنے طور پر یہ طے کر لیا تھا کہ میں تربینی کو موت کے گھاٹ اتارنے کی کوشش میں لگا رہوں گا یا پھر خود اپنے ہاتھوں سے اپنی زندگی کو ختم کر لوں گا۔ میرے لئے اب اس دنیا میں کیا کشش باقی رہ گئی تھی۔ اپنی زندگی کی قیمتی چیزوں کے جانے کے بعد اس دنیا سے کیا واسطہ رہ گیا تھا اور پھر جس شخص نے مرنے کی ٹھان لی ہو اس کے آگے خطرے کیا حقیقت رکھتے ہیں۔

ہوش میں آنے کے بعد ایک ہفتے تک میں ہسپتال میں رہا۔ اس عرصے میں ڈیوٹی پر متعینات نرس اور دوسرے ڈاکٹر مجھ سے بڑی شفقت اور محبت سے پیش آتے لیکن ابھی تک میں نے تربینی کو ایک بار بھی نہیں دیکھا تھا۔ ممکن ہے وہ اس وقت آتا ہو جب میں سوتا ہوں۔ بہرحال میں نے نرس سے بھی اس کے بارے کچھ دریافت کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ اگر وہ کبھی از خود تربینی کا تذکرہ کرتی، تو میں بڑی خوبصورتی سے بات بنا دیتا۔

چوتھے روز شام کی چائے پینے کے بعد میں نرس کے فراہم کردہ رسالے کی ورق گردانی کر رہا تھا کہ دروازے پر کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ میں نے یہ سوچ کر کہ نرس دوا پلانے آئی ہوگی اس طرف کوئی توجہ نہیں دی لیکن دوسرے ہی لمحے جب تربینی کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی تو میں چونکے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ میرے قریب کھڑا پوچھ رہا تھا۔

"اب تمہارے مزاج کیسے ہیں، جمیل احمد خان میرا خیال ہے اب تم تندرست ہو گئے ہو۔"

میں نے تربینی پر نظر ڈالی اور اسے اپنی سمت تحقیر آمیز نظروں سے گھورتا دیکھ کر مجھے بستر پر لیٹنا بھاری ہو گیا۔ کاش میرے بس میں ہوتا اور میں اسی وقت اٹھ کر تربینی داس کا قصہ ہمیشہ کے لئے تمام کر دیتا۔ میں نے تربینی کے سوال کا کوئی جواب نہ دیا تو وہ زہرخند سے بولا:

"خان صاحب ۔۔۔ آپ کو ہسپتال میں کوئی تکلیف وغیرہ تو

نہیں ہُوئی ۔"

میں اس بار بھی تربینی کی بات کو خُون کے گھونٹ پی کر طرح دے گیا۔

"کیا بات ہے خان صاحب ۔ آپ بہت خاموش ہیں ۔ جواب دیجیے نا ___ ایسی بھی کیا ناراضی ۔"

تربینی کے اس طنز کو میں برداشت نہ کر سکا میں نے اُس کی آنکھوں سے آنکھیں چار کرتے ہوئے خونخوار لہجے میں پُوچھا،

"تربینی..... تُم آخر مجھ سے چاہتے کیا ہو؟"

"فی الحال تو میں آپ کی خیریت بھگوان سے نیک چاہتا ہُوں۔" تربینی مجھ پر الفاظ کے نشتر چبھوتے ہُوئے بولا "پرمیشور کی بڑی کرپا ہے جو آپ کی ایک آنکھ باقی بچ گئی ۔"

"تربینی ___" میں نے اضطراب سے کہا "تم انسان نہیں بلکہ راکھشس ہو ۔"

"جمیل احمد خان ___ برداشت کی حد ہوتی ہے ۔" اچانک تربینی کے چہرے کے تیور کرخت ہو گئے ۔ وہ مجھے حقارت سے گھور کر بولا "آنکھ اور ہاتھ چلا گیا ہے ۔ اب اپنی ایک ٹانگ بھی کٹانا چاہتے ہو ۔ سوچ لو ۔ اب اس کا نمبر ہے ۔"

"حالات نے مجھے بے بس ضرور کر دیا ہے تربینی داس مگر اتنا یاد رکھو کہ میرے اندر تھوڑی بہت غیرت ضرور ہے ۔ میں تمہارا دشمن نمبر ایک ہوں اور جب بھی موقع ملے گا تمہارا قصّہ اس دُنیا سے پاک کرنے کی کوشش کروں گا ۔ تمہارے ساتھ اَنکا ہے تربینی ۔ یہ مت بھُولو ۔ تم خواہ کسی شکتی سے کام لو مگر مجھے تم کبھی اپنا غلام نہیں بنا سکتے ۔ میں تمہیں مرا ہُوا دیکھنا چاہتا ہُوں سمجھے ۔" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کڑک کر جواب دیا تو تربینی مجھے یُوں گھورنے لگا جیسے اُسے میری دماغی صحت پر شبہ ہو رہا ہو ۔ کچھ دیر اُس کی یہی حالت رہی ۔ پھر بولا ۔

"جمیل احمد خان ___ دھیرج رکھو ۔ ذرا شانتی سے کام لو ___ اس بات کو مَن سے نکال پھینکو کہ تم مجھ سے کبھی نجات پا لو گے ۔ اب ہمارا تمہارا ساتھ جنم جنم کا ہے ___ جب تک میں نہ چاہوں گا تم مر بھی نہیں سکتے ۔ آنے والا سمے تمہیں بتلائے گا کہ میں کتنی مہان شکتی کا مالک ہوں ۔"

"انکا کو درمیان سے ہٹا دو پھر میں تمہیں بتا سکتا ہوں کہ کون کتنے پانی میں ہے۔" میں نے بھی بگڑے ہوئے تیوروں سے جواب دیا۔ "انکا کی نسبتی کے ساتھ تم میرا مقابلہ کیوں کرتے ہو۔ بہرحال یہ خیال رکھو کہ جب انسان کو زندگی سے کوئی لگاؤ نہ رہے تو پھر اسے موت کی بھی کوئی فکر نہیں رہتی۔ مجھے انکا کی بھی پرواہ نہیں ہے۔"

"یہ اسپتال ہے خان صاحب، میں تم سے اپنی کوٹھی پر باتیں کروں گا۔" تربینی نے حقارت سے کہا۔

"میں اب تمہاری کوٹھی پر پیشاب بھی کرنا پسند نہیں کروں گا۔" تربینی کے چہرے پر خون کی تمازت پھیل کر گہری ہوتی چلی گئی۔ اس کے تیور بتا رہے تھے کہ وہ اس وقت شدید غصے کے عالم میں ہے۔ چند لمحات وہ اسی کیفیت سے دوچار رہا پھر دانت پیس کر بولا۔

"میں دیکھوں گا کہ تم کتنے مرد ہو۔" پھر اس سے پیشتر کہ میں اس کی بات کا کوئی جواب دیتا وہ مجھ پر نفرت انگیز نظریں ڈالتا ہوا کمرے سے باہر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد بھی میں دیر تک اس کے بارے میں سوچتا رہا پھر میں نے اپنے ذہن کو جھٹک کر رسالہ دوبارہ اُٹھایا اور اس کی ورق گردانی کرنے لگا۔ آٹھ بجے کے بعد دوسری ڈیوٹی والی نرس آگئی تو میں نے اس سے دریافت کیا کہ مجھے کب تک اسپتال سے رخصت ملے گی۔ نرس پتا کرنے باہر چلی گئی۔ کچھ دیر بعد اس نے واپس آکر مجھے بتایا کہ میری چھٹی کل صبح کر دی جائے گی۔ میں نے نرس کا جواب سن کر ایک سرد آہ بھری تو اس نے تعجب سے دریافت کیا۔

"کیوں۔ کیا آپ کو یہاں سے جانے کی خوشی نہیں ہے؟"

"تم ان باتوں کو نہ سمجھ سکو گی۔ نرس جاؤ اپنا کام کرو۔"

نرس چلی گئی تو میری بے چینی اور بڑھ گئی میں سوچنے لگا کہ اسپتال سے رخصت ہو کر کہاں جاؤں گا میرے پاس سر چھپانے کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ تربینی کے پاس جانے سے پیشتر میری گزر اوقات بھیک پر تھی میں اب بھی بھیک مانگ کر زندگی گزارنے کی ہمت رکھتا تھا لیکن میری پہلی خواہش یہ تھی کہ میں پونا سے فوری طور پر رخصت ہو جاؤں اور کچھ عرصے باہر رہ کر حالات کو سدھارنے کی کوشش کروں اور اس کے بعد پھر تربینی کے مقابلے پر آؤں، میری سوچوں کے زاویے ہر لمحہ بدلتے رہے۔ کبھی میں سوچتا کہ کیوں نہ انکا کے تصور کو ہمیشہ کے لئے ذہن سے نکال پھینکوں۔ کبھی میرا دل مجھے مشورہ دیتا کہ میں اسپتال سے تھوڑا سا زہر چرا کر پی لوں اور ابدی نیند سو جاؤں۔ میرا ضمیر مجھے ملامت کرتا اور یہ یقین کرانے کی کوشش کرتا کہ میں عورت نہیں، مرد ہوں۔ مرد! جو آہنی چٹانوں سے بھی ٹکرا جانے کی ہمت رکھتا ہے۔ کبھی میرا ذہن مجھے مشورہ دیتا۔ "جمیل ذہانت اور دوراندیشی سے کام لئے بغیر تم کچھ نہ کر سکو گے اگر کچھ کرنا چاہتے ہو تو تین باتوں کا خیال رکھو، تمہاری نظر عقاب جیسی ہونی چاہئے تاکہ تم زمین کی گہرائیوں کا سینہ بھی چاک کر سکو۔۔۔۔ تمہارا حوصلہ کسی شیر کی طرح بلند ہونا چاہئے اور سوچنے کا انداز لومڑیوں جیسا ہونا ضروری ہے ان باتوں کے بغیر تم کبھی کامیاب نہ ہو سکو گے۔"

میں نے ذہن کے اس مشورے کو قبول کر لیا۔ میرے لئے ضروری تھا کہ اب میں ایک ایک قدم پھونک پھونک کر اٹھاؤں لیکن ایک مسئلہ ابھی تک مجھے پریشان کر رہا تھا کہ میں اسپتال سے رخصت ہو کر کہاں جاؤں، میں بہت دیر تک اسی مسئلے پر غور کرتا رہا لیکن کوئی حتمی فیصلہ نہ کر سکا۔ تھکے ہوئے اعصاب کو دھوکا دینے کی خاطر میں نے سرہانے رکھے ہوئے رسالے کو اُٹھا کر اسے یونہی اُلٹنا پلٹنا شروع کر دیا میرا جی رسالے میں نہیں لگ رہا تھا۔ اپنی کہانی مجھے یاد آ رہی تھی۔ میرا پورا ماضی میرے سامنے تھا۔ میرے سامنے میرے اوپر گزرے ہوئے واقعات کا ایک بھیانک سلسلہ تھا۔ میں نے ماضی میں جھانک کر دیکھا تو مجھے جھرجھری آ گئی۔ میں کن عجیب و غریب واقعات و حالات سے دوچار ہوا تھا۔ اور اپنی زندگی کے نازک لمحے کے عتاب میں تھا۔ کچھ دیر پہلے میں اپنی نظر کو عقاب کی نظر، اپنے حوصلے کو شیر کا حوصلہ اور اپنے دماغ کو لومڑی کے دماغ کی مثال دے کر زندہ رہنے کا عزم پیدا کر رہا تھا۔ مگر مجھے معلوم تھا کہ غیر معمولی قوتوں کے مقابلے میں میرا یہ عزم بے کار ہے۔ یہ خود فریبی ہے، میں کیوں زندہ رہوں، کس کیلئے زندہ رہوں؟ انکا میرے پاس آنے سے رہی۔ میں مر کیوں نہ جاؤں ہاں اب یہی بہتر ہے کہ میں مر جاؤں۔

مرنا کس قدر مشکل ہے اس کا اندازہ مجھے پہلی بار ہوا جب اسپتال میں روشنیاں کم ہو گئیں اور نرس مجھے شب بخیر کہہ کر رخصت ہو گئی تو میں نے خود کو موت کے لئے آمادہ کرنا چاہا۔ میں نے اپنے

کمرے کی کھڑکی سے باہر جھانک کر دیکھا۔ بیرونی راہداری میں سناٹا تھا۔ میں نے اپنے اوپر ایک چادر ڈالی اور آہستہ سے دروازہ کھول کر چوروں کی طرح اسے بند کرتا ہوا باہر آگیا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ دواؤں کا کمرہ کون سا ہے لیکن اسپتال میں اُسے تلاش کرنا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ میں نے تین چار کمرے آہستگی سے عبور کر لیے مگر چھٹے یا ساتویں کمرے کے دروازے پر اچانک میرے قدم جیسے من من بھر کے ہو گئے۔ میں ٹھٹک کر رک گیا۔

"کون ہے۔" ایک ڈاکٹر نے مجھے آواز دی" کہاں جا رہے ہو؟"

"میں۔ میں ایک مریض، کمرہ نمبر ۹ کا مریض جناب، جمیل احمد خاں جناب" میں نے گھگھیاتے ہوئے اس طرح جواب دیا جیسے مجھے چوری کرتے ہوئے پکڑ لیا گیا ہو۔

"جمیل احمد خاں اوہ" ڈاکٹر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ کیا بات ہے خاں صاحب، کیا کچھ تکلیف ہے؟"

"جی، جی! ڈاکٹر صاحب میرے پیٹ میں اچانک درد اُٹھا ہے نرس سامنے نہیں تھی۔ اس لیے میں کمرے سے باہر چلا آیا۔ ڈاکٹر صاحب ازراہ کرم مجھے کوئی دوائی دیدیں، شدتِ درد سے میں مرا جا رہا ہوں۔" میں نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا۔

"یہ نرس کہاں گئی۔ کم بخت سو جاتی ہے" ڈاکٹر بڑبڑاتے ہوئے بولا۔ "میرے ساتھ آؤ۔ کیا تکلیف زیادہ ہے؟"

"جی ہاں بہت زیادہ۔ بس دم نکلا جا رہا ہے۔"

"اوہ۔ خیر اِدھر آؤ۔ اس کا نام رام دیال تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ ایک نیک آدمی ہے۔ ڈاکٹر نے سامنے کے ایک کمرے کی طرف اشارہ کیا۔ میں اس کے ساتھ کمرے میں داخل ہو گیا۔ میں نے سراسیمگی سے کمرے کے چاروں طرف نظر دوڑائی خوش قسمتی سے وہاں میری مطلوبہ دوا مجھے نظر آگئی اب صرف اتنی بات رہ جاتی تھی کہ میں ڈاکٹر کی نظروں سے بچ کر کسی طرح اسے حاصل کر لوں، ڈاکٹر نے مجھے ایک بڑی میز پر لٹا کر میرے پیٹ کی حالت کو دیکھا۔ وہ مجھ سے درد کے بارے میں استفسار کرتا رہا اور میں اِدھر اُدھر کے جوابات دیتا رہا۔ میں اسے جواب دے رہا تھا لیکن میری نظر دواؤں کی الماری کی طرف تھی۔ بالآخر اس نے مرض کی نوعیت کو سمجھتے ہوئے مجھے ایک مکسچر بنا کر پلا دیا۔ میں نے بغیر کسی جھجک کے اُسے پی لیا۔ میں تو اس سے زیادہ خطرناک چیز لینے والا تھا۔ یہ کیا چیز تھی۔ جب ڈاکٹر رام دیال ہاتھ دھونے بیسن کی طرف مڑا تو میں نے اس کی الماری سے زہریلی دوا کی شیشی بہت سرعت اور مہارت سے اُٹھائی اور اسے چادر میں چھپا کر ڈاکٹر کو شب بخیر کہا اور دعائیں دیتا ہوا رخصت ہو گیا۔

مجھے خوب یاد ہے کہ اپنے کمرے میں آ کر مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے میں نے ایک زبردست مہم سر کی ہے۔ میں نے سکون کے ساتھ دوا کی شیشی نکالی۔ اور کھڑکی کو بند کیا۔ بڑے بلب کو آف کیا۔ ایک لمحے میں مجھے بہت سی چیزیں یاد آئیں، میری ماں، نرگس، انکا۔ تربینی۔ اور میری پوری زندگی لمحوں میں میرے سامنے سے گزر گئی میں نے اپنے پلنگ کے قریب رکھی ہوئی الماری سے آئینہ نکالا، اور اپنی صورت دیکھی۔ میرے چہرے پر بلا کا عزم تھا۔ آئینے میں اپنی شکل دیکھ کر میں مسکرا دیا۔ "جمیل احمد خاں" میں نے آئینے میں اپنی تصویر کو مخاطب کیا۔ "لو اب تمہارا اختتام قریب ہے، بہت دُنیا دیکھ لی، موت تمہیں ایک دن ضرور آنی تھی، چلو کچھ دن پہلے ہی اب ہنس کر موت کا جام پیو۔" اپنی شبیہ سے گفتگو کر کے میں نے ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ کبھی میرے اُوپر رقت طاری ہوئی کبھی میں شدید اداس ہو گیا۔ کبھی میں نے حقارت سے کھڑکی کے دروازے کو دیکھا۔ پھر اچانک مجھ پر قبر کا خوف غالب آگیا۔ اندھیرا۔ میں نے زہر کی شیشی کو خود سے دور کیا۔

مگر "یہ اندھیرا۔ قبر کا یہ اندھیرا تو ہر شخص کا مقدر ہے اس سے کیوں گھبراہٹ کیا خوف نہیں نہیں میرے لیے موت بہتر ہے" میں نے آخری بار آئینے میں اپنی شکل دیکھی، جمیل احمد خاں کا بدنما چہرہ میرے سامنے تھا۔ پھر میں نے شیشی کا ڈھکن کھول دیا۔ میری موت کے بعد کیا ہو گا۔ اسپتال والوں سے پوچھ گچھ، تربینی سے پوچھ گچھ۔ ارے ارے کیا مزہ آئے گا۔ تربینی سے پوچھ گچھ ہو گی۔ مگر میں نہ ہوں گا۔ میں تو مر جاؤں گا۔ ٹھیک ہے، مجھے مر ہی جانا چاہیے۔ مگر میں ایک طرح تربینی کو پھنسا سکتا ہوں اچانک ایک خیال میرے ذہن میں آندھی کی طرح آیا۔ میرے پاس قلم نہیں تھا۔ باہر جا کر میں نے ڈاکٹر رام دیال سے قلم حاصل کیا اور لکھنے بیٹھ گیا۔ تربینی کے سیاہ کارنامے، انکا کے چوٹ کے بارے میں مکمل تفصیل، اور اپنی جبریہ خودکشی کا احوال۔ رات کے دو بجے تک میں جو کچھ مجھے یاد آیا۔ حوالوں کے ساتھ لکھتا رہا کہ پولیس کو ہی

طرح تربینی کو اپنے زرغے میں لے لیے میں لکھتا رہا۔ انکا کے پُراسرار وجود کے حیرت انگیز واقعات اور وہ سب کچھ جو میں اس مختصر عرصے میں لکھ سکتا تھا۔ جب میں نے ایک طویل خط مکمل کر لیا تو اس پر ایک نظر ڈال کر اطمینان کا سانس لیا اسے اپنے سرہانے رکھا۔ اور زہر کی شیشی اپنے ہونٹوں سے لگا لی۔

مگر عین اس وقت جب میں زہر آلود شیشی انڈیل کر اس دُنیا سے اپنا رشتہ منقطع کرنا چاہتا تھا۔ میرے سر پر ایک دھماکا ہوا۔ انکا کے عاروں پنجوں کی چبھن تیز ہو گئی شیشی میرے ہاتھ سے گر گئی اور فرش پر پھیل گئی۔ میں نے چیخنا چاہا مگر میری آواز میرے حلق میں دب گئی۔ میں نے بدقت تمام کہا۔

"انکا۔ مجھے مرنے دو۔ میں موت چاہتا ہوں۔"

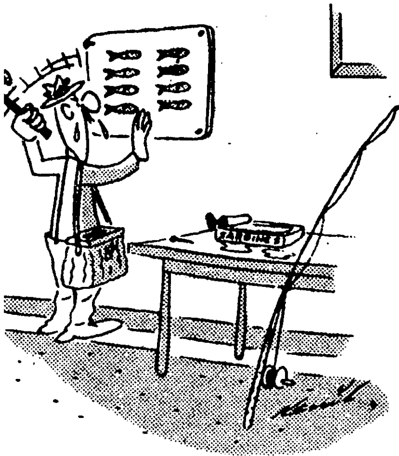
جواب میں انکا نے میرے سر کو اپنے پنجوں سے اتنی تیزی سے نوچا کہ میں اپنے حواس کھو بیٹھا۔ آخری الفاظ جو میں سُن سکا وہ یہ تھے۔ انکا کہہ رہی تھی۔ "جمیل احمد خاں تم آقا کی مرضی کے بغیر نہیں مر سکتے۔"

دوسری صبح میری آنکھ کھلی تو سب سے پہلے میری نظر جس پر پڑی وہ تربینی داس تھا۔ تربینی کو دیکھتے ہی میں نے یہ سوچ کر کہ غالباً وہ اسپتال سے مجھے اپنے گھر لے جانے کے لئے آیا ہے بڑی سنگدلی سے سرد لہجے میں کہا۔

"تربینی جی۔ تم نے یہاں آ کر بیکار زحمت کی، میں کل ہی تم سے کہہ چکا تھا کہ میں اب تمہارے ساتھ نہیں رہوں گا۔"

"اور میں نے بھی کہا تھا کہ میں دیکھوں گا تم کتنے مرد ہو" تربینی نے غصیلی آواز میں جواب دیا پھر نفرت سے کہا۔ "تم میرے ایک ادنیٰ خادم کی حیثیت سے اس وقت دوبارہ میرے قدموں میں پڑے ہو۔ تم نے خود اسپتال کے عملے سے اس بات کی درخواست کی تھی کہ تمہیں میری عالیشان کوٹھی تک پہنچا دیا جائے۔"

"انکا"۔ میرے ذہن میں ایک بار پھر انکا کا خوفناک تصور اُبھر آیا۔ انکا جو پُراسرار اور حیرت انگیز قوتوں کی مالک ہے جس کے لئے ہر ناممکن کو ممکن بنا دینا بہت آسان بات ہے۔ یقیناً انکا ہی نے میرے سر پر مسلط ہو کر مجھے وہ بیان دینے پر اُکسایا ہو گا۔ میری کیفیت اس وقت کسی ایسے شکاری سے مختلف نہ تھی جس نے شکار کو پھانسنے کی



خاطر کوئی جال بچھایا ہو اور اندھیرے میں خود ہی اس میں پھنس گیا ہو۔ میں نے نظریں گھما کر کمرے کا جائزہ لیا تو تربینی کی بات کی تصدیق ہو گئی۔ میں اس وقت اسی کی کوٹھی کے سرونٹ کوارٹر میں پڑا ہوا تھا۔ اس وقت اپنی بے بسی اور بے کسی کا احساس مجھے اتنی شدت سے ہوا کہ غیر اختیاری طور پر میری آنکھیں نمناک ہو گئیں۔

"کیا سوچ رہے ہو خان صاحب کیا پھر مجھے مارنے کا کوئی خطرناک منصوبہ بنا رہے ہو؟" تربینی نے میرا مذاق اڑاتے ہوئے کہا۔ میں تربینی کو رحم طلب نظروں سے دیکھنے کے سوا کچھ اور نہ کہہ سکا۔

"تربینی۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے راستے سے ہمیشہ کے لئے علیحدہ ہو جائیں۔"

"یہ دھیان تمہیں بہت دیر میں آیا ہے جمیل احمد خاں۔ ویسے مجھے افسوس ہے کہ اب تم ایسی صورت اختیار کر چکے ہو کہ دیالو لوگ تمہیں بھکشا دینے سے منہ نہیں موڑیں گے کیسی رہے اگر تم لنگڑے بھی ہو جاؤ۔ ہر شخص تم پر دیا کرنے کو تیار ہو جائے گا۔"

"تربینی تم۔"

"تربینی نہیں آقا یا سرکار کہو" ٹنٹے واحد تو ہے تربینی گرج کر بولا۔ "اگر تم نے پھر گستاخی کی تو زبان کھینچ لوں گا۔" میں نے بہت ضبط کیا اور آنکھیں بھینچ کر اور مٹھیاں بند کر کے خود کو قابو میں کیا۔ اس کے سوا اور

میں کر بھی کیا سکتا تھا۔ تربینی جی بھر کر مجھے بُرا بھلا کہتا رہا اور میں دل پر جبر کیے سب کچھ سنتا رہا۔ تربینی چلا گیا تو میری آنکھوں کے پیمانے چھلک اُٹھے میں اس روز دھاڑیں مار مار کر رویا لیکن کسی نے میری خبر نہ لی۔



مجھے تربینی کی کوٹھی پر آئے اٹھائیس روز گزر چکے تھے اس عرصے میں میری صحت بھی خاصی ٹھیک ہو چکی تھی۔ مجھ پر سوائے کوٹھی سے باہر جانے کے اور کسی بات کی پابندی نہ تھی لیکن میں تمام دن اپنے کمرے میں چھپا بیٹھا رہتا۔ شام کو محض چند منٹوں کے لئے باہر نکلتا اور پھر اپنے کمرے میں آکر بند ہو جاتا۔ ایک آنکھ کھنڈر کی صورت میں تبدیل ہو جانے سے میری صورت بے حد مکروہ اور بھیانک معلوم ہوتی تھی، آئینے میں اپنا عکس دیکھ لیتا تو ڈر جاتا تھا۔ غرضیکہ میں نے خود کو حالات کے دھارے پر ڈال دیا تھا بس کسی نہ کسی طرح زندگی کے دن پورے ہو رہے تھے۔ تربینی کے ملازموں کو میری حالت پر افسوس ضرور تھا لیکن اتنی ہمت کس میں تھی جو کھل کر اس کا اظہار کرتا تربینی کی سخت گیر طبیعت کا اندازہ سب ہی کو تھا۔ میری کیفیت دیکھ کر انہیں عبرت بھی ہو گئی تھی۔

اکثر میں تنہا بیٹھا اپنے حالات پر غور کرتا تو دل مسوس کر رہ جاتا۔ ماضی یاد آتا تو میں بے اختیار رو پڑتا۔ خاص طور پر ان دنوں مجھے نرگس بہت زیادہ یاد آتی تھی۔ ایک دن شام کو میں اپنے کمرے میں تنہا بیٹھا ان ہی خیالات میں مستغرق تھا کہ پٹیل نامی ایک ملازم نے اندر آکر کہا۔

"جمیل خاں، تمہیں سرکار کوٹھی میں بلا رہے ہیں"۔

میں پٹیل کو کوئی جواب دیئے بغیر خاموشی سے اُٹھا اور اس خیال سے کہ دیکھیں قسمت اب کیا گل کھلاتی ہے کمرے سے باہر آگیا۔ لان عبور کر کے کوٹھی کے اندر داخل ہوا۔ اپنے خیال میں کھویا کھویا تربینی کی خوابگاہ کے دروازے تک پہنچ کر میں نے دروازے پر آہستہ سے دستک دی۔ مجھے یقین تھا کہ کوئی ہنگامہ ضرور ہونے والا ہے۔ کوئی اور واقعہ۔

"کون۔ اندر سے تربینی کی بہکی ہوئی آواز سنائی دی۔

"سرکار۔ میں ہوں جمیل احمد خاں" میں نے کہا۔

"اندر آجاؤ"۔

میں نے لرزتے ہوئے ہاتھ سے دروازے کا ہینڈل گھمایا اور اندر داخل ہو گیا لیکن دوسرے ہی ثانیے میرا ذہن چکرا کر رہ گیا۔ مجھے کمرے کی ہر چیز گھومتی نظر آرہی تھی۔ میں پھٹی پھٹی نظروں سے اس عورت کو دیکھ رہا تھا جو تربینی کی گردن میں باہیں ڈالے بیٹھی تھی۔ سامنے گول میز پر شراب کے بھرے ہوئے جام اور بوتلیں رکھی ہوئی تھیں، تربینی کے ہونٹوں پر شیطانی مسکراہٹ کھیل رہی تھی مگر میری توجہ کا مرکز تو وہ عورت تھی جو نیم عریاں لباس میں تربینی سے لپٹی بیٹھی اس کے وجود میں گھل مل جانے کی کوشش کر رہی تھی، وہ عورت نازلی تھی۔ نازلی جو کبھی میری منظور نظر رہ چکی تھی اور جس نے نرگس کو مجھ سے چھڑایا تھا اس نے میرے ساتھ ایک شرمناک ڈراما کھیلا تھا۔ وہ اس وقت میرے سب سے بڑے دشمن کو داد عیش دینے میں مصروف تھی۔ خیر یہ تو اس کا کام تھا مگر نہ جانے اسے یہاں دیکھ کر مجھے دُکھ سا کیوں ہُوا۔

"نازلی۔ اِدھر دیکھو میری جان۔ دیکھو وہ تمہارے سامنے کون موجود ہے" تربینی نے نازلی سے کہا۔

نازلی نے پلٹ کر میری سمت دیکھا تو سہم کر وہ تربینی سے کچھ اور قریب ہو گئی پھر مجھے غور سے دیکھتے ہوئے بولی۔

"میرا خیال ہے کہ میں اس مکروہ شخص کو پہلے بھی کبھی دیکھ چکی ہوں۔ کیوں تربینی جی"۔

"ان کم بختے کا شبھ نام جمیل احمد خاں ہے کبھی یہ تمہارے اُوپر لٹو بھی رہ چکے ہیں"۔ تربینی نے نازلی سے میرا تعارف کراتے ہوئے زہرخند سے کہا پھر براہِ راست مجھ سے مخاطب ہو کر بولا "دیکھا تم نے نازلی کو۔ انہیں بہت دور سے بُلایا گیا ہے۔ تمہاری پسند بہت اچھی تھی خان صاحب"۔ اس نے مست آنکھوں سے نازلی کی طرف دیکھ کر مجھ سے کہا اور مجھے ہدایت کی "تم باہر ٹھہرو، میں تمہیں ابھی ایک خدمت کا موقع دوں گا۔ مجھے وشواس ہے کہ تم آج اس خدمت کو خوشی خوشی پورا کرو گے"۔

میں سمجھ چکا تھا کہ تربینی کس خدمت کی طرف اشارہ کر رہا ہے وہ نازلی کو روندنے کے بعد میرے حوالے کرنے کا اشارہ کر رہا تھا تاکہ میں اسے جان سے مار کر اس کا خون انکا کے وجود کو برقرار

رکھنے کے لئے فراہم کر سکوں تربینی کی بات سن کر میں خاموشی سے
پلٹ کر باہر آگیا۔ میں وقت میں دروازے سے باہر نکل رہا تھا۔
اس وقت نازلی کی کہی ہوئی ایک بات میرے کانوں سے ٹکرائی
اور پگھلے ہوئے سیسے کی طرح میرے دل کی گہرائیوں تک اترتی چلی
گئی۔ اس نے تربینی سے کہا تھا۔

" تربینی جی! تم نے اس مکروہ شکل والے کو اندر بلا کر میرا موڈ
خراب کر دیا۔ کیسا منحوس اور بھیانک لگ رہا تھا۔ توبہ۔ توبہ۔"

میں نے باہر آکر دروازہ بند کر دیا اور راہداری میں ٹہلنے لگا۔
میرے خون کی حدت آج پھر تیز ہو رہی تھی۔ میں نے طے کر لیا تھا کہ
آج میں نازلی کو بڑی اذیتناک موت ماروں گا۔ مجھے بڑی شدت سے
اس لمحے کا انتظار تھا جب تربینی اسے میرے حوالے کرے گا۔ اسی نازلی
کی وجہ سے میرا گھر برباد ہوا تھا۔ اور نرگس غلط فہمی کا شکار ہو گئی تھی۔

تقریباً دو گھنٹے بعد تربینی نے مجھے آواز دی تو میں لپک کر
کمرے میں داخل ہو گیا۔ اندر جو منظر مجھے نظر آیا وہ میرے جوش کو مزید
بھڑکانے کے لئے بہت تھا۔ تربینی صوفے پر نیم دراز تھا لیکن
نازلی اس کے قدموں کے قریب فرش پر پڑی واہی تباہی بک رہی
تھی۔ اس کا لباس تار تار تھا اور وہ اس کی ستر پوشی کے لئے قطعی ناکافی
تھا نازلی کی نظر مجھ پر پڑی تو اس بار وہ خائف ہونے کے بجائے
پاگلوں جیسے انداز میں ہنس کر بولی۔ "تم..... وہی ہو نا جو کبھی میرے
عاشق ہوا کرتے تھے لیکن آج۔ آج تم حقیر ہو۔ ایک دم حقیر اور
ذلیل۔ تم نے مجھے ایک بار پھنسایا تھا۔ اب تمہاری حالت عبرتناک ہے۔"

" جمیل احمد خان" تربینی مجھے مخاطب کر کے بولا "کیا تم آج
اپنے انتقام کی آگ کو اس کے خون سے ٹھنڈا کرتے ہوئے خوشی نہیں
محسوس کرو گے۔ چلو.... اٹھا لے جاؤ اسے"

نازلی بری طرح نشے میں دھت تھی لیکن تربینی کی بات
سن کر اس نے نظریں گھما کر اسے نفرت سے گھورا پھر وہ لڑکھڑاتی ہوئی
اٹھی لیکن قبل اس کے کہ وہ تربینی سے کچھ کہتی میں نے آگے بڑھ کر
اسے بالوں سے پکڑ لیا اور گھسیٹتا ہوا باہر لے آیا نازلی کربناک انداز
میں چلا چلا کر مجھے گالیاں دے رہی تھی لیکن میرے کان جیسے بہرے
ہو چکے تھے۔ میں نے اسے باہر لا کر گاڑی میں ٹھونس دیا اور ڈرائیور سے
گاڑی چلانے کو کہا۔ اس خیال سے کہ اس کے شور و غل کی آواز
گاڑی سے باہر نہ نکلنے پائے میں نے نازلی کے منہ پر اپنی گرفت
مضبوطی سے جما دی تھی۔ میرا ڈرائیور وہی تھا جسے میں نے ایک بار
موت کے قریب کر دیا تھا۔ اب وہ میرے اشاروں کا غلام تھا۔ وہ
سہما ہوا خاموش بیٹھا تھا غالباً میری جلاد صفتی سے مرعوب ہو چکا تھا۔

آدھے گھنٹے بعد گاڑی ایک ویرانے میں جا کر رکی تو میں نے
نازلی کو بیدردی سے گھسیٹ کر باہر نکالا۔ اس کے بعد میں نے جس
سفاکانہ طریقے سے اس کے جسم پر ضربیں لگائیں اس کا تصور آج
بھی میرے جسم کے تمام رونگٹے کھڑے کر دیتا ہے۔ اس کی کربناک چیخیں
آج بھی جب میرے کانوں میں گونجتی ہیں تو مجھے اپنا خون جما ہوا
محسوس ہونے لگتا ہے۔ وہ میرے سامنے زندگی کی آخری سانسوں
تک ہاتھ جوڑ کر رحم کی بھیک مانگتی رہی لیکن میں اس وقت تک اس
کے جسم پر خنجر برساتا رہا جب تک کہ اس کا جسم چھلنی کی صورت میں
تبدیل نہیں ہو گیا۔ میرا اپنا تمام لباس بھی خون سے تر بتر ہو رہا تھا مجھ
پر جنونی کیفیت طاری تھی۔ نازلی کو موت کے گھاٹ اتارنے کے بعد
میں اس پر نفرت کی نگاہ ڈالتا ہوا واپس آگیا۔ تربینی کی کوٹھی پر
پہنچ کر میں نے نہا دھو کر کپڑے تبدیل کئے۔ ان کپڑوں کو نذر آتش کیا
جن پر نازلی کے خون کے دھبے موجود تھے پھر اپنے پلنگ پر بے سدھ
ہو کر گر پڑا۔ اس روز مجھے اپنا ذہن بڑا ہلکا ہلکا محسوس ہو رہا تھا یوں جیسے
میرے سر سے کوئی وزنی بوجھ اتر گیا ہو۔



حالات کی ستم ظریفیوں نے مجھے اس قدر بے دست و پا کر دیا
تھا کہ وقت کے ساتھ سمجھوتا کرنے کے سوا کوئی اور کام نہ تھا۔ میں نے
خود کو اسی سانچے میں ڈھال لیا جس میں تربینی چاہتا تھا۔ پے در پے
ناکامیوں نے میرے ذہن کو قطعی مفلوج کر دیا تھا۔ اُنکا کے پراسرار وجود
کی موجودگی ہی میرے لئے ہر راہ فرار مایوس کن ثابت ہوئی۔ چنانچہ
میں تربینی کا غلام بنا رہا تھا جب بھی تربینی مجھے کوئی حکم دیتا میں بلا
کسی چون و چرا اس پر عمل کرتا۔ اس طرح تین ماہ اور گزر گئے۔ ان تین
مہینوں میں مجھے نازلی کے علاوہ تین اور ایسی عورتوں کو ٹھکانے
لگانا پڑا جو پہلے تربینی کی ہوس کا نشانہ بنیں پھر مجھے اُنکا کے وجود کو
برقرار رکھنے کے لئے ان عورتوں کا خون فراہم کرنا پڑا۔
پلونا میں ہر ماہ ہونے والے قتل کے واقعات نے پولیس کے

عملے کو بھی پریشان کر دیا تھا۔ ایک دو وارداتوں میں پولیس کے ماہر دماغ تربینی تک بھی پہنچے لیکن بے نیل و مرام واپس لوٹ گئے۔ انکا کی پراسرار قوت نے تربینی کو ہر موقع پر حیرت انگیز طور پر بچا لیا اور پولیس کو مجبوراً کاغذات کی خانہ پری کرنے کے لئے کسی بے گناہ کو تختہ دار تک لے جانا پڑا۔ میں جب بھی اخبارات میں اس قسم کی اطلاع پڑھتا خون کے گھونٹ پی کر چپ ہو جاتا تھا کہ جب تک انکا کا وجود تربینی کے قبضے میں تھا دنیا کی کوئی طاقت اس کا بال بیکا نہیں کر سکتی تھی، میرا یہ خیال تھا کہ میں تو اپنے دن گن گن کر پورے کر رہا تھا لیکن حالات نے کچھ ایسی کروٹ لی کہ میں دوبارہ انکا کو قبضے میں کرنے کے خواب دیکھنے پر مجبور ہو گیا۔

میں کچھ دنوں سے محسوس کر رہا تھا کہ تربینی ہر وقت کسی سوچ میں گم رہتا ہے۔ وہ تربینی جو کبھی مجھ سے سیدھے منہ بات نہ کرتا تھا اب مجھ سے ملنے کے لئے ملازموں کے کوارٹر تک آ جاتا تھا۔ میں تربینی سے ہمیشہ کھنچی نظروں سے ملتا تھا لیکن میں محسوس کر رہا تھا کہ وہ مجھ سے کوئی خاص بات کرنا چاہتا ہے جس کی وجہ سے وہ میرے پاس آتا تھا لیکن کوئی رکاوٹ ایسی ضرور تھی جس کی بنا پر وہ مجھ سے کچھ کہے بغیر واپس چلا جاتا تھا۔ میں نے کبھی تربینی سے اس کی بے چینی کی وجہ دریافت کرنے کی کوشش بھی نہیں کی۔

ان ہی دنوں ایک بار تربینی نے شوبھا نامی ایک خوبصورت لڑکی کو میرے حوالے کیا۔ میں حسب معمول اسے ایک نئے ویرانے میں لے گیا اور ایک سنگدل جلاد کی طرح اسے ٹھکانے لگا دیا۔ لیکن جب شوبھا کو موت کے گھاٹ اتار کر میں واپسی کے ارادے سے پلٹا تو ایسا محسوس ہوا جیسے انکا میرے سر پر آگئی ہو۔ میں نے عالم تصور میں سر کی جانب دیکھا تو میرا اندازہ غلط نہیں ثابت ہوا۔ انکا حقیقتاً میرے سر پر موجود تھی۔ بظاہر وہ اس وقت اچھے موڈ میں نظر آ رہی تھی لیکن میں نے دیدہ و دانستہ اس سے کوئی بات نہیں کی۔ گردن جھکا کر گاڑی کی سمت قدم اٹھایا تو انکا کی مترنم نسوانی آواز میری قوت سماعت سے ٹکرائی

"جمیل، اب تم واقعی راہ راست پر آگئے ہو۔ اگر اسی طرح تم میرے آقا کے اشارے پر چلتے رہے تو تمہیں کوئی مصیبت درپیش نہیں ہوگی۔"

"تمہارا شکار تمہارا منتظر ہے انکا۔ کیوں اپنا وقت ضائع کر رہی ہو؟ جاؤ اور شوبھا کے خون سے اپنے وجود کو تقویت دو۔ دیکھو تمہارا آقا میرے سر پر آجانے کی خبر سن کر کہیں تم سے ناراض نہ ہو جائے۔"

"جمیل، میرا آقا ناراض نہیں ہوگا۔ اور سمجھ لو کہ میں اس کی مرضی کے بغیر کوئی کام نہیں کرتی۔ ویسے میں تم سے خوش ہوں کہ تم میرے آقا کی بڑی خدمت کر رہے ہو اور میرے لیے میری غذا فراہم کرتے ہو جس کی میرے وجود کو سب سے زیادہ ضرورت ہے۔ میری مانو تو تم پریشان رہنے کے بجائے ہنسا بولا کرو۔ اب ایسا بھی کیا؟"

"میں نے خود کو حالات کے اوپر چھوڑ دیا ہے انکا۔" میں نے ایک سرد آہ بھر کر جواب دیا۔ "بہتر ہے کہ تم خوش رہنے اور ہنسنے بولنے کا مشورہ اپنے آقا تربینی داس کو دو جو آج کل اداس اداس اور کھویا کھویا رہتا ہے۔ مجھ سے اتنی ہمدردی کیوں؟"

"خوب" انکا نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ "اچھا تو اب تمہیں تربینی سے ہمدردی بھی ہوتی جا رہی ہے"

"تربینی کو مجھ سے زیادہ تمہاری ہمدردی کی ضرورت ہے" اس بار میں نے چل کر کہا۔ "میرا خیال ہے کہ تم آج کل اس کے لئے زیادہ جاندار لڑکیاں نہیں فراہم کر رہی ہیں"۔

"میں اپنے آقا کو دنیا کی ہر نعمت سے نواز سکتی ہوں جمیل" انکا نے سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے جواب دیا۔ "آج کل اس کی پریشانی کی وجہ خوبصورت لڑکیاں نہیں بلکہ کچھ اور ہے۔ ایک بار تم بھی ایسے ہی حالات سے دوچار ہو چکے ہو"

"میں سمجھا نہیں تمہارا اشارہ" میں نے انکا کو وضاحت طلب

نظروں سے دیکھا تو وہ بدستور سنجیدگی سے بولی۔
" وقت آنے دو۔ تم خود ہی سب کچھ جان جاؤ گے۔"
انکا مبہم الفاظ میں اپنا جملہ ادا کر کے میرے سر سے اُتر گئی۔
میں کچھ دیر گم سم کھڑا اس کے جملے کا مطلب اخذ کرنے کی ناکام کوشش کرتا رہا پھر تھکے ہوتے انداز میں لمبے لمبے قدم مارتا گاڑی تک گیا اور گھر واپس آ گیا۔ اس رات سونے سے پہلے میں نے ایک بار پھر انکا کے جملے کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کی مگر کوئی رائے نہ قائم کر سکا اور تھک ہار کر سو گیا۔

تین چار روز تک کوئی خاص بات نہیں ہوئی۔ میں حسب معمول دن بھر اپنے کوارٹر میں بند پڑا رہتا۔ شام کو طبیعت اُلجھنے لگتی تو تھوڑی دیر کے لئے کوارٹر سے باہر نکل آتا۔ ایک روز میں شام کو اپنے کوارٹر کے سامنے ٹہل رہا تھا کہ تربینی آ گیا۔ اس روز وہ مجھے کچھ زیادہ ہی پریشان نظر آ رہا تھا۔ مجھے کوارٹر میں چلنے کو کہا تو میں چپ چاپ اس کے ہمراہ اندر آ گیا۔ کچھ دیر تک ہمارے درمیان بالکل خاموشی طاری رہی پھر تربینی نے مجھے بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

" جمیل احمد خاں مجھے اس بات کا دکھ ہے کہ میرے کارن تمہیں بہت سی کٹھنائیوں کا سامنا کرنا پڑا ہے۔"

میں نے تربینی کے چہرے کو غور سے دیکھا جو کچھ اس نے مجھ سے کہا مجھے اس پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ شاید اس لئے کہ مجھے اپنے بدترین دشمن سے اس قسم کے کسی جملے کی کوئی توقع نہیں تھی۔ تربینی نے میرے چہرے پر حیرت کے تاثرات دیکھے تو بڑی سنجیدگی سے بولا۔

" میں تم سے غلط نہیں کہہ رہا جمیل۔ کیا تمہیں میری بات پر وشواس نہیں ہے، اور وشواس بھی کیسے ہو گا۔"

" میرے لئے کیا حکم ہے سرکار" میں نے کسی زر خرید غلام کی طرح کہا۔ "میں آپ کی ہر سیوا کرنے کو تیار ہوں۔"

تربینی نے فوراً ہی میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ چند ثانیے تک وہ میرے چہرے کے تاثرات کو پڑھتا رہا پھر اس نے کمرے میں ٹہلنا شروع کر دیا۔ اس کے چہرے پر اُلجھن اور پریشانی کے ملے جلے تاثرات ہر لحظہ گہرے ہوتے جا رہے تھے۔ میں کن انکھیوں سے دیکھتا رہا۔ اچانک وہ ٹہلتے ٹہلتے میرے قریب آ کر رکا اور بڑی اداسی سے بولا۔

" جمیل، تمہیں انداز ہے کہ میں نے انکا کو کتنی کٹھن تپسیا اور جاپ کے بعد حاصل کیا تھا۔"

" میں ان باتوں کو بھول جانا چاہتا ہوں سرکار۔ سب مقدر کے کھیل ہیں۔" میں نے بجھی ہوئی آواز میں کہا تو تربینی نے آگے بڑھ کر اپنے دونوں ہاتھ میرے کاندھوں پر رکھ دیئے پھر بڑے دوستانہ انداز میں گویا ہوا۔

" جمیل احمد خاں۔ آج کے بعد سے ہم دونوں متروں (دوستوں) کی طرح ایک دوسرے کے ساتھ ہی رہیں گے۔ مجھ پر وشواس کرو۔"

مجھے ایک بار پھر اپنی قوت سماعت پر شبہ ہوا۔ تربینی کے رویئے کی اس اچانک اور حیرت انگیز تبدیلی نے مجھے ششدر کر دیا بھلا یہ کیوں کر ممکن تھا کہ جو شخص میرا سب سے بڑا دشمن ہو جس نے میری ایک آنکھ کو اپنی طاقت کی بھینٹ چڑھا دیا ہو وہ مجھے دوست کہہ کر مخاطب کرے۔ ابھی میں ان باتوں پر غور کر ہی رہا تھا کہ تربینی دوبارہ بولا۔

" میں بھگوان کی سوگند کھا کر کہہ رہا ہوں جمیل کہ آج کے بعد سے میں تم کو اپنا متر سمجھوں گا۔ تم سگے بھائیوں سمان میرے ساتھ رہو گے لیکن۔"

لیکن کہہ کر تربینی خاموش ہو گیا تو میں سمجھ گیا کہ ضرور کوئی ایسی ہی افتاد اس پر آن پڑی ہے جو وہ میری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھا رہا ہے ورنہ اس سے پہلے بھی میں اس کا برتاؤ دیکھ چکا تھا بہرحال تربینی خاموش رہا تو میں نے بے تابی سے پوچھا۔

" آپ کچھ کہتے کہتے چپ ہو گئے۔ کیا کوئی خاص مسئلہ درپیش ہے"

آپ مت کہو جمیل احمد خاں تم اب میرے متر ہو" تربینی اپنا نچلا ہونٹ کاٹتے ہوئے پُرخیال انداز میں بولا "جس طرح میں نے انکا کو حاصل کرنے کے لئے یکشا کا جاپ کیا تھا اسی طرح آج کل ایک اور پنڈت جاپ کر رہا ہے اسے اپنا جاپ کرتے ہوئے پچیس دن سے زیادہ بیت چکے ہیں اگر پندرہ دن کے اندر میں نے اس کا کوئی حل تلاش کیا تو انکا میرے قبضے سے بھی نکل جائے گی۔"

تربینی کی بات سن کر میری نبض کی رفتار تیز ہو گئی۔ اب میں پوری طرح سمجھ چکا تھا کہ تربینی نے میری طرف دوستی کا ہاتھ کیوں بڑھایا تھا۔ وہ غالباً مجھے اس پنڈت سے ٹکرانے کے لئے آمادہ کرنا چاہتا تھا جو انکا کو حاصل کرنے کے لئے اپنے جاپ میں معروف تھا۔ میں نے تربینی کی بے چینی کو محسوس کیا تو ایک عرصے بعد مجھے مسرت کا احساس ہوا۔ میں دل ہی دل میں مسکراتا رہا پھر تربینی کو

مخاطب کرکے پوچھا۔

"کیا آپ مجھے بتائیں گے کہ وہ پنڈت کون ہے اور کہاں بیٹھا جاپ کر رہا ہے؟"

"اس منحوس کا نام شیو چرن ہے۔" تر بینی نے تلملا کر کہا۔ "وہ ندھیا کی پہاڑی کے نیچے نربدا ندی کے کنارے ایک پرانے مندر میں بیٹھا اپنا جاپ پورا کرنے میں مگن ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم اسے اس کا جاپ پورا ہونے سے پہلے مار ڈالو۔ میں تمہیں وچن دیتا ہوں کہ اگر تم سپھل (کامیاب) ہوگئے تو میرے متر بن کے رہو گے۔ میں سارا جیون تمہارا یہ احسان نہیں بھولوں گا۔"

"میں تیار ہوں تر بینی داس جی" میں نے فوری طور پر اپنی آمادگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا پھر پوچھا۔ "مگر کیا آپ نے انکا سے دریافت نہیں کیا کہ ہم اپنے ارادوں میں کامیاب ہوں گے یا نہیں؟"

"پوچھا تھا۔ پرنتو۔ انکا اس سلسلے میں کچھ نہیں بتا سکتی جب تک پنڈت شیو چرن اپنے منڈل کے اندر ہے۔ انکا کی شکتی بھی اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتی۔"

"ایسی صورت میں بھلا میں کیا کرسکوں گا" میں نے دبی زبان میں کہا تو تر بینی بڑی صاف گوئی سے بولا۔

"سنو جمیل احمد خاں۔ تم جن حالات میں جیون بتا رہے ہو وہ موت سے بھی بدتر ہے۔ ایسی صورت میں تمہارے لئے پنڈت شیو چرن سے ٹکرانا کوئی دشوار بات نہیں۔ اگر تم سپھل ہوگئے تو تمہارے سارے دلدر دور ہوجائیں گے۔ ناکام ہونے کی شکل میں تم اپنی موجودہ کٹھنائیں سے ہمیشہ کے لئے چھٹکارا پالو گے۔ بولو..... کیا یہ سودا تمہیں منظور ہے؟"

ہر چند کہ تر بینی داس کی باتوں سے خود غرضی اور مکاری کی بو آ رہی تھی لیکن اس کے باوجود اس نے جو مشورہ مجھے دیا تھا وہ غلط نہ تھا۔ میری زندگی واقعی مردوں سے بدتر تھی۔ میں کچھ دنوں کھلی فضا میں سانس لینے کو بھی ترس گیا تھا۔ ایسی صورت میں اپنی زندگی کو تر بینی کے بتائے ہوئے داؤں پر لگا دینا میرے لیے ایسا مسئلہ نہیں تھا جس پر میں غور و خوص کرتا چنانچہ میں نے فوری طور پر اپنی آمادگی کا اظہار کردیا۔ تر بینی میرا جواب سن کر یوں کھل اٹھا جیسے اس کی دلی مراد پوری ہوگئی۔ وہ مجھے بڑی دیر تک پنڈت شیو چرن کے بارے میں حالات سے آگاہ کرتا رہا پھر یہ کہہ کر چلا گیا کہ مجھے اگلے دن اپنے اس خطرناک سفر پر روانہ ہوجانا پڑے گا۔

تر بینی کے جانے کے بعد میں تھکے ہوئے انداز میں اپنے پلنگ پر بیٹھ کر حالات پر غور کرنے لگا۔ میرا ذہن بری طرح ماؤف ہو رہا تھا۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اب میری زندگی کے دن عنقریب پورے ہونے والے ہیں۔ مجھے اس بات کی مطلق توقع نہ تھی کہ میں منڈل میں بیٹھے ہوئے پنڈت شیو چرن کے مقابلے میں کامیابی سے ہمکنار ہوسکوں گا۔ میں تر بینی کے سلسلے میں ایک بار پہلے بھی اس وقت اپنی قسمت کو آزما چکا تھا جب تر بینی انکا کے حصول کے لئے جاپ میں مگن تھا۔ مجھے یقین تھا کہ شیو چرن سے ٹکرانا میرے لئے موت کے مترادف ہوگا۔ پھر بھی میں نے تر بینی کی بات ماننے سے انکار نہیں کیا اس لئے کہ میں کھلی فضا میں آزادی کی موت مرنا چاہتا تھا۔

میں سوچتا رہا۔ سوچتا رہا۔ میرا ذہن چکراتا رہا۔ موت کا بھیانک تصور میرے اعصاب پر بتدریج اپنا قبضہ جماتا رہا لیکن پھر اچانک اندھیرے میں امید کی ایک ہلکی سی کرن ایسی پھوٹی کہ میں تیزی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے سوچا کہ اگر میں کسی طرح عین اس وقت پنڈت شیو چرن کو مارنے میں کامیاب ہوجاؤں جب انکا تر بینی داس کے قبضے سے نکل کر شیو چرن کے قبضے میں جا رہی ہو تو یقیناً میری کایا پلٹ سکتی ہے۔ میں ایک بار پھر انکا کو حاصل کرسکتا ہوں!

میں اس روز تمام رات جاگتا رہا اور مختلف منصوبے بناتا رہا اور دوسرے دن تر بینی کی ہدایت پر سورت (SURAT) کے لئے روانہ ہوگیا جہاں سے مجھے پنڈت شیو چرن کے ٹھکانے تک پہنچنا تھا۔



پھر کیا ہوا

کیا جمیل احمد خان پنڈت شیو چرن کو مارنے میں کامیاب ہوگیا

تر بینی داس پر کیا بیتی؟

انکا کے پراسرار وجود کا یہ حیرت انگیز سلسلہ ابھی جاری ہے باقی چودھویں قسط میں ملاحظہ فرمائیے



نئے عہد کا پرانا انسان





اس ماہ کی خاص کہانی

اِس ماہ کی خاص کہانی :

نئے عہد کا پُرانا انسان

یہ معاشرتی کہانی یُوپی کے شمالی علاقوں میں پیش آنے والے ایک عبرت انگیز واقعے سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہے —

—— الیاس سیتاپوری

کہتے ہیں کہ جب نواب جمیلانی نے اپنی چہیتی بیوی کو مٹی دی تو لوگوں نے پہلی بار ان کے ہاتھوں کو رعشہ دیکھا ان کی آنکھیں نم ہو گئیں، جیسے تیسے فاتحہ پڑھی اور گھر آ کر خلوت میں چلے گئے لوگوں نے ان کی اس بد اخلاقی کو محض سوگواری کے پیش نظر برداشت کر لیا۔ مرحوم بیوی سے انہیں عشق تھا لیکن جب تک وہ زندہ رہی نواب نے کوئی پروا نہ کی انہیں ہمیشہ ایک ہی فکر لگی رہتی ایک دُھن ایک لگن اور ایک آرزو، وہ کوئی ایسا کام کر گزرنا چاہتے تھے جو انہیں بہت سے مشاہیر عالم کی طرح شہرت دوام بخش دے لیکن کچھ سمجھ میں نہ آتا مطالعہ، سیاحت، غور و فکر، تنہائی اور کسی ایسے کام کی جستجو جس پر کچھ کر کے وہ بڑے آدمی بن جائیں لیکن مدتوں کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ یہاں تک کہ اسی فکر میں اپنی چہیتی بیوی کا اس کے حسب دلخواہ خیال نہ رکھ سکے اور وہ کڑھ کڑھ کر خاک کے پردے میں جا چھپی ہاں اپنی نشانی دو سالہ بچہ اور چھ ماہ کی بچی البتہ چھوڑ گئی تھی نواب کو اس موت نے تھوڑی سی دیر کے لئے کچھ پگھلایا لیکن یہ موم پھر جم کر پتھر بن گیا۔

مرنے والی اپنے پیچھے دو سالہ اختر اور چھ ماہ کی شاذیہ کو چھوڑ گئی تھی شاذیہ کو اس کی خالہ انوری نے اپنے ذمے لے لیا۔

نواب جمیلانی نے اس کی اس طرح دلدہی شروع کر دی کہ اس میں احساس محرومیت نہیں پیدا ہونے دیا۔ گلیلیو، آئزک نیوٹن، فرائیڈ، مادام کیوری اور لوئی پاسچر جیسی مختلف شعبوں کی نامی گرامی شخصیتیں ہر وقت ان کے ذہن میں موجود رہتیں تھیں ان کی بہت بڑی اور زندگی کی سب سے قیمتی خواہش تو یہی تھی کہ وہ زندہ جاوید ہو جائیں اور ان کے بعد ان کا نام بھی کسی دریافت کے سلسلے میں عزت و احترام سے لیا جائے لیکن کام کرنے والوں نے کوئی ایسا شعبہ نہیں چھوڑا تھا جس میں کام کر کے کوئی امر بن سکتا۔ بیوی کی موت کا غم جو ذرا کم ہوا تو پھر اسی خواہش نے سر اُٹھانا شروع کر دیا اب اختر کی فکر بھی آڑے آنے لگی تھی۔ بیوی کے سوئم والے دن جب وہ ماضی کے اس حصے کو یاد کر رہے تھے جس میں انہوں نے اپنی بیوی کو پہلی بار دیکھ کر دل دیا تھا تو بڑا دکھ ہوا آنکھوں میں آنسو آ گئے اور دل بھر آیا جیسے خود بخود کسی نے سوال کیا۔ "جمیلانی! یہ محبت کیا ہے؟"

نواب جمیلانی کے پاس اس کا کوئی اطمینان بخش جواب نہ تھا۔

کسی نے پھر سوال کیا "یہ کیوں ہوتی ہے؟"

اور ابھی اس کا جواب ملا بھی نہ تھا کہ جیسے پھر کسی نے دریافت کیا۔ "کیا یہ فطری عطیہ ہے یا معاشرتی ضرورت؟"

اسی لمحے ان کی نظریں غیر ارادی طور پر اختر کی طرف اُٹھ گئیں اور جیسے ان کے وجدان نے انہیں بتایا کہ یہی وہ موقع ہے جس سے تم اپنی زندگی کا ایک بڑا اور قیمتی مقصد حاصل کر سکتے ہو۔ یہ دو سالہ بچہ ممکن ہے ان کے متجسس اور مضطرب ذہن کو چھٹکارا دلا سکے جس کی وہ مدتوں سے کوشش میں تھے، نواب اختر پر یہ تجربہ کرنا چاہتے تھے کہ اگر اس کی ایک ایسے ماحول میں تعلیم و تربیت کی جائے جس میں عورت اور محبت کا کوئی ذکر نہ ہو تو جوان ہو جانے پر اس کی نفسی کیفیت کیسی ہو گی؟ عورت اور محبت کا عرفان کیا اور کس طرح ظاہر ہو گا؟ نواب نے اپنے منصوبے کے تمام پہلوؤں پر خوب اچھی طرح غور کیا اور چند دنوں بعد اختر کو لے کر اپنے علاقے میں چلے گئے۔ یہ جگہ اپنے محل و قوع کے اعتبار سے، نواب کے مقصد کے لئے بہت اچھی تھی۔ یہ علاقہ نیپال کی ترائی میں واقع تھا سر سبز پہاڑیاں دور تک پھیلی ہوئی تھیں اور میدانی علاقے میں پانچ چھ میل کے رقبے میں کھیتوں کا سلسلہ چلا گیا تھا۔ مغرب

میں گنجان جنگل تھا۔ یہیں پہاڑی کے دامن میں دو فرلانگ میں پھیلی
ہوئی عالی شان کوٹھی تھی۔ آس پاس آبادی کا میلوں پتہ نہ تھا۔ نواب
صاحب کے چار مرد ملازم ساتھ لئے اور اختر کے ساتھ اس میں رہنے
لگے۔ ضروریات زندگی کی تمام چیزیں وافر مقدار میں ذخیرہ کرلی گئیں۔

یہاں نواب صاحب کو سب سے زیادہ مشکل اس وقت پیش
آئی جب اختر کی تعلیم کا مسئلہ سامنے آیا۔ وہ چھپی ہوئی مروجہ کتابیں
نہیں پڑھانا چاہتے تھے کیونکہ ان میں سب سے بڑی خرابی یہ تھی کہ
کسی نہ کسی طور پر کہیں نہ کہیں عورت اور محبت کا ذکر ضرور ہوتا ہے
اسی طرح کچھ اور باتیں بھی تھیں جن سے اختر کو لاعلم رکھ کر تجربہ کرنا
تھا۔ انہوں نے اس کا حل بھی تلاش کرلیا۔ انہیں یاد آیا کہ اردو
کے مشہور مصنف ڈپٹی نذیر احمد نے مروجہ نصابوں کو حسب دلخواہ نہ
پاکر اپنی بچیوں کے لئے مرأۃ العروس اور بنات النعش جیسی کتابیں
خود ہی تصنیف کر ڈالی تھیں چنانچہ اختر کے لئے انہیں بھی ایسا ہی
کرنا چاہیے اور انہوں نے اپنے مقصد کے مطابق کتابیں ترتیب
دینی شروع کردیں۔

چاروں ملازمین کو سختی سے ہدایت کی گئی کہ وہ اختر سے
کم سے کم باتیں کریں گے اور اپنی گفتگو میں لڑکی، عورت یا
محبت کا بھولے سے بھی ذکر نہ کریں گے۔ ملازمین کی سمجھ میں کچھ
نہ آتا تھا کہ یہ مسئلہ کیا ہے اور یہ نواب چاہتا کیا ہے؟ وہ نواب کو
خبطی یا پاگل محسوس کرنے لگے تھے۔

اختر کے دو سال اس طرح گزر گئے کہ اس نے اپنی کوٹھی
کے کمروں، صحن، فوارے، سبزے اور پھولدار درختوں کی روشوں کے
ساتھ ساتھ اپنے ملازمین کو ہر کام احتیاط اور ایک پروگرام کے مطابق
انجام دیتے دیکھا۔ خانساماں کھانا تیار کردیتا۔ دوسرا ملازم صفائی
ستھرائی میں لگا رہتا۔ تیسرا اس کی دیکھ بھال رکھتا۔ اسے گود میں لے
کر ادھر ادھر گھماتا پھراتا رہتا۔ اس کا منہ ہاتھ دھلاتا، نہلاتا، کپڑے
بدلواتا، کپڑے دھوتا اور بہت سے دوسرے کام جو اختر کی ذات
سے ہی متعلق ہوتے انجام دیتا۔ چوتھا ملازم باہر کے کاموں کے لئے
تھا۔ نواب صاحب کے کام بھی یہی چوتھا ملازم انجام دیتا تھا۔ اس
دو سال کے عرصے میں دو بار ڈاکٹر بھی آیا۔ ننھا اختر گم سم یہ سب دیکھتا
رہتا۔ اس کے حافظے میں ابھی اپنے مشاہدات کو ترتیب سے برقرار
رکھنے کی صلاحیت نہیں تھی۔ وہ کوٹھی کے باہر دور تک پھیلے ہوئے
سرسبز و شاداب کھیتوں کو دیکھتا، کھیتوں میں کام کرنے والے آدمیوں
کو بھی دیکھتا پھر اس کی نظریں جنگل کی سمت بھی جاتیں اور یہ سرسبز،
بلند و بالا گنجان اور گہرا سلسلہ کچھ اور ہی کیفیت پیدا کرتا۔ پھر اس
نے شمال میں پیچ در پیچ لہراتی ہوئی اونٹوں کے کوہان جیسی پہاڑیاں
دیکھیں جو اس کے لئے ناقابل فہم اور مبہم سوال بن کر رہ گئیں۔ یہ ویران
ویران خاموش اور سنسان ماحول بہت دنوں تک بے معنی رہا
لیکن جیسے جیسے شعور نے بے قرار ہونا شروع کیا ذہن میں اکا دکا
بے ربط سوالات ابھرنے لگے اور چار سال کی عمر سے اس کی تعلیم
کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ نواب صاحب خود ہی یہ کام انجام دینے لگے۔

ہمجولیوں کی محرومی نے اختر کی طبیعت میں یاسیت
پیدا کردی۔ جب وہ کوٹھی کی یکسانی سے اکتاتا تو کوٹھی کے باہر کا
نظارہ کرنے لگتا۔ اس کا نگراں ملازم سائے کی طرح ساتھ لگا رہتا
پھر اختر اس سے کبھی کبھی سوالات بھی کرنے لگا تھا۔ اب وہ جو چیز
دیکھتا اس کے جاننے کی تحریک پیدا ہوتی۔ عموماً ہر چیز کے بارے
میں اس کے پاس چند ہی سوالات ہوتے تھے۔

"یہ کیا ہے؟
یہ کہاں سے آئی؟ یا اسے کس نے بنایا؟
کس لئے بنائی؟"

اور ان سوالوں میں پہلے سوال کے سوا اس کے نگراں ملازم
کے پاس یکساں جوابات تھے۔ دوسرے اور تیسرے سوالات کے
جواب تقریباً یہ ہوتے تھے۔

"یہ اللہ میاں کے پاس سے آئی ہے۔ اسے اللہ نے بنایا ہے
اور یہ کہ ہر چیز کے بنائے جانے کا ایک ہی مقصد ہوا کرتا ہے وہ یہ
کہ انسان اس سے فائدہ اٹھاتے۔"

نواب صاحب اختر کی ایک ایک بات اور جملہ حرکات و
سکنات پر نظر رکھے ہوتے تھے انہیں اچانک یہ محسوس ہوا کہ اختر نے
معمول سے زیادہ خاموشی اختیار کرلی ہے۔ انہیں اپنے ملازمین پہ
پورا اطمینان نہ تھا۔ نواب صاحب کو شبہ گزرا کہ کہیں کسی ملازم نے
اختر کو راز کی باتیں تو نہیں بتا دی ہیں۔ کیونکہ اختر اپنا زیادہ وقت
غور و فکر میں گزارنے لگا تھا وہ رات کو آسمان پر نظریں جماتے۔

ٹکٹکی لگا تے نجانے کیا سوچتا رہتا۔ چاند کو دیکھتا تو نظریں نہ ہٹاتا۔ سورج سے آنکھیں تو نہ ملا سکتا تھا لیکن آنکھیں ملانے کی کوشش ضرور کرتا۔ سب سے زیادہ حیرت انگیز چیز یہی سورج تھا۔ اس کی خاموشی اور انہماک پاگلوں جیسا تھا لیکن وہ ان سب میں اللہ کو تلاش کر رہا تھا اللہ جس نے بقول ملازمین ہر چیز پیدا کی ہے اور جو خود نظاہر کہیں موجود نہیں، وہ کہاں ہے کیسا ہے؟ طرح طرح کے سوالات اس کے ننھے منے ذہن میں خود بخود پیدا ہوتے اور جواب پائے بغیر کہیں اِدھر اُدھر ہو جاتے۔ اس کی حالت حضرت ابراہیمؑ یا گوتم سے کچھ مختلف نہ تھی۔ اس کی اس پُراسرار خاموشی اور کیفیت کے پیش نظر نواب صاحب کو ایک بار پھر اپنے ملازمین کو سختی سے یہ ہدایت دینی پڑی کہ خبردار جو کسی نے اختر کے سامنے عورت یا محبت کا ذکر کیا۔

نواب صاحب کھیتوں پر گئے ہوئے تھے۔ کوٹھی میں تینوں ملازمین، اختر اور گھر کی نگہداشت میں لگے ہوئے تھے کہ اچانک جانوروں کے باڑے سے گائے کے ڈکرانے کی آوازیں آنے لگیں اس کی آواز میں بڑا درد تھا۔ تینوں ملازم باڑے کی طرف بھاگے ان کے پیچھے پیچھے اختر بھی پہنچ گیا۔ جب وہ وہاں پہنچا تو گائے چپ ہو چکی تھی۔ اس کے قریب ہی ایک چھوٹا سا بچہ بیٹھا تھا۔ گائے نہایت محبت آمیز نظروں سے اسے دیکھتی اور چاٹنے لگتی۔ بچہ کھڑے ہونے کی کوشش کرتا کھڑا ہوتا اور پھر تھرا کر گر جاتا۔ اس کی ننھی سی دُم جلدی جلدی ہلنے لگتی۔ اختر کیلئے یہ عجیب و غریب منظر تھا۔ وہ دوڑ کر بچے کے قریب پہنچ گیا۔ یہ صاف ستھرا پیارا پیارا، دُھلا دُھلایا بچہ اسے بہت ہی اچھا لگا۔ اس نے اپنے اس ننھے ساتھی کی طرف پیار سے ہاتھ بڑھایا اور اور اس کی کھال کو سہلانا چاہا لیکن گائے بے چینی سے اُٹھ کر کھڑی ہو گئی اور سینگوں سے اختر کو اُچھال دینا چاہا۔ اختر کے ملازم نے پھرتی سے اسے پیچھے ہٹا دیا۔ اختر کے لئے یہ سب کچھ حیرتناک اور عجیب سا تھا وہ مچل گیا "میں تو اس کی کھال پر ہاتھ پھیروں گا۔"

لیکن نوکر نے جھنجلا کر کہا۔ "چھوٹے نواب صاحب! آپ ذرا صبر سے کام لیں، میں یہ بچہ آپ کو دے دوں گا۔ گھبرایئے نہیں لیکن اس وقت اس سے دور رہیئے ورنہ اس کی ماں آپ کو زخمی کر دے گی۔"

"ماں؟ یہ کیا چیز ہوتی ہے؟" اختر کے لئے یہ عجیب، نیا اور غیر مانوس لفظ تھا۔ اس نے اپنی ننھی سی عقل کے مطابق سوال کیا۔ "ماں؟ یہ کیا چیز ہوتی ہے؟"

ملازم نے جواب کے اس پہلو پر غور کئے بغیر کہ وہ ایک سخت غلطی کا مرتکب ہو رہا ہے جواب دیا۔ "ماں! آپ ماں کو نہیں جانتے؟ اسے واہ۔ ماں، ماں ہوتی ہے وہ جس نے ہم سب کو پیدا کیا ہے۔ یہ گائے اس چھوٹے سے بچے کی ماں ہے!"

اختر نے بھولپن سے کہا "لیکن تم تو کہتے تھے کہ ہم سب کو اور یہاں کی ہر چیز کو اللہ نے پیدا کیا ہے؟"

"ہاں!" ملازم بولا "لیکن اللہ یہ کام خود نہیں کرتا دوسروں سے کرا دیتا ہے وہ جب کسی چیز کو پیدا کرنا چاہتا ہے تو اس کی ماں کے ذریعے پیدا کرا دیتا ہے!"

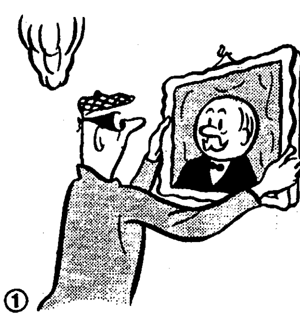
اختر کسی سوچ میں گم ہو گیا۔ پھر اچانک سوال کیا "ہمیں کس نے پیدا کیا؟ ہماری ماں کہاں ہے؟"

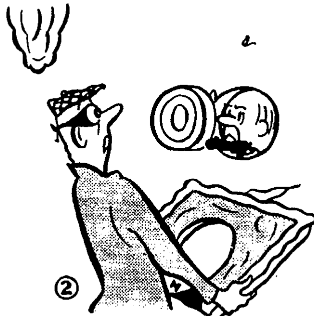
ملازم چکرا گیا بات کہیں سے کہیں پہنچی جا رہی تھی موضوع بدلنے کے لئے کہا "تمہاری ماں بھی تھی لیکن اب وہ نہیں ہے۔۔۔ چھوٹے نواب صاحب آپ کو یہ باتیں نہیں کرنی چاہئیں، ابھی نہیں!"

جب ملازم مطمئن نہ کر سکا تو پڑھائی کے دوران یہی سوال اس نے اپنے باپ سے کر دیا۔ "ابا! میری ماں کہاں ہے؟"

نواب صاحب سناٹے میں آ گئے جواب دینے کے بجائے چپ چاپ اُٹھے اور اختر کے نگراں ملازم کو بلا کر، دور کوٹھی کے باہر لے گئے اور اپنے پیچھے گیٹ کو باہر سے بند کر دیا۔ "آج وہ پوچھ رہا تھا کہ اس کی ماں کہاں ہے؟ میں تم سے پوچھتا ہوں کہ اس نے یہ سوال کیوں کیا؟"

ملازم کو ساری باتیں یاد آ گئیں۔ اس نے سب کچھ صاف صاف بتا دیا نواب صاحب نے اسے کوئی سزا نہیں دی لیکن انہیں اس کا ملال ضرور تھا کہ کسی نہ کسی صورت میں عورت کی شخصیت اختر کے علم میں آ چکی ہے۔ "آج سے مویشیوں کو باڑے سے نکال کر کوٹھی سے دور اُن کی جگہ بنائی جائے!" انہوں نے فی الفور یہ حکم سنا دیا لیکن اس پر تعمیل ناممکن تھی۔ پڑوس کے جنگل کا کوئی بھی درندہ ان سانے





جانوروں کو بیچنے یا دیگر ٹھکانے لگا سکتا تھا کیونکہ کوٹھی کے علاوہ وہاں دور دور تک کوئی ایسی محفوظ جگہ نہ تھی جہاں ان مویشیوں کو منتقل کردیا جاتا۔ بالآخر مجبوراً کوٹھی کے اندر ہی بہت دور جہاں اختر کی رسائی نہ ہوسکے ان جانوروں کو منتقل کردیا گیا۔

❦

کئی سال اور گزر گئے۔ ملازم باری باری چھٹیوں پر جاتے واپس آجاتے اختر سوچتا یہ لوگ کہاں اور کس لئے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر آتا۔ دوا علاج کرکے چلا جاتا۔ جیسے جیسے شعور آتا گیا سارے معاملات پہیلی کی طرح ذہن میں گھر کرتے رہے۔ وہ جانوروں سے دور رکھا گیا تھا اس نے اب تک جیسی کتابیں پڑھی تھیں ان سے ایک مخصوص اور محدود علم حاصل ہوا تھا۔ گردوپیش کی ساری چیزیں اس کے نزدیک پھیکی پھیکی بے کیف اور ادھوری ادھوری سی تھیں، اس نے اپنے ملازمین اور ڈاکٹر کو دور حدِ نظر کے اُس پار غائب ہوتے دیکھا اور کچھ پتا نہ چلا کہ وہ کہاں گم ہوگئے اور پھر جب ان میں سے کچھ واپس آتے اور بعض نہیں آتے تو اس میں ایک تڑپ پیدا ہوتی۔ ایک جستجو اور حدِ نظر کے اس پار کے حالات جاننے کی خواہش نے جنم لیا۔

نواب صاحب کے کسی عمل میں محبت اور شفقت کا جوش خروش نہ تھا بس ہر بات رسمًا اور معمولات کی طرح انجام پا رہی تھی رشتے دار اختر کو دیکھنا چاہتے تھے لیکن نواب صاحب انہیں ملنے کی اجازت ہی نہ دیتے تھے رشتے داروں کو ان کے اس خبط اور پاگل پن سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ انہوں نے کئی بار آنے کی کوشش کی لیکن خرد ماغ نواب نے سختی سے منع کردیا۔ ان موقعوں پر رشتے دار پہلے تو صرف محسوس کرکے نظر انداز کر جاتے تھے لیکن رفتہ رفتہ نواب صاحب کا منفی رویہ سبھی کے لئے پریشان کن اور جستجو خیز بنتا رہا یہاں تک کہ لوگوں میں یہ جاننے کی خواہش پیدا ہوگئی کہ آخر اختر کے ساتھ کیا اور کیسا سلوک ہورہا ہے بعض رشتے داروں نے تو یہاں تک طے کرلیا کہ کچھ بھی ہو نواب صاحب کی بات نہیں مانی جائے گی اور اچانک دھاوا بولا جائے گا۔

اس دوران ایک چھوٹی سی بات اور سرزد ہوگئی۔ کوٹھی کے جس حصّے میں درخت لگے ہوتے تھے وہیں کچھ درخت پپیتے کے بھی لگے تھے ان میں سے بعض تو پھل دیتے تھے اور بعض نہیں دیتے تھے اختر ان کے اس فرق کو محسوس کر رہا تھا جب اپنے نگراں ملازم سے اس سلسلے میں استفسار کیا تو اس نے شاید پہلی مرتبہ کچھ عجیب و غریب اور ناقابلِ فہم باتیں بتائیں، اس نے بتایا کہ ان میں جو نر درخت ہیں وہ پھل نہیں دیتے اور جو مادہ ہیں وہ پھل دیتے ہیں، نر اور مادہ کی بات اس کی سمجھ میں نہ آئی۔ ملازم کہنے کو تو کہہ گیا لیکن بعد میں اپنی غلطی کا سخت احساس ہوا اور اس وقت تو اسے اپنی اس غلطی کا بہت زیادہ احساس ہوا جب اختر نے اس سے نر اور مادہ کی تعریف جاننا چاہی لیکن ملازم ایک بھول کے بعد کوئی بڑی غلطی نہیں کرنا چاہتا تھا۔

اس نے نہایت چالاکی سے موضوع بدل دینا چاہا لیکن اختر نے اس کا موقع ہی نہ دیا اور ملازم نے شرمندگی، خجالت اور خوفزدہ لہجے میں اس راز کو فاش کردیا جس سے اب تک اسے بے بہرہ رکھا گیا تھا پہلے تو اس نے اختر سے وعدہ لیا کہ جو کچھ وہ بتائے اس کا ذکر نواب صاحب سے نہ کیا جائے جب اختر نے وعدہ کرلیا تو اس نے پہلی بار

سب کچھ بتا دیا۔" بڑے نواب صاحب پاگل معلوم ہوتے ہیں وہ تمہاری زندگی تباہ کر رہے ہیں!"

اختر نے حیران ہو کر دریافت کیا۔ "وہ کس طرح؟"

ملازم نے جواب دیا۔ "انہوں نے تمہیں عورت سے لاعلم رکھا ہے وہ عورت جس کے بغیر مرد کی زندگی ناقص و نا تمام رہتی ہے، زندگی اور کائنات کی حسین ترین شے جس کے بغیر زندگی پھیکی اور دنیا بے لطف رہتی ہے تم اس کی بابت کچھ بھی نہیں جانتے۔ اس لئے کہ تمہیں اس کی بابت کچھ بتایا ہی نہیں گیا۔"

لیکن ملازم کی یہ باتیں اس کی سمجھ میں نہیں آئیں، عورت، زندگی کائنات بے لطف، ناقص و نا تمام، ان کا باہمی تعلق کیا ہے۔ اختر کی کیفیت اس شوقین سامع جیسی ہو گئی جو کسی داستان گو کی ادھوری داستان سن کر تلملا کر رہ جاتا ہے ملازم نے اسے یہ بھی بتایا کہ پھل پھول صرف مادہ یا عورت دیتی ہے۔ اسی طرح پپیتے میں جو درخت مادہ ہیں پھل انہی میں آتے ہیں نر یا مرد پھل پھول نہیں دیتے۔ اختر نے پھول اور پھل والے اور بغیر پھل پھول کے درختوں کو گھنٹوں گہری نظروں سے دیکھا لیکن ان دونوں میں اسے کوئی فرق نہیں محسوس ہوا۔

اس کے بعد سے ملازم کا یہ دستور ہو گیا کہ جب اسے موقع ملتا وہ عورت، اس کے حسن، مرد کے لئے اس کی اہمیت اور ضرورت، اس کی سحر طراز شخصیت، ساحرانہ ناز و ادا اور ہوش رُبا دلکشی کا ہی ذکر کرتا رہتا اور اختر یہ سب کچھ اس طرح سنتا گویا بہشت کے قصے سن رہا ہو۔ وہ جلدی جلدی پلکیں جھپکا کر پوچھتا کہ "یہ عورت کہاں ہے؟"

ملازم نے جواب دیا۔ "اسی دنیا میں!"

اختر نے پُر شوق لہجے میں دریافت کیا۔ "لیکن کہیں نظر تو نہیں آتی؟"

ملازم نے سرد آہ بھری، بولا۔ "یہاں نہیں ہے وہ، وہ تو اس علاقے سے دور بستی میں ملے گی، اس بستی میں جہاں کبھی ہم سب رہا کرتے تھے!"

اختر نے کہا۔ "وہ بستی یہاں سے کتنی دور ہے؟"

ملازم نے جواب دیا۔ "دور تو زیادہ نہیں ہے لیکن یہاں سے ہم نکل نہیں سکتے۔"

"لیکن میں تو یہاں سے نکل چلنے کے لئے تیار ہوں!" اختر نے کہا۔ "تم جب کہو ہم یہاں سے نکل چلنے کو تیار ہیں۔"

ملازم اُداس ہنسی ہنس دیا۔ "ہمیں بڑے نواب صاحب نکلنے ہی نہ دیں گے!"

اختر نے باپ کی پروا کئے بغیر کہا۔ "واہ، وہ ہمیں نکلنے کیوں نہ دیں گے ہم اپنی مرضی کے مالک ہیں تم جب کہو ہم چلنے کو تیار ہیں!"

ملازم نے بے بسی سے عرض کیا۔ "نواب صاحب ہرگز، کسی قیمت پر بھی یہ نہ چاہیں گے کہ تم یہاں سے نکل کر بستی پہنچو اور عورتوں سے ملو۔"

"مجھے ان کی کوئی پروا نہیں!" اختر نے کہا۔ "وہ مجھے کسی بات سے بھی نہیں روک سکتے۔"

"وہ مجھے ملازمت سے نکال دیں گے!"

"تمہیں ہم دوبارہ ملازم رکھ لیں گے!"

"لیکن جب تک نواب صاحب زندہ ہیں۔ تم مجھے ان کی مرضی کے خلاف ملازم نہیں رکھ سکتے۔"

اختر نے وحشیوں کی طرح ہنس کر جواب دیا۔ "نواب صاحب تمہیں نکال نہیں سکتے اگر انہوں نے تمہیں نکال دیا تو میں انہیں قتل کر دوں گا۔"

ملازم سناٹے میں آ گیا۔ لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ ایک ایسی اولاد سے جو عورت اور محبت سے محروم رہی ہو اور امید بھی کیا کی جا سکتی ہے۔



یہاں تک کہ اختر اٹھارہ سال کا ہو گیا۔ نواب صاحب پر ضعیفی نے غلبہ پا لیا تھا انہوں نے اختر کی ساڑھے سولہ سالہ زندگی کا کیا تجربہ کیا یہ تو وہی جانتے ہوں گے لیکن نواب صاحب کے مخصوص ماحول اور تجربہ خانے میں اختر کی شخصیت اور کردار کی جو شکل ابھر کر سامنے آئی وہ یہ تھی کہ محبت سے لاتعلقی اور لاعلمی نے اس کے مزاج میں کرختگی اور وحشت پیدا کر دی تھی اسے کسی سے بھی محبت نہ تھی، صرف اس کے دل میں اپنے ملازم کے لئے فطری اُنس کی رمق البتہ پائی جاتی تھی۔ دنیا کی ہر شے اس کے لئے بے معنی اور بے مقصد تھی۔ وہ جانوروں کو بڑی بے دردی سے مارا کرتا تھا اور چونکہ عورت

کی شکل تک نہ دیکھی تھی اس لئے مزاج اور طبیعت میں ایک قسم کی درندگی اور ویرانیت نے قبضہ جما لیا تھا اسے کوئی چیز اچھی ہی نہ لگتی اسے ایسا لگتا جیسے کوئی چیز گم ہو گئی ہے لیکن گمشدہ چیز کی حقیقت اور حیثیت سے وہ بالکل لاعلم تھا۔

نواب صاحب کئی بار سخت بیمار پڑ چکے تھے انہیں یہ شبہ پیدا ہو گیا تھا کہ اب زندگی کا کوئی بھروسا نہیں، معلوم نہیں کب چراغ بجھ جائے۔ اب تک کسی بھی گھر والے کو پاس پھٹکنے بھی نہ دیا تھا لیکن اب یہ خواہش تھی کہ بستی میں واپس جائیں اور اختر کو اس کی حقیقی بہن اور خالہ کے حوالے کر دیا جائے۔ بہن کی عمر بھی سولہ سال سے کم نہ تھی۔ یہ بھی سوچتے کہ اب لڑکی کی شادی کر دینی چاہیئے اب تک اس نے اپنی خالہ کی نگرانی اور سرپرستی میں تعلیم و تربیت حاصل کی تھی۔ نواب صاحب اپنی سالی کے بہت زیادہ احسان مند تھے اگر صحت کچھ دنوں اور بحال رہتی تو ممکن تھا کہ وہ اختر کے لئے کچھ کرتے لیکن اب تو یہی محسوس ہوتا رہتا تھا کہ شاید وہ بیٹے یا بیٹی کی خوشیوں میں شریک نہ ہو سکیں گے۔ یہ خوف بھی اندر ہی اندر کھائے جا رہا تھا کہ اختر نے ابھی تک چونکہ کسی لڑکی یا عورت کو دیکھا نہیں ہے۔ وہ تمام مقدس اور غیر مقدس رشتوں سے ناواقف ہے۔ اس کا کیا ہو گا؟ اس کے علاوہ عورت اور محبت کے ذکر کو خارج از نصاب کر دینے سے بہت سی چیزیں خود بخود خارج ہو گئی تھیں، مذہبیات اخلاقیات، ولیوں اور پیغمبروں کے حالات ان کے قوانین اور شریعتیں، اختر کو کسی چیز کا علم نہ تھا۔ اس نے اپنے ملازم کی زبانی عورتوں کا ذکر سن رکھا تھا لیکن دیکھا نہ تھا۔ اور چونکہ دیکھا نہ تھا اس لئے اسے عورت کی کوئی خاص ضرورت بھی محسوس نہ ہوتی اگر وہ عورت کو دیکھ لیتا تو جس گمگشتہ شے کی اسے ہوس تھی، اس سے واقف ضرور ہو جاتا۔ مگر وہ تو نواب کے انتہا پسندانہ تجربوں کی زد پر تھا اور ایک بالکل مختلف شکل کا فرد بن کر ابھرا تھا۔

نواب صاحب ابھی کوئی قدم اٹھا بھی نہ سکے تھے کہ ان پر فالج کا حملہ ہو گیا۔ داہنی طرف کا آدھا جسم بیکار ہو گیا۔ ایک ملازم اسی دن بستی روانہ ہو گیا اور ڈاکٹر کے ساتھ ہی نواب صاحب کے بہت سے عزیز رشتہ داروں کو بھی ساتھ لیتا آیا ان میں اختر کی نوجوان بہن شاذیہ اور ادھیڑ عمر خالہ انوری آنے والوں میں سب سے آگے تھیں۔ جب دونوں ملازم کے ساتھ اس ویران کوٹھی میں پہلی بار داخل ہوئیں اور اختر نے ان کے اپنے سے مختلف اور عجیب سراپا پر نظر ڈالی تو بس دیکھتا ہی رہ گیا۔ اسے یہ دونوں کچھ مضحکہ خیز سی لگیں۔ ملازم نے ان دونوں کا تعارف کرایا اور شاذیہ کی طرف اشارہ کرتا ہوا بولا: "چھوٹے نواب صاحب یہ تمہاری بہن شاذیہ بی بی ہیں اور یہ دوسری تمہاری خالہ ہیں!"

ان دونوں نے ہکا بکا حیران پریشان اختر کی طرف دیکھا۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ اس وحشی کو کس طرح مخاطب کیا جائے۔ اختر سوچ رہا تھا "یہ بہن کیا چیز ہوتی ہے؟ خالہ کسے کہتے ہیں؟ یہ دونوں تو عجیب سی مخلوق ہیں"۔

ان کے رنگ برنگے کپڑے، کانوں کے سنہری رنگ، ہاتھوں کی چوڑیاں، گلے کا لاکٹ اس کے نزدیک یہ ساری چیزیں کچھ عجیب سی تھیں۔

اس نے ان دونوں کے آنچلوں کے پیچھے چھپے ہوئے بعض مخصوص اور اپنے سے مختلف اعضائے جسمانی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ملازم سے دریافت کیا: "یہ کس طرح کے آدمی ہیں؟"

نوکر شرمندہ اور خوفزدہ ہو کر جواب دیئے بغیر وہاں سے ہٹ گیا۔ شاذیہ اور خالہ انوری بھی شرما گئیں "توبہ ہے یہ لڑکا ہے یا جانور؟ بھائی صاحب نے اسے بنا کیا دیا ہے آخر؟" خالہ انوری یہ کہتی ہوئی لڑکی کو لے کر وہاں سے ہٹ گئیں، وہ وہاں سے خرخر کرتے ہوئے بے بس نواب کے سرہانے پہنچ گئیں ڈاکٹر صاحب ان کا بغور معائنہ فرما رہے تھے۔

اختر انہیں چھوڑ چھاڑ جانوروں کے باڑے میں چلا گیا وہاں کے ایک ایک جانور کو بغور دیکھتا اور ان کی آپس میں مماثلت اور عدم مطابقت پر غور کرتا رہا۔ یہاں بھی کچھ اختلافات موجود تھے وہ ہر بات اب ملازم سے نہیں پوچھنا چاہتا تھا بلکہ خود اپنی عقل اور سمجھ سے بھی کچھ معلوم کرنا چاہتا تھا کئی گھنٹے کے بعد جب وہ باڑے سے واپس نواب صاحب کے سرہانے پہنچا تو وہاں خاندان کی اور بہت سی عورتیں لڑکیاں اور مرد پہنچ چکے تھے عزیز رشتے تپاک اور محبت سے اس کی طرف بڑھتے اور اسے مخاطب کرتے لیکن اختر انہیں پاگلوں کی طرح گھورتا ہی رہ جاتا۔ کسی کی بات کا کوئی جواب نہ دیتا۔ آنے والوں نے جلدی ہی متفقہ طور پر یہ فیصلہ

کرلیا کہ یا تو اختر پہلی ملاقات کی وجہ سے حیران اور پریشان ہو گیا ہے یا پھر یہ کہ اس کا دماغی توازن درست نہیں ہے۔
اختر نے نوعمر اور نابالغ لڑکیوں سے لے کر نوجوان اور عمر رسیدہ عورتوں تک کا غائر نظروں سے جائزہ لیا ان سب میں بعض چیزیں مشترک ہونے کے باوجود معمولی اختلاف ضرور موجود تھا اور پھر اسے ایسا محسوس ہونے لگا کہ جو چیزیں پہلے مضحکہ خیز محسوس ہوتی تھیں ان میں پُراسرار قسم کی کشش پائی جاتی ہے وہ حیرت انگیز طور پر ان کی طرف اپنے آپ کو کھنچتا ہوا محسوس کرنے لگا تھا۔
یہ آہو تے وحشی جو اُن سے دور دور رہنا چاہتا تھا اب اس کا یہ جی چاہنے لگا کہ ان کے قریب رہے، انہیں دیکھتا رہے۔ ان کے پاس، ان کے ساتھ اٹھے بیٹھے لیکن ایسا کرنے میں وحشت بھی محسوس ہوتی تھی۔
نواب صاحب کی نازک اور ناگفتہ بہ حالت کے پیش نظر یہ طے پایا کہ انہیں شہر لے جایا جائے چنانچہ اس پر فوراً عمل درآمد ہوا اور قریب المرگ نواب صاحب شہر لے جائے گئے ان کے ساتھ ہی اختر بھی شہر چلا گیا۔
جب وہ دوسرے بہت سوں کے ساتھ حدِ نظر کے اُس پار بڑھ رہا تھا تو اس کے دل کی عجیب حالت تھی اسے اس سرزمین کو دیکھنے کی کیسی کچھ خواہش رہی تھی۔ اس کا دل بلیوں اُچھلنے لگتا تھا اور پھر جب شہر میں یہ قافلہ داخل ہوا اور اختر نے اپنے آس پاس اور آگے پیچھے چاروں طرف کچے پکے اونچے نیچے رنگ برنگے مکانات کا سلسلہ دیکھا تو آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ یہاں قدم قدم پر لوگوں کی آمد و رفت تھی۔ یہاں عورتوں، یعنی عجیب سی مخلوق کی بہتات تھی، مختلف لباسوں، مختلف قامتوں اور مختلف وضع قطع کی بے شمار عورتیں۔



ملازم نے تنہائی میں اختر کو سمجھایا کہ شاذیہ اس کی بہن ہے اور انوری اس کی خالہ، یہ خونی رشتے ہیں۔ اختر کو ان کا خیال رکھنا چاہیے یہ پاک رشتے ہیں لیکن یہ ساری باتیں اختر کی سمجھ سے ماورا تھیں، خونی رشتے پاک رشتے، یہ ساری غیر مانوس باتیں تھیں، اسے

لوگوں کی بھیڑ بھاڑ اور بہت زیادہ بات چیت سے وحشت ہونے لگتی۔ وہ پھر اپنی پرانی جگہ واپس چلا جانا چاہتا تھا لیکن سرپرست مجبور تھا۔ خاندان کے لوگ بہت پریشان تھے کہ یہ کیسا جنگلی لڑکا ہے جو کچھ سمجھتا ہی نہیں۔ لڑکیاں اور عورتیں خوفزدہ رہنے لگیں کہ کہیں کسی وقت یہ وحشی کوئی الٹا سیدھا قدم نہ اُٹھا بیٹھے، شاذیہ بھی دور رکھی جاتی۔ انوری خالہ بھی دور دور رہتیں۔ بزرگوں نے یہ طے کیا کہ اسے محلے کے لڑکوں میں زیادہ سے زیادہ میل جول بڑھانے کا موقع دیا جائے وہاں سے رفتہ رفتہ سوسائٹی کا آدمی بن جائے گا اور اس کے دیرینہ ملازم کے ذمے یہ فرض کیا گیا کہ وہ وقتاً فوقتاً اسے ضروری اخلاقی تعلیم دیتا رہے، اس طرح آہستہ آہستہ ایک نہ ایک دن وہ بے ضرر اور نیک انسان بن جائے گا لیکن جب عمل کا وقت آیا تو دشواری یہ پیش آئی کہ وہ محلے کے لڑکوں سے گھبرانے لگا۔ وہ ان سے بھاگتا اور کسی کمرے یا کوٹھری میں چھپ جاتا۔ بس ایک ملازم ہی ایسا تھا جس سے وہ مانوس تھا وہ اس سے مذہب کی بات کرتا تو وہ پوچھتا کہ "یہ مذہب کیا چیز ہوتی ہے؟" جب ملازم مذہب کی تفصیلات سمجھاتا تو اس کا جی اُلجھنے لگتا اور ساری باتیں فلسفے کی طرح خشک، مہمل بے معنی اور فضول سی معلوم ہوتیں، اسی لئے ان کا دل پر کوئی اثر ہی نہ ہوتا۔
ملازم اخلاقیات کا ذکر چھیڑتا تو یہ باتیں بھی اسے پیچیدہ اور تکلیف دہ محسوس ہوتیں، دن یوں ہی گزرتے رہے۔ نواب صاحب مستقلاً بستر پر گر گئے۔ ان کا نصف حصہ بیکار ہو چکا تھا زبان میں لکنت آ گئی تھی کوئی بات کرنے تو سمجھ میں نہ آتی کسی وقت چلنا چاہتے تو سیدھے پیر سے گھسٹتے ہوتے چلتے عقل اور شعور بھی جواب دے گئے تھے۔ اختر انہیں دیکھتا اور بے تعلق آدمی کی طرح بس دیکھتا رہ جاتا۔ شاذیہ اور خالہ انوری یہ دونوں وہ پہلی عورتیں تھیں جنہیں اس نے پہلی بار دیکھا تھا اور یہ دونوں ہی اس کے دل و دماغ میں بُری طرح سما گئی تھیں، وہ ان دونوں سے قریب رہنا چاہتا اور دونوں اس سے بچتی پھرتیں، اس کے سینے میں ایک آگ سی لگی رہتی وہ ان سے دور رہ کر اُداس اُداس رہنے لگا اس نے اپنی اس کیفیت کا اظہار اپنے ملازم پر کیا اور اس سے دریافت کیا کہ "یہ کیا چیز ہے؟"

ملازم نے آگے پیچھے دیکھ کر آہستہ سے جواب دیا۔ "چھوٹے نواب صاحب! اسے محبت کہتے ہیں؟"

اس نے پریشان ہو کر پھر پوچھا۔ "یہ محبت کیا چیز ہوتی ہے؟"

ملازم اپنی استطاعت بھر محبت کے معانی و مطالب سمجھاتا رہا جس کا مفہوم یہ تھا کہ عورت اور مرد ایک دوسرے سے محبت کرنے ہی کے لئے پیدا کئے گئے ہیں اور جب سے یہ دونوں اس دُنیا میں آئے ہیں محبت کرتے رہے ہیں، یہ ایک فطری اور قدرتی عمل ہے جس سے کوئی انسان محفوظ نہیں۔

اختر نے آہستہ سے کہا۔ "تو میں ان دونوں سے محبت کرنے لگا ہوں؟"

ملازم کے ہونٹوں پر افسوسناک مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ "لیکن چھوٹے نواب صاحب! آپ کو ان دونوں سے محبت نہیں کرنی چاہیئے!"

"کیوں؟" اختر نے حیرت سے سوال کیا۔

"اس لئے کہ ان میں سے ایک تو آپ کی بہن ہے اور دوسری خالہ" ملازم کہنے لگا "وہ محبت جسے آپ اپنے سینے میں محسوس کر رہے ہیں ان دونوں سے نہیں کی جا سکتی۔ ان سے تو ایک دوسری ہی قسم کی محبت کی جا سکتی ہے!"

اختر کے لئے ہر بات نئی تھی، ہر بات نئی عجیب اور مہمل سی۔ "کیا محبت کی بھی قسمیں ہوتی ہیں؟"

"ہاں!" ملازم نے جواب دیا۔ "کچھ حقیقی اور خونی رشتے ہوتے ہیں یہ مقدس رشتے کہلاتے ہیں ان سے پاک محبت کی جاتی ہے ان کے علاوہ عورتوں سے تم یہ محبت کر سکتے ہو جس کی آگ تمہارے سینے میں لگی ہوئی ہے۔"

اور اختر ایک بار پھر سوسائٹی کے آداب اقدار اور معاشرے کی طوطا مینا میں اُلجھ کر رہ گیا۔

گھر کا نظام خالہ انوری کے ہاتھ میں تھا جو لوگ مہمانوں کے طور پر آئے تھے اپنے اپنے گھروں کو واپس چلے گئے۔ گھر میں یا تو ملازم رہ گئے یا نوکرانیاں، شاذیہ بھی تھی لیکن وہ اپنے وحشی بھائی سے چھپتی پھرتی تھی۔ ایک کمرے میں بیمار نواب صاحب دراز رہتے اختر بھی اپنے کمرے میں اپنے پُرانے ملازم کے ساتھ اُکتایا اُکتایا زندگی گزار رہا تھا۔ جب موقع ملتا، خالہ انوری یا شاذیہ کو ٹکٹکی لگائے دیکھتا رہتا۔ یہ عجیب بات تھی کہ اس کی طرف سے ابھی تک کسی قسم کی زیادتی یا بیہودگی کا اظہار نہ ہوا تھا۔ رفتہ رفتہ شاذیہ اور خالہ انوری پر یہ تاثر قائم ہوا کہ اختر اُجڈ وحشی ضرور ہے لیکن ضرر رساں نہیں ہے۔ انہیں اس کی حالت پر رحم بھی آنے لگا خاص طور پر خالہ انوری کو اس کی حالت پر بڑا افسوس ہوتا۔ ان کے دل سے اختر کا خوف نکل گیا اور وہ اسے اپنے پاس بلا کر شفقت و محبت کا برتاؤ کرنے لگیں لیکن شاذیہ اب بھی محتاط ہی رہتی۔

ایک دن نصف رات تک اختر کو نیند نہیں آئی۔ اس کے دل کی عجیب حالت ہو رہی تھی۔ کوئی اس کے دل کو مسل رہا تھا۔ بار بار خیال شاذیہ اور خالہ انوری کی طرف منتقل ہو جاتا۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہ آتا کہ اسے کیا کرنا چاہیئے کیونکہ اسے منع کیا گیا تھا کہ یہ جو کچھ ہو رہا ہے غلط ہے، اسے اس طرح نہیں ہونا چاہیئے۔ اسے اس نئی جگہ سے سخت شکایت اور جھنجھلاہٹ تھی کہ یہاں صحیح اور غلط کی بڑی اُلجھن پائی جاتی تھی۔ یہ غلط ہے یہ ناجائز ہے یہ ناروا ہے قدم قدم پر بندشیں، جگہ جگہ رُکاوٹیں اور ہر آن نگرانیاں، اس کا یہاں سے دل اُکتا گیا۔ اس کے جی میں آئی کہ وہ یہاں سے فرار ہو کر اپنی پرانی جگہ واپس چلا جائے لیکن جانے سے پہلے خالہ انوری اور شاذیہ سے ضرور ملنا چاہتا تھا۔ وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا اس نے اپنے پلنگ سے دور کونے میں سوتے ہوئے ملازم پر نگاہ ڈالی اور پھر آہستہ سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ملازم کے پاس گیا اور جب یہ اطمینان ہو گیا کہ وہ سو چکا ہے تو چپ چاپ کمرے سے باہر نکلا اور خالہ انوری کے کمرے کی طرف چل پڑا۔



دستک دینے کا سوال ہی نہ پیدا ہوتا تھا دروازے کو دھکا دیا اور اندر داخل ہو گیا۔ اندر ہلکی ہلکی روشنی ہو رہی تھی، انوری دوپٹے سے بے نیاز، سر کہیں، ہاتھ کہیں، پاؤں کہیں، محو خواب تھیں، سانسوں سے پیدا ہونے والا زیر و بم اختر کو اتنا دلکش لگا کہ وہ سحر زدہ دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔ وہ انوری کے قریب جا کر ان پر جھک گیا اور انہیں غور اور انہماک سے دیکھنے لگا۔ اس کے دل

کی دھڑکنیں تیز ہوگئیں اندر ایک طوفان برپا تھا جو کسی طرح اِس
کے قابو میں نہ آتا تھا معلوم نہیں کیوں وہ کوئی قدم اُٹھاتے ہوتے
ڈر رہا تھا اسے اندازہ تھا کہ وہ عجیب لوگوں میں پھنس گیا ہے جہاں
معلوم نہیں کیا خوب ہے کیا ناخوب، کیا جائز ہے اور کیا ناجائز۔ پھر
اس سے نہ رہا گیا اور اس نے غیر شعوری طور پر ایک ہاتھ انوری
کی پیشانی پر رکھ دیا اسے یہ بہت اچھا لگا۔ ایک عجیب اجنبی لیکن
خوشگوار احساس سے وہ آشنا ہوا۔ انوری کی آنکھ کھل گئی اور وہ
چیخ مار کر اُٹھ بیٹھی، اختر گھبرا گیا اور بوکھلا کر جو بھاگا تو دروازے سے
ٹکرا گیا چوٹ کی پروا کئے بغیر وہ اپنے کمرے میں واپس گیا اور
جاتے ہی اپنے پلنگ پر اوندھے منہ گر گیا۔ ان عجیب جذبوں اور
ناقابلِ فہم کیفیتوں کی سرکشی نے اسے پسینے پسینے کر دیا وہ سسک
سسک کر رونے لگا۔

خالہ انوری کی چیخ سے نوکرانیاں بھی جاگ اُٹھیں اور شازیہ
بھی اُٹھ بیٹھی، یہ سب ان کے کمرے میں جمع ہوگئیں، خالہ نے اختر کو
پہچان تو لیا تھا لیکن لوگوں کے پوچھنے پر انہوں نے جھوٹ کا سہارا
لیا انہوں نے کہا کہ وہ ایک بھیانک خواب سے ڈر گئی تھیں، خالہ نے یہ
جھوٹ غالباً اپنے بھانجے کو رُسوا ہونے سے بچانے کے لئے بولا تھا
جمع ہونے والے اپنی اپنی جگہ واپس چلے گئے۔ خالہ انوری نے شازیہ
کو اپنے کمرے ہی میں روک لیا وہ بہت ڈری ہوئی تھیں، انہوں
نے کمرے کو اندر سے بند کر لیا اور دیر تک فرضی خواب کی باتیں
کرتی رہیں۔

نواب صاحب جب سے مفلوج ہوئے تھے ان کی نیند ہی اُڑ گئی
تھی۔ ہر وقت جاگتے رہتے کسی وقت اگر آنکھ لگتی بھی تو ذرا سی آہٹ
پر پھر کھل جاتی۔ اس ہنگامے کی انہیں بھی خبر ہوگئی تھی لیکن اب وہ
ہر بات سے بے نیاز تھے انہیں کسی بات کا نہ تو خوف تھا، نہ فکر نہ
تشویش، ممکن ہے ذہن میں جستجو نے تحریک کی ہو لیکن اس کا اظہار نہ ہو سکا۔



صبح انوری نواب صاحب پر جا کر برس ہی تو پڑی اور آہستہ
آہستہ بڑی باتیں سُنا ڈالیں، انہیں غصہ تو اس بات کا تھا کہ اس
خطرناک وحشی کو گھر سے نکالا بھی نہ جا سکتا تھا اور اس کا کوئی بھرم سا
بھی نہ تھا عجیب بے بسی کا عالم تھا پہلے تو انوری کا یہ خیال تھا کہ



"عُمدہ کیچ"

نواب صاحب پر ان کی ان باتوں کا کوئی اثر نہ ہوگا لیکن جب وہ
چپ ہوئیں تو ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی، نواب صاحب
بے بسی سے انوری کی باتوں پر مسکرا رہے تھے۔

انوری کا پارہ اور زیادہ چڑھ گیا۔ "اب ہنستے ہو آخر تم نے
سوچا کیا تھا جو اسے وحشی بنا ڈالا، تم نے ایک زندگی برباد کر دی۔
صرف ایک ہی نہیں، ہم سب کی زندگیاں برباد کر دیں" پھر وہ
روہانسی ہوگئیں "میں سوچتی ہوں کہ آخر اس غریب کا اب بنے گا
کیا؟ یہ تو کہیں کا بھی نہ رہ گیا۔ عادتیں اتنی پختہ ہو چکی ہیں کہ انہیں
بدلنا بہت مشکل ہے کم از کم یہ تو سوچا ہوتا کہ تمہاری ایک ہی
اولادِ نرینہ تھی جسے تم نے یوں برباد کر کے رکھ دیا"
اس کے بعد وہ پھوٹ پھوٹ کے رونے لگیں،

نواب صاحب اب بھی مسکرا رہے تھے، مجبوری اور بے بسی
کی مسکراہٹ ان کے ہونٹوں پر نمایاں تھی کچھ کہا لیکن لکنت کی وجہ
سے سمجھ میں نہ آیا۔ پھر ہاتھ کے اشارے سے قلم اور کاغذ طلب کیا
انوری پنسل اور کاغذ لے آئیں۔ نواب صاحب نے رعشہ زدہ
اُلٹے ہاتھ سے بدقت تمام لکھا۔

"انوری! میں ایک تجربہ کرنا چاہتا تھا میں نے یقیناً اس
تجربے سے بہت کچھ اخذ کیا ہے۔ میں ٹھیک ہو جاؤں گا تو ان واقعات
کو قلمبند کروں گا تم ان باتوں کو نہیں سمجھو گی۔ اختر میری تحقیق کا مرکز

اُندلس میں بازشہب نامی ایک چور، چوری کے فن میں اپنا جواب نہ رکھتا تھا۔ اس نے اپنے اس فن کو اس وقت بھی پوری ہوشمندی اور شعور سے استعمال کیا جبکہ وہ حاکم وقت معتمد کے حکم سے ایک عام گزرگاہ پر درخت سے اُلٹا لٹکا دیا گیا تھا۔ اس کے بیوی بچے اس کے اردگرد کھڑے رو رہے تھے۔ سزا دینے والے سپاہی اِدھر اُدھر ہو گئے تھے۔ اسی عالم میں ایک تاجر بدوی اپنے خچر پر قیمتی سامان لے کر ادھر سے گزرا۔۔۔ بازشہب نے اسے آواز دی " او میاں جانے والے! ذرا میرے قریب تو آنا، دیکھو تو میں کس بُرے حال میں ہوں؟

بدوی اس عجیب و غریب تماشے کو دیکھنے کے لئے اس کے پاس آگیا۔

بازشہب نے کہا " بھائی! میں مشہورِ زمانہ چور بازشہب ہوں جسے معتمد نے اس درخت سے الٹا لٹکوا دیا ہے، براہ کرم میرا ایک کام کر دو کچھ بھروسا نہیں کہ میں زندہ بھی بچوں گا یا نہیں۔ میرے پیچھے میرے بیوی بچے جیسی کچھ پریشانیاں اٹھائیں گے وہ میں ہی جانتا ہوں۔۔۔ بہرحال جب مجھ کو پولیس نے گرفتار کیا ہے۔ اس وقت میرے پاس سو دینار تھے۔ انھیں میں نے پولیس کی نظریں بچا کر سامنے والے کنوئیں میں ڈال دیا تھا تم انھیں خاموشی سے نکال لو اور آدھے خود رکھ لو اور آدھے میرے بیوی بچوں کو دے دو، تمہاری بڑی مہربانی ہوگی۔

بدوی تاجر لالچ میں آگیا۔ اس نے اپنے قیمتی سامان سے بار خچر کو وہیں کھڑا کیا اور رسی کے ذریعے کنوئیں میں اتر گیا۔ بازشہب نے بیوی کو اشارہ کیا کہ رسی کو کاٹ دے اور سامان سے لدے ہوئے خچر کو لے کر فوراً گھر روانہ ہو جائے کیونکہ کنوئیں کے اندر کوئی دینار دینار نہیں ہیں"

بیوی بچوں نے بازشہب کے حکم پر عمل کیا اور بدوی تاجر کے خچر کو لے کر چلتے بنے۔

ہے۔ میں اس عجیب و غریب تحقیق اور دریافت کا دریافت کار ہوں، میں کچھ نئی باتیں اس بگڑی ہوئی سوسائٹی کو بتانا چاہتا ہوں، میں کچھ کرنا چاہتا ہوں ایک ایسا کام جو مجھے پائیدار اور نادرہ کار شہرت دے مگر میری صحت۔"

انوری نے ان چند سطروں کو پڑھا اور مذاق اڑانے کے انداز میں منہ سکیڑ لیا۔ "بوڑھا پاگل ہو گیا ہے خبطی، دماغ چل گیا ہے مفلوج ہو چکا ہے مگر دائمی اور پائیدار شہرت کے پیچھے پڑا ہوا ہے۔"

یہاں سے اُٹھ کر وہ اختر کے پاس چلی گئیں وہ پہلے ہی ان کی طرف منہ کئے انہیں گھور رہا تھا جب انوری اس کے کمرے میں داخل ہوئیں تو اس کے چہرے پر مسرت کی لہر دوڑ گئی خالہ انوری اس کے سامنے کرسی پر بیٹھ گئیں "یہ رات کو تمہیں کیا سوجھی تھی؟" انہوں نے بلا کسی تمہید کے سوال کیا۔

اختر نے کوئی جواب نہ دیا بس گھورتا رہا۔

" میری بات کا جواب کیوں نہیں دیتے؟"

" تم مجھے اچھی لگتی ہو بہت اچھی" اختر بولا " میں تمہیں دیکھنے گیا تھا"

انوری نے محسوس کیا کہ اس وقت بھی اس کی اندرونی کیفیت آنکھوں میں سمٹ آئی ہے۔ انہوں نے کہا " لیکن تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیئے تھا!"

اختر کو غصہ آگیا۔ "کیوں؟ مجھے ایسا کیوں نہیں کرنا چاہیئے تھا؟"

" اس لئے کہ میں تمہاری خالہ ہوں ماں کی جگہ ماں کے برابر تمہیں میرا ادب کرنا چاہیئے"

خالہ، ماں، ادب اس مثلث نے ایک بار پھر اس کے دماغ کو چکرا دیا۔

" رحمو تو یہ بتاتا ہے کہ تم لوگ عورت ہو اور ہم مرد اور دونوں ہی ایک دوسرے کے لئے پیدا کئے گئے ہیں"

" لیکن کیا رحمو نے تمہیں یہ نہیں بتایا کہ میں وہ عورت نہیں ہوں جو تمہارے لئے پیدا کی گئی ہو"

" اور وہ شاذیہ؟"

" وہ بھی نہیں، وہ تمہاری بہن ہے" خالہ نے جواب دیا۔

" لیکن مجھے تم دونوں بہت اچھی لگتی ہو" اختر نے صاف صاف کہہ دیا " تم بھی اور شاذیہ بھی"

" بے وقوف" خالہ جھنجلا کر بولیں " کچھ سمجھتا ہی نہیں، تجھے یہ بات کس طرح سمجھاؤں کہ تو جنگلی ہے، وحشی جانور، ایک ایسا جانور جو بولتا ہے باتیں کرتا ہے لیکن زمانے کے آداب اور طور طریق سے ناواقف ہونے کی وجہ سے کسی جانور سے کم نہیں"

اور اختر پھر ان بہت ساری پیچیدہ باتوں میں اُلجھ کر رہ

گیا۔ اسے انوری اب بھی بہت اچھی لگ رہی تھی۔ اس میں تکلف ادب، لحاظ یا اخلاق نام کی کوئی چیز تھی ہی نہیں، وہ بے ساختہ آگے بڑھا اور انوری سے لپٹ گیا۔ انوری پہلے تو کسمسائیں لیکن پھر انہیں اپنے وحشی اور سادہ لوح بھانجے پر بڑا رحم آیا۔ وہ اسے دیکھ کر رونے لگیں، اس کے لئے ان کا دل اندر سے پگھلنے لگا۔ انہوں نے جدوجہد ترک کر دی روتے اور سسکتے ہوئے اس معصوم بے خبر اور مظلوم انسان کو چمٹا لیا۔

اور پھر سرگوشی میں یہ حیرت انگیز خبر گشت کرنے لگی کہ اختر انوری کی ہر بات مان لیتا ہے۔ وہ ان کا مطیع و فرمانبردار ہو گیا ہے وہ جو کہتیں مان جاتا لیکن سرکشی موجود ضرور تھی، خالہ انوری پیار و محبت سے اس وحشی کو رام کر رہی تھیں۔ اپنے بھانجے پر اب ان کی خصوصی توجہ تھی۔ اختر کی بھی ساری توجہ خالہ انوری کی طرف رہتی۔ انوری نے اسے بدلنا چاہا، اسے اخلاقیات کے درس دیئے لیکن اختر کو اس ذکر ہی سے وحشت ہونے لگتی۔ اسے مذہبیات پر ہلکی پھلکی کتابیں پڑھنے کو دی گئیں لیکن ان کی بہت سی باتیں اختر کی سمجھ میں نہ آئیں اور جب انہیں سمجھانے کی کوشش کی جاتی تو اس کی مثال اس پشتے یا بند جیسی ہو جاتی جو سرکش اور قابو سے باہر طوفان کی موجودگی میں تعمیر کیا جا رہا ہو۔ اخلاقی عقائد کے پشتے خواہشات نفسانی اور جذبات سفلہ کی ہنگامہ خیز اور تند و تیز موجوں میں ڈھ جاتے۔

شاذیہ اپنی خالہ انوری کی احسان مند تھی کہ انہوں نے اس سرکش کو اپنے قابو میں کر لیا تھا۔ اب بھی وہ دور ہی دور رہتی کیونکہ اس کا کوئی بھروسا بھی نہ تھا لیکن اگر کسی وقت شاذیہ کا اختر سے سامنا ہو جاتا تو اختر پر وحشیانہ دورہ پڑنے لگتا۔ اور شاذیہ بھاگ کر کسی کمرے میں روپوش ہو جاتی۔ محلے میں اب یہ خبر گرم تھی کہ اختر ایک پاگل اور مجذوب قسم کا شخص ہے۔

پورے گھر اور محلے میں ان دونوں کی بابت قابل اعتراض سرگوشیاں ہونے لگیں لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے خالہ انوری کو اس کی کوئی پرواہ نہ ہو، انہیں تو اپنے بھانجے کی اصلاح اور دل جوئی مقصود تھی۔ ان کے چہرے سے بلا کا عزم تھا۔



اور پھر ایک نئی تبدیلی رونما ہوئی، نیا انقلاب برپا
اب اختر پہلے سے زیادہ خطرناک ثابت ہونے لگا تھا۔ اچانک
کی دیوانگی عزت آبرو کے خطرے کا باعث بن گئی۔ پہلے تو
انوری اور شاذیہ کو بس دیکھ کر ہی رہ جاتا تھا لیکن اب اس
یہ تبدیلی رونما ہوئی کہ وہ گھر کی نوکرانیوں کو بھی گھورنے او
پر حملہ آور ہونے لگا تھا۔ جہاں جس وقت اور جس کے لئے
چاہتا پکڑ لیتا۔ اس کی اس حرکت پر انوری نے کئی بار اس کی
بھی کی لیکن وہ مار کھانے پر بھی اپنی حرکت سے باز نہ آیا۔ لوگ
اس کے منہ کو خون لگ چکا ہے۔

نواب صاحب لیٹے لیٹے یہ سب دیکھ رہے تھے اور
رہے تھے۔

شاذیہ اب بالکل غیر محفوظ ہو گئی تھی اسے وہاں سے
ہٹا دیا گیا اور وہ اپنے ماموں کے پاس چلی گئی۔ انوری اس



شادی جلد از جلد کر دینا چاہتی تھیں کیونکہ شازیہ اپنے شوہر کے گھر میں ہی زیادہ محفوظ اور خوش رہ سکتی تھی۔

شازیہ کے چلے جانے کے بعد وہ کئی دن تک پریشان پریشان اِدھر اُدھر پھرتا رہا ایسا لگتا جیسے اس کا کسی بات میں دل ہی نہ لگ رہا ہو۔ شازیہ کے کمرے میں جاتا۔ اس کے در و دیوار کو ہاتھوں سے سہلاتا، اس کے پلنگ پر لیٹ جاتا اور بے چینی سے اِدھر اُدھر کروٹیں بدلتا رہتا پھر اُٹھتا اور شازیہ کے کپڑوں کو ناک سے لگا کر انہیں سونگھتا رہتا۔

وہ انوری سے پوچھتا "شازیہ کہاں چلی گئی؟"

انوری نے کہا "اپنے ماموں کے پاس!"

"یہ ماموں کیا چیز ہوتی ہے؟" اس نے حیرت سے سوال کیا۔

"ماموں ماں کے بھائی کو کہتے ہیں" انوری نے جواب دیا۔

اور پھر وہ ماں اور ماموں کی پہیلی میں اُلجھ کر رہ گیا۔ آخر کار دریافت کیا "وہ ماموں کے پاس کیوں گئی ہے؟"

"اس لئے کہ تم اسے بہت ستاتے تھے اور اسے تمہاری طرف سے خطرہ تھا۔"

"کیسا خطرہ؟" وہ حیرت سے خالہ انوری کو گھورنے لگا۔

"وہی خطرہ جو تمہاری غیر سماجی تربیت کے سبب سب کو ہے جو پہلے مجھے تمہاری طرف سے محسوس ہوتا تھا۔" انوری نے معنی خیز انداز میں کہا۔

"میں اس کے پاس جاؤں گا!" اختر نے سادگی سے اپنی خواہش کا اظہار کر دیا۔

"نہیں تم وہاں نہیں جا سکتے۔ وہ تمہاری بہن ہے تمہیں اس سے دور دور رہنا چاہیئے!"

"آخر کیوں آخر کیوں؟" اس نے فرطِ جذبات سے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا۔

"وہ تمہاری بہن ہے!" خالہ انوری کے پاس ایک ہی جواب تھا۔

"ہمیں کس نے پیدا کیا؟" اختر نے بے چینی سے سوال کیا

"اللہ نے!"

"وہ کہاں ہے؟"

"ہر جگہ!"

"یہاں بھی؟"

"ہاں یہاں بھی!"

"وہ ہمیں نظر کیوں نہیں آتا وہ یہاں کہاں ہے؟ اس نے ہمیں کس طرح پیدا کیا!"

اور خالہ انوری نے اس معصوم کو آدم و حوا کی پوری کہانی مزے لے کر سنا دی۔ وہ پلک جھپکائے بغیر بڑے انہماک سے یہ کہانی سنتا رہا اور ذہن پر زور دیتا رہا وہ اسے اپنے حافظے میں محفوظ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"ہمیں حوا نے پیدا کیا ہے؟" اس کا یہ نیا سوال تھا۔

"نہیں تمہاری ماں نے، جو میری بہن تھی!" انوری نے جواب دیا۔

"اور شازیہ کو؟"

"شازیہ کو بھی تمہاری ماں نے پیدا کیا تھا!" انوری دم بخود ہر بات کا مختصر جواب دے رہی تھیں۔

اور جب انوری نے اسے یہ بتایا کہ جب کسی لڑکی اور لڑکے کی ماں ایک ہو تو وہ آپس میں اس طرح نہیں رہ سکتے جس طرح دوسرے مرد و عورت ساتھ رہتے ہیں۔

اختر کا ذہن غالباً پہلی بار منطق اور دلیل کی طرف مائل ہوا "لیکن تم تو کہتی تھیں کہ آدم ایک تھے اور حوا ایک تھیں پھر ان کی اولادیں دور دور کیسے رہی ہوں گی۔ آدم دو اور حوا دو بھی تو پیدا کی جا سکتی تھیں!"

اور اس کے اس اچانک جملے نے انوری کو حواس باختہ سا

ایک صاحب ٹریفک کے حادثے میں زخمی ہوئے۔ جب مقدمہ عدالت میں پہنچا تو مجسٹریٹ نے حیرت سے سوال کیا کہ "ڈاکٹر کی رپورٹ میں تو یہ ہے کہ تم شدید زخمی ہوئے ہو۔ اور تمہارا وہ بیان جو تم نے پولیس کو دیا یہ ہے کہ تمہیں خراش تک نہیں آئی۔ یہ کیا چکر ہے؟"

اس نے جواب دیا "جناب اصل قصہ یہ ہے کہ میں اپنے گھوڑے پر سوار جا رہا تھا کہ ان صاحب کی کار سے ٹکر ہو گئی۔ میں اور میرا گھوڑا دور جا گرے۔ یہ صاحب کار سے اترے اور گھوڑے کو دیکھ کر فرمانے لگے "اوہ۔ اس بیچارے کی تو ٹانگیں ٹوٹ گئیں۔ پھر جیب سے پستول نکالا اور اسے گولی مار دی۔ گھوڑا وہیں ٹھنڈا ہو گیا۔ ادھر سے فارغ ہو کر یہ صاحب میرے پاس آئے اور پوچھا "زیادہ چوٹ تو نہیں آئی؟" میں گھوڑے کا حشر تو دیکھ ہی چکا تھا۔ فوراً اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور جواب دیا کہ صاحب! میں بالکل ٹھیک ہوں، خدا نے بڑا کرم کیا۔ مجھے تو خراش تک نہیں آئی۔

اس کے بعد جب پولیس موقع پر پہنچی تو میں نے یہی بیان دہرا دیا کیونکہ یہ صاحب اس وقت بھی پاس ہی موجود تھے، اور ان کا پستول بھی ان کی جیب سے جھانک رہا تھا۔"

کر دیا۔ اس میں تو بلا کا شعور پیدا ہو چلا تھا۔ کمال کا علم آتا جا رہا تھا لیکن افسوس تو یہی تھا کہ یہ شعور اور یہ علم ایسا ہی تھا جو اچانک جانوروں کو مل جائے اور وہ اپنے شعور اور علم کو اپنی وحشیانہ زندگی کے جواز میں استعمال کریں۔ انوری اسے سمجھائیں کہ دیکھو ہم جہاں رہتے ہیں وہ جگہ سماج کہلاتی ہے۔ سماج بدلتا رہتا ہے پہلے بات اور تھی اب اور ہے۔



نواب صاحب کو علاج کی غرض سے باہر بھیجنے کا پروگرام بنا لیکن شاذیہ کی شادی مقدم تھی۔ شاذیہ کے ماموں مذہبی آدمی تھے۔ جب سے شاذیہ ان کے گھر گئی تھی وہ بہت فکرمند ہو گئے تھے۔ جب انہوں نے یہ سنا کہ نواب صاحب علاج کی غرض سے باہر جانے والے ہیں تو انہوں نے یہ ضروری سمجھا کہ نواب صاحب کی موجودگی ہی میں شاذیہ کی شادی ہو جانی چاہیے۔ اس کے علاوہ اختر کے سلسلے میں جو کچھ انہیں معلوم ہوا تھا وہ بہت تشویشناک تھا پھر اپنی بہن انوری اور اختر کے بارے میں جیسی دل آزار خبریں مشہور ہو رہی تھیں، کسی عزت مند کی موت کے لئے کافی تھیں۔ لیکن یہ ساری باتیں سنی سنائی تھیں، مشاہدہ کسی کا نہ تھا۔ یہی چند مسئلے تھے جنہیں حل کرنے کے لئے وہ مفلوج نواب سے مشورہ اور انوری اور اختر کے تعلقات کا خود مشاہدہ کرنا چاہتے تھے۔

بیمار نواب نے شاذیہ کی شادی کی بلا تامل اجازت دے دی۔ ماموں کا گھر میں چار دن قیام رہا۔ اس دوران انہیں یہ ضرور محسوس ہوا کہ انوری اختر کا غیر معمولی خیال رکھتی ہے لیکن اس کے علاوہ اور کوئی قابل اعتراض بات دیکھنے میں نہ آئی۔ گھر کی نوکرانیوں پر اختر کی دراز دستیاں بھی دیکھنے میں آئیں لیکن انوری کے ڈانٹنے پر وہ سنبھل جاتا۔ ماموں نے جب بھی کوئی ایسا حیا سوز منظر دیکھا لاحول ضرور پڑھ دیا۔ ماموں کو یہ تعجب ضرور تھا کہ یہ وحشی انوری کا فرمانبردار کیوں ہے؟ لیکن چلتے چلاتے اس کا جواب بھی مل گیا۔

ایک دن جب وہ گھر سے جانے کے بعد اچانک فوراً ہی واپس آئے تو انہیں ایسا لگا جیسے گھر کے ہر ملازم کی سانس رک گئی ہو۔ سب دم بخود خوفزدہ خوفزدہ جو جس حالت میں اور جس جگہ تھا وہیں کا ہو رہا۔ لیکن ان کی نظریں گاہے گاہے اسی کمرے کی طرف اٹھ جاتیں جس میں اختر رہتا تھا۔ ماموں کو فضا کچھ بدلی ہوئی محسوس ہوئی۔ انہوں نے انوری کو ادھر ادھر کمروں میں تلاش کیا۔ کا کہیں پتا نہ تھا۔ اسی حالت میں وہ مفلوج نواب کے پاس پہنچ گئے اور اشاروں میں انوری کو دریافت کیا۔ نواب کے ہونٹوں پر شریر اور معنی خیز مسکراہٹ پھیل گئی اور اختر کے کمرے کی طرف اشارہ کر

اس وقت ماموں کا عجیب عالم تھا۔ ان کے سارے جسم میں سنسنی دوڑ گئی تھی۔ پیروں میں جان نہ تھی رکھتے کہیں تھے پڑتے کہیں تھے۔ دل انجانے خوف سے سہما ہوا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ اختر کے کمرے کی طرف بڑھے۔

گھر کے ملازم اپنے اپنے کاموں میں لگ گئے لیکن ان سب کی توجہ کسی متوقع ہنگامے کی طرف تھی۔ ماموں نے دروازے کو دھکا

دے کر کھولنا چاہا لیکن وہ اندر سے بند تھا۔ اب ان کی وحشت اور اضطراب میں اضافہ ہوگیا تھا۔ انہوں نے بے تحاشا دروازہ پیٹنا شروع کردیا۔ منہ سے ایک لفظ نہ نکالا۔ اندر سے انوری کی آواز سنائی دی۔ "کون ہے؟ کیا کام ہے؟"

ماموں نے پھر تھپتھپانا شروع کردیا۔

"اوہ۔ کون گستاخ ہے نوکری سے نکال باہر کروں گی۔"

ماموں نے لگاتار مکوں کی بارش کردی، تھوڑی دیر بعد دروازے کھل گئے۔ اور ماموں اندر داخل ہوگئے۔ انوری کی جان نکل گئی۔ ماموں نے بے تحاشا چھڑی برسانا شروع کردی، انوری ان کا نشانہ تھی۔ انوری بڑی منتشر تھی۔ اور اپنے بھائی کے وار دونوں ہاتھوں سے روکنے کی کوشش کررہی تھی۔ اختر پہلے تو یہ منظر دیکھتا رہا پھر چھلانگ لگا کر ماموں کے اوپر آگیا۔ ماموں نے کئی چھڑیاں اس کے بھی رسید کردیں، اس نے ماموں کو گدی سے پکڑلیا۔ بوڑھے ہاتھوں میں اتنا دم نہ تھا کہ وہ اختر جیسے وحشی اور اجڈ سے مقابلہ کرسکتے۔

گھر کے ملازم دروازے پر جمع ہوگئے لیکن اندر داخل ہونے کی کسی میں ہمت نہ تھی۔

ماموں دو ہی جھٹکوں میں زمین پر ڈھیر ہوگئے۔ اختر نے ماموں کو گرا کر چھوڑ دیا اور خود کونے میں پڑے ہوئے چارپائی کے سرے کو اٹھالیا وہ اس کی شدید ضرب سے ماموں کے سر کو پاش پاش کرنے ہی والا تھا کہ انوری درمیان میں آگئی۔ "اختر! خبردار جو ہاتھ چلایا۔"

اختر کا ہاتھ جہاں تھا وہیں رک گیا۔ "پھر یہ نہیں کیوں مارتا ہے؟" اختر نے گرج کر سوال کیا۔

انوری نے ماموں کو فرش سے اٹھنے میں مدد دی اور ان سے آنکھیں ملائے بغیر بولی۔ "انہوں نے جو کچھ کیا، درست کیا۔ انہیں یہی کرنا چاہیے تھا۔"

درست، نادرست، جائز ناجائز اختر کا دماغ پھر چکرانے لگا

ماموں کی کمر میں سخت چوٹ آگئی تھی، انوری انہیں ہاتھوں کا سہارا دے کر اپنے کمرے میں لے گئی۔ باہر ملازموں کو جمع دیکھ کر انوری کو غصہ آگیا۔ "ایک ایک کو نکال باہر کروں گی یہاں کیوں کھڑے ہو، چلو دفعان ہو کمبختو!"

وہ سب منتشر ہوگئے۔

مفلوج نواب بھی ان دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر عجیب ناقابل فہم مسکراہٹ کھیل رہی تھی جیسے وہ اس ہنگامے سے بہت خوش تھے۔

ماموں اور انوری کے پیچھے ہی اختر بھی چل پڑا۔ یہ تینوں ایک کمرے میں جمع ہوگئے۔

ماموں کو اس وحشی سے ڈر لگنے لگا تھا۔ "انوری! تم اس مردود کو نکال دو اس کمرے سے۔"

"نہیں یہ یہیں رہے گا!" انوری نے جواب دیا۔ "اس کی موجودگی سے ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔ تم سب لوگ اسے نہیں سمجھتے۔ تم سب وحشی ہو۔"

ماموں پھر تلملا اٹھے۔ "اس کو دیکھ کر میرے تن بدن میں آگ لگ جاتی ہے۔"

"آپ خود پر قابو پانے کی کوشش کیجیے۔" انوری نے جواب دیا۔

"یہ سب کیا ہے؟" ماموں نے اختر کو دیکھ کر انوری کو گھورا "کیا واقعی۔ لوگ سچ کہتے تھے۔"

انوری نے نظریں نیچی کرلیں۔ "یہ وہی ہے جو آپ سمجھ رہے ہیں!"

ماموں نے تڑپ کر کہا۔ "میں تم دونوں کو قتل کردوں گا۔"

"اس کا نتیجہ؟" انوری نے کہا۔ "خود پھانسی پر چڑھ جائیے گا۔"

"کوئی پروا نہیں، خاندانی عزت و وقار پر ہمیشہ جانیں قربان کی جاتی رہی ہیں!" ماموں کے سینے میں بھٹی سلگ رہی تھی، انوری نے ذرا تن کر جواب دیا۔ "کیا ان جانوں کی قربانیوں کا کبھی کوئی نتیجہ نکلا؟"

پھر اس نے اختر کی طرف ہمدردانہ نظر ڈالی اس کی نظر میں رحم تھا، جذبہ محبت تھا، شفقت تھی اور شیفتگی تھی۔ "یہ بہت مظلوم ہے اس پر ظلم ہوا ہے، یہ معصوم ہے!"

ماموں نے کڑک کر رعب سے دریافت کیا۔ "کیا تم توبہ کرنے پر تیار نہیں ہو اور اب تک ہوتا رہا ہے اس پر پشیمان بھی

نہیں ہو؟"

"نہیں!" انوری نے فوراً جواب دیا۔ "میں اسے نہیں چھوڑ سکتی اگر میں اسے چھوڑ دوں گی تو یہ کہیں کا بھی نہ رہ جائے گا۔"

ماموں نے نفرت سے کہا۔ "تم بہت بے شرم ہو تمہیں اپنے بڑے بھائی سے اس قسم کی گفتگو کرتے شرم نہیں آتی۔"

انہوں نے ترشی سے کہا۔ "کیسی شرم؟ شرم کو درمیان سے اٹھانے والے تو آپ خود ہیں، آپ کو ہم دونوں کے معاملات سے دلچسپی تھی۔ آپ ہمیں رنگے ہاتھوں پکڑنا چاہتے تھے سو پکڑ لیا آپ نے مجھے مارا اور آپ ہی ابھی مجھے قتل کی دھمکی دے رہے تھے اور اب سب سے آخر میں شرم کی بات کر رہے ہیں۔"

اختر ان دونوں کی باتیں نہایت غور سے سن رہا تھا ماموں اس جنگلی سے خوفزدہ تھے۔

ماموں نے زچ ہو کر کہا۔ "نواب علاج کے لئے باہر جانے والا ہے، شاذیہ کی میں شادی کروں گا اور شادی کے بعد ظاہر ہے کہ اس گھر پر نواب کی عدم موجودگی میں شاذیہ اور اس کے شوہر کا قبضہ ہوگا۔ اس وقت تم دونوں کہاں جاؤ گے۔ کیونکہ شاذیہ اور اس کے شوہر کو تم دونوں کی یہ باتیں ہرگز پسند نہ آئیں گی اور میں خود رسوائی کی اس زندگی سے موت کو ترجیح دوں گا۔ مجھ سے یہ سب برداشت نہ ہو سکے گا۔"

"ہم دونوں کہیں اور چلے جائیں گے!" انوری کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اس نے انہیں اپنے جمپر کے دامن سے پونچھ ڈالا۔

"تمہیں سب کچھ منظور ہے لیکن اختر کو چھوڑ دینا گوارا نہیں" ماموں نے نفرت سے کہا۔

"ہاں!" انوری نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "میں اس معصوم کا ساتھ ہرگز نہ چھوڑوں گی کسی قیمت پر بھی نہیں۔"

پھر ذرا دم لے کر بولی۔ "آپ لوگ یہ بات معلوم نہیں کیوں بھول جاتے ہیں کہ اگر درمیان میں، میں نہ آ جاتی تو یہ وحشی معلوم نہیں کتنوں کی زندگیاں برباد کر دیتا۔ اس کی حقیقی بہن شاذیہ تک اس سے محفوظ نہ رہتی۔ اس وقت آپ کی خاندانی عزت و وقار کا معلوم نہیں کیا حشر ہوتا۔ میں نے تو اس خاندان اور محلے والوں پر بڑا احسان کیا ہے کہ اختر کی سرکش اور غیر مہذب جبلت کو اپنی محبت کا اسیر کر لیا ہے اس کے بے روک ٹوک بہنے والے تند سیلاب کے آس پاس اپنی ذات، اپنی عزت و ناموس اور اپنی محبت کا پشتہ کھڑا کر دیا ہے، میں نے تو ایثار کیا ہے۔ میں نے اپنی غیرت کا سودا کیا ہے۔"

ماموں اسی وقت چلے گئے۔ انوری نے اختر کا ہاتھ پکڑا اور اسے لیکر اس کے کمرے کی جانب چل دی۔ انوری کے انداز میں اب کوئی حجاب نہ تھا۔ اس مرتبہ گھر کے ملازمین نے بھی ان دونوں کو ہاتھ میں ہاتھ ڈالے کمرے میں داخل ہوتے دیکھا۔ شرم اور حجاب، روایات اور اقدار کی دیواریں گرا کر ماموں واپس جا چکے تھے۔



دو مہینے کے اندر ہی شاذیہ کی شادی ہو گئی لیکن یہ شادی ماموں کے گھر سے ہوئی جس میں مفلوج نواب تو ضرور شریک ہوا لیکن اختر اور انوری کو نہیں شریک کیا گیا۔ اب نواب صاحب کو اپنے علاج کے سلسلے میں باہر چلا جانا تھا ان کے ساتھ اپنے شوہر کو لے کر شاذیہ بھی جا رہی تھی۔ نواب صاحب بیمار اور مفلوج ہونے کے باوجود عقل سے کام لے رہے تھے۔ انہوں نے جانے سے پہلے وکیل کو بلایا اور ایک وصیت نامہ تیار کرایا جس کی رو سے ان کی موت کے بعد کل جاگیر اور جائیداد کا دو تہائی شاذیہ کو دیا گیا تھا اور بقیہ سب کچھ اختر کا تھا اور اس کی نگراں اور سرپرست انوری کو نامزد کر دیا گیا تھا۔

اس کے بعد تینوں سفر پر روانہ ہو گئے۔ اختر اور انوری ـــ مالکانہ شان سے رہنے لگے ماموں نے اس منحوس اور آبرو باختہ مکان میں دوبارہ قدم نہ رکھنے کی قسم کھا لی تھی۔

نواب صاحب کو علاج معالجے میں ایک سال لگ گیا جب وہ واپس آئے تو گھر پر ماموں کا قبضہ تھا۔ انوری اور اختر نیپال کی ترائی والی اس کوٹھی میں چلے گئے تھے جہاں اختر کی تقریباً سولہ سترہ سال تک پرورش ہوئی تھی۔ اب نواب صاحب اچھے ہو چکے تھے۔ وہ شاذیہ اور اس کے شوہر کو گھر میں چھوڑ کر اختر اور انوری کے پاس چلے گئے۔ ان دونوں نے خوش اخلاقی سے نواب صاحب کا استقبال کیا۔ اب اختر میں کسی حد تک

تبدیلی آچکی تھی۔ نواب صاحب کو ان کے تعلقات یا رہن سہن پر کوئی اعتراض نہ تھا۔ پھر انہوں نے تخلیہ اختیار کیا اور حافظے کی مدد سے وہ ساری باتیں لکھنا شروع کر دیں جو اختر کی ذات سے پیش آتی رہی تھیں، انہوں نے بہت کچھ لکھا جس کا لب لباب یہ تھا۔

"جائز اور ناجائز اخلاق اور بد اخلاقی سچ اور جھوٹ کے نام سے لڑی جانے والی تمام جنگیں فضول اور احمقانہ ہیں یہاں ایک بات کسی ایک وقت اور زمانے میں درست اور جائز ہوتی ہے اور وہی بات کسی دوسرے وقت اور زمانے میں نادرست قرار پاتی ہے اگر ہم مذہب کی رو سے جنس کے معاملے کو دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ شروع شروع میں آدم و حوا کی حقیقی اولادیں آپس ہی میں وابستہ ہو جایا کرتی تھیں فرعون کے زمانے تک حقیقی بھائی بہنوں کی شادیاں جائز تھیں یہاں تک کہ عربوں میں باپ کی موت کے بعد اس کی بیوی سمیت جملہ املاک پر بیٹے کو حق تصرف حاصل ہوا کرتا تھا لداخ اور نیلگری ہلس میں آج بھی ایسے قبیلے موجود ہیں جہاں ایک ہی عورت کے کئی کئی شوہر ہوتے ہیں اور انہیں چند شوہری کہا جاتا ہے، ہندوؤں میں حقیقی بہن کے علاوہ رشتے کی بہن سے بھی شادی نہیں ہو سکتی لیکن ہمارے مذہب اور معاشرے نے انہیں ناجائز اور مذموم قرار دے دیا ہے۔ جو مشرق میں جائز ہے وہی مغرب میں ناجائز اور جو مغرب میں جائز ہے وہ مشرق میں ناجائز، کیا جائز ہے اور کیا ناجائز یہ سارے اضافی اور اخلاقی اعتبارات ہیں، ساری چیزیں یہاں اعتباری ہیں، جو ہے وہ اس لئے ہے کہ وہ قبول ہے وہ کیوں ہے اس کا کوئی منطقی جواز نہیں۔ لیکن جبلت اور فطرت؟ ایک مستقل صداقت ہے ایک دائمی اور ابدی صداقت اس کے گرد اخلاق، عقائد اور تہذیب کے نام سے باندھے جانے والے پشتے ہمیشہ کمزور ثابت ہوتے رہیں گے۔ انہیں بھی اگر کوئی طاقت قائم رکھے گی تو وہ جبلت ہی کی طاقت ہو گی، انسان کی یہ جبلت کہ یہ عقیدوں کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ عقل جو قدم قدم پر ٹھوکریں کھاتی ہے اس کے فیصلے کبھی ٹھوکر نہ کھانے والی جبلت کی صداقت کو نہیں پہنچ سکتے ہمیں ہمت حوصلے اور جرأت مندی کے ساتھ اس صداقت کو مان لینا چاہیئے۔

مجھے اختر اور انوری کے ایک ساتھ رہنے میں کوئی اعتراض نہیں کیونکہ ہمیں نہیں معلوم کہ مستقبل بھی اسے ناجائز قرار دے سکے گا یا نہیں۔"

مگر یہ نواب کی بھول تھی۔ وہ ایک انتہا پسند شخص تھا اور اس میں انتہا پسند کلیئے گھڑنے اور خود دماغی کا ایک فلسفیانہ اور ناآسودہ جذبہ موجود تھا اس نے اختر کو اپنے عجیب و غریب تجربوں کی بھینٹ چڑھا دیا۔ مگر وہ خود نہیں بدل سکا۔ وہ تو اسی سماج کا فرد تھا۔ اس کے جذبے، عادتیں، مزاج اور عقیدے اسی سماج سے عبارت تھے وہ اختر کے بدلے ہوتے سماج کو برداشت نہ کر سکا۔

انوری اور اختر یہاں تک بے لحاظ ہو گئے کہ نواب صاحب کی موجودگی اور عدم موجودگی اب ان کے لئے کوئی معنی نہ رکھتی تھی۔ اب نواب صاحب ایک دوسرے ہی کرب میں مبتلا ہو چکے تھے۔ وہ اپنے بیٹے کے لئے موجودہ سماج کو بدلنے پر قادر نہ تھے۔ اب انہیں اندازہ ہو گیا کہ ان سے کیا غلطی ہو گئی ہے وہ اداس اداس رہنے لگے انوری اور اختر کے تعلقات وہ کسی طور برداشت بھی کر لیتے مگر گھر کے ملازمین کی گستاخ نگاہوں کو برداشت کرنا ان کے بس میں نہیں تھا انہوں نے راہ فرار اختیار کی اور شہر واپس چلے گئے۔ وہ یہ بے ہودگیاں برداشت نہ کر سکے۔ اس لئے کہ وہ تو اسی سماج کے آدمی تھے۔ انوری نے اختر کے لئے خود کو قربان کر دیا تھا مگر نواب صرف ایک اختر کے لئے اس کے علیحدہ سماج میں نہیں جانا چاہتے تھے۔

لے یہاں جبلت کا اصطلاحی (نفسیاتی) مفہوم نہ لیا جائے۔ مصنف نے اسے ذرا وسیع مفہوم میں استعمال کیا ہے۔ (مدیر)

لیکن کچھ ہی عرصے بعد یہاں کا سکون بھی ختم ہو گیا۔ گھر کے ملازمین اور
نوکرانیاں نواب صاحب کو دیکھ دیکھ کر کچھ پراسرار قسم کی سرگوشیاں
کرنے لگے تھے۔ سارا شہر انہیں کاٹنے کھانے کو دوڑتا تھا۔ ہر شخص کی
نظر میں ایک سوال تھا۔ شاذیہ بھی افسردہ افسردہ رہتی وہ بھی باپ سے
خوش نہ تھی۔ اسے لوگوں سے اپنے باپ کے حق میں بڑی اذیت ناک
اور تکلیف دہ باتیں سننا پڑتی تھیں، شاذیہ کا شوہر بھی ہنسی ہنسی میں
کسی کسی وقت طنز کر جاتا۔ جب وہ باہر نکلتے تو لوگ انہیں دیکھ کر
آپس میں کچھ عجیب قسم کے اشارے کرتے اور مسکرانے لگتے۔ شاذیہ کے
ماموں نے اس منحوس گھر اور نواب کی طرف حقارت سے اپنا منہ پھیر
رکھا تھا۔ نواب صاحب اس ماحول سے بھی تنگ آ گئے اور انوری
اور اختر کے پاس دوبارہ واپس چلے گئے۔

ایک دن صبح ہی صبح نواب صاحب اپنے کمرے کے
سامنے صحن میں کرسی ڈالے بیٹھے تھے۔ صحن کے اس پار عین کمرے
کے سامنے غسل خانہ تھا۔ نواب صاحب صبح کی دلوں کو موہ لینے والی
کیفیت سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ چڑیاں چہچہا رہی تھیں۔
عین اسی عالم میں ان کی نظریں اچانک غسل خانے پر جا پڑیں،
اس کا دروازہ کھلا اور اس میں سے یکے بعد دیگرے اپنے جسموں
پر چادریں لپیٹے خالہ انوری اور اختر برآمد ہوتے۔ انہیں ایک
جھٹکا سا لگا اور ایسا محسوس ہوا جیسے وہ دونوں نواب کا مذاق
اڑا رہے ہیں۔ نواب صاحب شدتِ جذبات سے مغلوب ہو گئے،
اٹھے اور دوڑتے ہوتے اپنے کمرے میں داخل ہو گئے الماری
سے بھرا ہوا پستول نکالا اور دونوں کو سوچنے سمجھنے یا فرار ہونے کا موقع
دیئے بغیر قتل کر دیا ـــــ وہ دونوں خاک و خون میں تڑپ رہے
تھے نواب صاحب نے اسی پر بس نہیں کیا۔ ان پر دیوانگی اس حد تک
طاری ہو چکی تھی کہ جب تک وہ دونوں بے حس و حرکت نہ ہو گئے
ان دونوں کے سر پر مسلط رہے۔ اس کے بعد نہایت اطمینان سے
اپنے ملازم کو بلایا اور اسے ان دونوں کی لاشوں کے پاس جا کر کھڑا کر
دیا۔ ان کے دل کا ایک بوجھ تو اتر چکا تھا لیکن اس کی جگہ دل کو
آرے کی طرح چیرتے رہنے والے غم نے لے لی تھی۔

"شہر جاؤ اور پولیس اسٹیشن تک یہ اطلاع پہنچا دو کہ میں
نے ان دونوں کو قتل کر دیا ہے۔"

ملازم بدحواس ہو کر ایسا بھاگا کہ دور تک گھوم کے بھی نہ دیکھا
جب وہ پولیس کو لے کر کوٹھی میں داخل ہوا تو ان لاشوں
میں نواب کی لاش کا اضافہ ہو چکا تھا۔ نواب صاحب کی لاش
ان کے کمرے میں پڑی تھی۔ گولیاں ٹھوڑی کے نیچے نال رکھ کر
چلائی گئی تھیں اور وہ منہ سے گزر کر بھیجے کو پھاڑتی ہوئی سر
اوپر نکل گئی تھیں، میز پر نواب صاحب کے تجربات کی کتاب کھلی
تھی اور اس میں اتنا اضافہ کیا جا چکا تھا۔

میں خود اپنے تجربے کی زد پر آ گیا۔ میں یہ
بھول گیا کہ جبلت اور فطرت بدلے ہوئے سماجی
ماحول کی کسی قدر مطیع ہو جاتی ہے۔ ہم لوگ اتنے
آگے جا چکے ہیں کہ واپسی ممکن نہیں، اور کسی ایک
شخص یا گروہ کی واپسی سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔
اس شخص یا گروہ کا تعلق موجودہ سماج کے انسانوں
سے کٹ جاتا ہے۔ اور یہ بات علیحدہ ہونے والے
گروہ یا شخص کی سماجی موت کے برابر ہے۔ بس
ایک ہی بات ممکن ہے کہ بدلے ہوئے سماجی ماحول
میں اس کے مزاج کے مطابق ترمیم و تبدیلی کر دی
جائے۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ مذاہب عالم نے انسانوں
کو ان کی اولین زندگی میں نہیں لوٹایا بلکہ بگڑی
ہوئی صورتوں میں ترمیم و اصلاح کر دی، ضابطے قانون
بنائے، پابندیاں عائد کیں، یہ سب اس وجہ سے ہوا
کہ آبادی کے بڑے بڑے ہجوموں کو یکسر بدلنا ناممکن
تھا۔ ان کا تعلق ایک دوسرے سے رکھنے کے لئے
ضروری تھا کہ تبدیلیاں ایسی کی جائیں جو ایک گروہ
کو دوسرے گروہ سے بالکل علیحدہ نہ کر دیں۔ تبدیلیاں
رفتہ رفتہ ہوتی ہیں یا کی جاتی ہیں، صدیوں کے بنے
ہوئے سماج کو یکسر نہیں بدلا جا سکتا۔ جو باتیں فطری
اعتبار سے غلط ہیں۔ ان کی غلطی یا خامی کا احساس
ان لوگوں کو عموماً نہیں ہوتا جو کسی سماج کی روایات
میں رچ بس گئے ہوں۔ ہم تنہا کچھ بھی نہیں، قدرت
جنگل اگاتی ہے ہم کانٹ چھانٹ کر اسے گلستان

میں تبدیل کر دیتے ہیں، قدرت ہمیں لوہا، چونا، پتھر وغیرہ دیتی ہے۔ ہم اس سے ہزاروں قسم کی چیزیں پیدا کر دیتے ہیں، انسان کی زندگی کو قرار نہیں یکسانی اس کی طبع کے خلاف ہے۔ سماج اس کی ضرورت ہے۔ تہذیبیں اس کی عادت بن گئی ہیں، جھوٹ اور سچ کے نت نئے معیار مختلف تہذیبوں اور زمانوں کے ساتھ پیدا ہوتے رہے ہیں جو بات کسی سماج میں مقبول ہے وہ جائز ہے جو نامقبول وہ ناجائز۔ اس کی منطقی توجیہہ بس یہی ہے کہ اسے رائج الوقت تہذیب اور سماج کی قبولیت کی سند حاصل ہے۔ سماج جو انسانوں کا حاکم ہے ہمیں زندہ رہنا عزت اور آسودگی سے رہنا ہے تو سماج کے فیصلے اور ضابطے ماننے ہوں گے، اسے سماجی جبر کہتے ہیں جس سے مفر ممکن نہیں اور اس جبر کے ہم عادی بن جاتے ہیں۔

سوسائٹی نے عزت، غیرت، رشتے اور جذبوں کے جو بت بنائے تھے، میں نے انہیں توڑنا چاہا لیکن میں ناکام رہا، آخر کار ان بتوں نے مجھے توڑ دیا۔ میں نے اختر کو اس سماج سے علیحدہ ایک شخص بنا دیا مگر میں نے اس کے ساتھ بڑا ظلم کیا۔ اس طرح وہ تنہا رہ گیا۔ انوری نے خود کو اس پر قربان کر دیا۔ مگر میں خود کو اس سماج سے علیحدہ نہ کر سکا۔ مجھ سے یہ سب برداشت نہ ہو سکا۔ میرا نوجوان لڑکا اپنے باپ کے سامنے حیا سوز مظاہرے کر رہا تھا۔ ساری دنیا مجھے اپنے لئے تنگ معلوم ہونے لگی تھی۔ ہر چند کہ اختر اور انوری نے اس ویرانے میں پناہ ڈھونڈلی تھی مگر یہ سلسلہ کب تک چلتا۔ کب تک گستاخ نظریں برداشت کی جائیں، کب تک رسوائیوں کا سودا کیا جاتا۔ سو میں نے انہیں قتل کر دیا۔ یوں بھی ان کا اس دنیا سے کوئی تعلق نہ تھا۔

مجھے اپنی ناکامی کا اعتراف ہے۔ پر اس واقعے میں بہت سے لوگوں کے لیے عبرت کا سامان موجود ہے۔

